علم و عمل

[وقائع عبد القادر خانی]

حصہ اول

ترجمہ ★ مولوی معین الدین افضل گڑھی

ترتیب و حواشی ★ محمد ایوب قادری بی۔ اے

تعارف ★ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی

★ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ★ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ★

علم و عمل

(جلد اوّل

وقائع عبدالقادر خانی

مترجمہ

مولوی معین الدین افضل گڑھی

مُرتبہ

پروفیسر محمد ایوب قادری ایم، اے

تعارف

از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
(طبع دوم)

فہرست مضامین

باب اول

فہرست ان اشخاص کی جن کا حال حواشی میں مرتب نے لکھا ہے

تقریب (طبع دوم)

وقائع عبدالقادر خانی "علم و عمل" کے نام سے دو جلدوں میں اشاعت پذیر ہوئی جلد اول ۱۹۶۰ء میں اور جلد دوم ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ جلد اول کا اب دوسرا ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔

کتاب علمی و ادبی حلقوں میں قدر و مقبولیت کی نگاہ سے دیکھی گئی رسائل و جرائد میں اُمید افزا تبصرے ہوئے اور اس کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس) کا اس کتاب کو طبع و شائع کرنا ایک نہایت کامیاب علمی و ادبی کوشش تھی۔

وقائع عبدالقادر خانی (علم و عمل) کی جلد دوم کی اشاعت کے موقعے پر مولوی عبدالقادر کے پوتے مرزا نصیرالدین مراد آبادی (ف ۱۹۰۹ء) کے خود نوشت سوانح مل گئے تھے، جن کا اُردو ترجمہ "وقائع" کی دوسری جلد میں "وقائع نصیر خانی" کے نام سے شامل کردیا گیا ہے، اس کتاب سے مولوی عبدالقادر کے بعض حالات پر مزید روشنی پڑتی ہے، "وقائع نصیر خانی" کی روشنی میں فاضل مرتب پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے نے مولوی عبدالقادر کے حالات پر نظر ثانی کرکے انکو مقدمہ میں شامل کردیا ہے، کتاب پر مجموعی طور سے بھی ایوب قادری صاحب نے نظر ثانی کی ہے جس سے اُس کی افادیت میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔

سید الطاف علی بریلوی

کراچی ۱۱ فروری ۱۹۶۹ء

تقریب (طبع اوّل)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی جانب سے "علم و عمل" "وقائع عبدالقادر خانی" جلد اوّل کو زیور طبع سے آراستہ کرا کر علمی دُنیا کے سامنے پیش کرنے میں ہمیں غیر معمولی مسرت ہے۔ غیر معمولی مسرت کی وجہ یہ ہے کہ کتاب کی اہمیت و افادیت کے ماسوا اس کے ساتھ چند در چند عزیز یادیں بھی وابستہ ہیں۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر کے سایۂ عاطفت میں ۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۰ء حیاتِ مستعار کے جو سب سے زیادہ قیمتی پندرہ سال گزرے اُس کے لاتعداد اور گوناگوں فوائد میں سے ایک بہت بڑا فائدہ آں مرحوم و مغفور کے مشہورِ زمانہ کتب خانۂ حبیب گنج سے استفادہ تھا۔

علی گڑھ شہر سے ۱۲ میل دور ریاست حبیب گنج میں ایک وسیع و عریض گڑھی، کوٹھی، مجلس ائے اور پائین باغ نواب صاحب کی شانِ امارت کے مظہر تھے تو اُن کے جذبۂ دینی کی یادگار ایک حسین و جمیل مسجد تھی، ساتھ ہی نواب صاحب نے اپنے ذوقِ علمی کی تسکین کے لئے گڑھی میں ایک بلند و بالا عمارت کتب خانہ کے لئے تعمیر کرائی تھی جس میں سات ہزار نادر و منتخب کتابیں جن میں سے اکثر قلمی تھیں بکمال حُسنِ ترتیب سے محفوظ کی گئی تھیں۔ کتب خانہ میں اہل علم و تحقیق کے قیام کے لئے متعدد آرام دہ کمرے تھے۔ صبح سے دوپہر تک کے اوقات نواب صاحب بنفسِ نفیس کتب خانہ میں صرف فرماتے کتب خانہ کے مُہتمم مولوی معین الدین صاحب افضل گڑھی مع اپنے ماتحت عملہ کے دن رات مصروفِ کار رہتے اور تشنگانِ علم کو اُن کی ضرورت کی کتابوں کی نشاندہی اور اُن سے استفادہ کرنے میں مدد دیتے۔ حضرت نواب صاحب کی اجازتِ خاص سے کتابوں کی نقل اور اُن کے ترجمہ کا انتظام بھی ممکن ہو جاتا تھا۔

راقم نے متذکرہ سہولتوں سے بساط بھر فائدہ اُٹھایا اور اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ اور علمی و تعلیمی تحریکات سے متعلق بکثرت کتابوں کے مطالعہ کے ماسوا چند

اہم کتابوں کو نقل و ترجمہ بھی کرالیا۔ انھیں آخر الذکر کتابوں میں " وقائع عبدالقادر خانی " ہے جس کو باضافۂ نام "علم وعمل" جناب مولوی معین الدین صاحب افضل گڑھی نے میرے لئے فارسی سے اردو میں ترجمہ فرمادیا $\frac{20 \times 30}{4}$ کے بڑے سائز پر یہ کتاب چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

عزیزی و محبّی محمد ایوب قادری ایم' اے کے تشریحی و وضاحتی نوٹس نے مسودہ کو قریب قریب دوگنا کردیا۔ لہٰذا کتاب کو دو حصّوں میں تقسیم کرکے شائع کیا جارہا ہے۔ پہلا حصّہ نذرِ ناظرین ہے۔ دوسرا حصّہ اگلے سال پیش کیا جائے گا انشاء اللہ۔ کتاب کس پایہ کی ہے؟ اور اس پر کس درجہ محنت صرف کی گئی ہے؟ اس سے معلومات میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے؟ اس کا اندازہ مطالعہ کرنے والے حضرات کو خود بخود ہو جائے گا۔ مگر پھر بھی اس کتاب کے ایک خاص علمی پہلو کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ مؤلف وقائع کو علم ہیئت و فلکیات پر بڑا تجربہ حاصل ہے جس کی مثالیں کتاب میں جابجا ملتی ہیں۔ باقی۔ ؎

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

سیّد الطاف علی بریلوی

کراچی ۲۱ر فروری ۱۹۶۰ء

تعارف

ایک نادر خود نوشتہ تذکرہ

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم

شاہان دہلی کے خراجِ مالی کا دائرہ تو حدودِ ہندوستان میں محدود تھا، لیکن خراجِ کمال کے دائرے میں ایران و توران اور عرب و روم، سب ہی شامل تھے، ان دور دراز ممالک سے شرفاء جوق جوق ہندوستان آتے، یہاں ان کے جوہر پرکھے جاتے، اپنی اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق کامیاب ہوتے، اس طرح ہزاروں گمنام آتے، نامور ہو کر دنیا سے گئے یہ نشانِ امتیاز اس وقت تک قائم رہا جب کہ سلطنت کا صرف نام باقی رہ گیا تھا۔

مرزا غالبؔ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں، ان قافلوں کی یادگار تھے، جو دورِ آخر میں شاہجہاں آباد پہنچے۔ اسی دور سے اُس وقائع نگار کا تعلق ہے جس کے تذکرہ پر یہ تبصرہ ہے۔

محمد شاہ کے زمانے میں ایک بست سالہ نوجوان عالم، احمد نامی ہرات سے ہندوستان آئے، یہ وہ زمانہ ہے کہ محمود خاں اور اشرف خاں افغان، ایران کو تہ و بالا کر رہے تھے، یہ نوجوان فنِ حدیث میں ماہر تھے، دلّی پہنچکر چندے بیکار رہے، بالآخر غازی الدّین خاں کے مدرسہ میں پیش نماز مقرر ہوئے، مولوی نذر محمد مدرسہ کے مدرس تھے اور میرزا جان متولی ان دونوں بزرگوں نے نووارد عالم، احمد کے ساتھ برادرانہ سلوک کیا۔ بر لاس خاندان میں شادی کرادی۔ تین لڑکے ہوئے، تینوں سپاہی، دو گمنام رہے، ایک نے نام پایا۔ ان کا نام محمد اسلم تھا۔ والدہ کی رحلت کے بعد بنگال گئے۔ اور عالی جاہ قاسم علی خان کے لشکر میں ملازمت پائی، سازو سامان درست کر کے اہل و عیال کو طلب کیا۔

یہ دلّی سے چل کر مراد آباد پہنچے۔ اسی عرصہ میں بنگال کا رنگ بدل گیا۔ دوسرا خط پہنچا کہ جہاں ہو وہیں رہو، میں خود آتا ہوں۔ محمد اسلم بصد دشواری بریلی پہنچے، سواری کا گھوڑا مرگیا، خود بیمار ہو گئے بے یارومددگار سرائے میں پڑے تھے، ایک دوکاندار نے دیکھا جو کبھی غازی الدین خاں کے مدرسہ کے سامنے بیٹھتا تھا، پہچانا، آشنا پرستی دیکھو، پوچھا یہاں کیا کرتے ہو، جواب دیا کہ کرتا تو کچھ نہیں۔ مجبور ہوں، نہ روئے ماندن نہ پائے رفتن۔ کہا کچھ فکر مت کرو، میں بیل گاڑی اپنے اہل و عیال کے لئے مراد آباد بھیجتا ہوں، اس میں مرادآباد چلے جاؤ۔ آرام سے پہنچ جاؤ گے، جو کچھ میرے پاس ہے آپ کا ہے۔ آغا مراد آباد پہنچے ناتوانی کا یہ عالم کہ مشت استخوان کے سوا کچھ باقی نہ تھا، چند ماہ زندہ رہے۔ مرض کا غلبہ ہاتھ خالی۔ آخر رحلت کی۔ ایک بیوہ ایک ہشت سالہ بچہ چھوڑا۔ اس بچے کو قرآن ماں نے پڑھایا۔ مولوی شرف الدین صاحب کی خدمت میں علوم دینیہ و ادبیہ حاصل کئے، جوان ہو کر دسالئے رام پور میں سے ایک رئیس کے مصاحب ہو گئے تھے، محمد اکرم نام تھا۔ آشنا تخلّص۔ شادی مراد آباد میں ہوئی۔ بہت با اخلاق جوانِ صالح تھے، ان ہی کے فرزند مولوی عبد القادر صدر الصدور تھے۔ جن کے نوشتہ تذکرہ کو اہل نظر کے سامنے لانا

مقصود ہے۔

یہ تذکرہ اس زمانہ کا وقائع نامہ ہے، جب کہ انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر ہو رہا تھا زمانہ بدل رہا تھا پرانے آئین اور رسوم مٹ رہی تھیں، جدید قائم ہو رہی تھیں، زبان بہت صاف اور چست فارسی ہے۔ طرز تحریر سادہ، محققانہ اور آزادانہ، بہت سے چشم دید واقعات و معاملات ایسے ہیں جو ہر چند اب خواب و خیال ہو چکے تاہم سننے اور سمجھنے کے قابل ہیں ان کے پڑھنے سے بہت سے خیال درست ہو سکتے ہیں۔ بیان اتنا دلچسپ ہے کہ میں نے تین بار پڑھا ہے، تاہم چوتھی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس تبصرے کے ذریعہ سے بعض خاص خاص حصّے اُس تذکرہ کے عام نگاہوں کے سامنے لاؤں، بڑی خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ اس وقت کی سوسائٹی کے حالات ہو بہو بیان کئے ہیں، خصوصًا علمی و اخلاقی پہلو سے ترقی کر رہے ہیں، یا تنزّل۔ یہ نہ ہو کہ اس خیال باطل میں کہ گزشتہ زمانہ جہالت و تاریکی کا تھا۔ اب علم و روشنی کا ہے، ہم کسی تباہی کے غار میں جا پڑیں ہم کو کشادہ دلی سے واقعات پر نظر کر کے یہ فیصلہ کرنا چاہتے کہ اسلاف میں کیا خوبیاں تھیں ہم میں کیا ہیں، ان میں جو خوبیاں ہوں لے لیں، ہم میں جو خامیاں ہوں ان کی اصلاح کریں عمومًا یہ خیال ہے کہ یہ زمانہ علم کا ہے، گزشتہ جہل کا تھا، مگر میرا خیال ہے کہ صورت حال برعکس ہے۔ وہ علم کے حقیقی شیفتہ تھے۔ ہم نام کے۔ جملۂ بالا میں "یہ زمانہ" آپ کو لندن اور پیرس نہ لے جائے، میرا مدعا یہ ہے کہ ہم اپنے گھر کا جائزہ لیں۔ لندن اور پیرس کی شاہراہیں جگ مگا رہی ہوں اور ہم اپنی تنگ گلیوں میں ٹھوکریں کھا رہے ہوں تو یہی کہیں گے بڑا اندھیرا ہے۔ کجا بود اشہب کجا تاختم۔

اچھا اب ذرا اصلی داستان سنئے۔ محمد اکرم آشنا تخلص سے تنا سا ہو چکے، مولوی عبد القادر صدالصدور مؤلف تذکرہ ان ہی کے لڑکے تھے، رام پور میں پیدا ہوئے، دادی پہلے سے رام پور میں تھیں۔ اکلوتی بیٹی کی محبت نانی کو بھی مراد آباد سے رام پور لے آئی، ان ہی دونوں بڑی بوڑھیوں کی نگرانی میں عبد القادر کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ سب سے اول صحت زبان کا مرحلہ تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس بچے کی دادی شاہجہاں آباد کی تھیں،

تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

"زبان کھلنے پر میں نے دادی کی زبان سیکھی جو شاہجہاں آباد کی اردو تھی، میری دادی نے میری ماں کو بھی شاہجہاں آباد کی اردو سکھائی تھی، اگر کوئی محاورہ مراد آباد کا میری ماں کی زبان سے نکلتا جو شاہجہاں آباد کے محاورے کے خلاف ہوتا تو میری دادی فوراً ٹوک دیتیں"۔

جب زبان سے الفاظ نکلنے لگے تو مفتی شرف الدین صاحب نے (جو رام پور کے مشہور با فیض عالم تھے) یہ آیہ کریمہ پڑھائی:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا	سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو اولاد نہیں رکھتا اور نہ کوئی اس کے ملک میں شریک ہوا اور نہ کوئی کمزوری کا سہارا ہے اُس کی بڑائی کر بڑا جان کر

اس کے بعد دادی اور نانی نے کھانے وغیرہ کے آداب سکھائے، اس طرح کھاؤ کہ دیکھنے والے کو گھن نہ آئے، منہ سے چبانے کی آواز نہ نکلے۔ پانی ایک ساتھ اتنا نہ پی جاؤ کہ اچھو ہو جائے دوسرا کھاتا ہو تو اس کی طرف نظر نہ جماؤ، کسی محفل میں جاؤ تو بلا اجازت آگے بڑھ کر برابر نہ جا بیٹھو بلکہ اجازت پانے پر سامنے کسی قدر فاصلہ سے بیٹھو۔ جب والد ان کو مفتی صاحب کی خدمت میں لے جاتے تو جناب ممدوح ہر وقت اور ہر کام کے لئے جو دعائیں ہیں تعلیم فرماتے۔ یہ چار سال کی عمر سے پہلے کی تعلیم تھی۔ جب چار سال چند ماہ کے ہوتے تو یہ رسم اسلام احباب کے جلسے میں مولانا نے قرآن شریف شروع کرایا، انہوں نے اسی جلسے میں سورۃ اقراء حفظ پڑھ دی۔ یہ سورہ اپنی والدہ سے زبانی یاد کر چکے تھے۔ رسم بسم اللہ کے بعد قرآن شریف دادی نے پڑھایا جب تک سبق یاد کر کے نہ سناتے چھٹی نہ ملتی، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کھانا بھی نہ ملتا۔ سات برس کی عمر میں کلام مجید ختم کر لیا۔ مولانا نے نماز یاد کرا دی تھی۔ سات برس کی عمر کے بعد نماز کی تاکید ہونے لگی" دروازے پر مکتب بٹھانے کی مقدرت نہ تھی، محلہ کے مکتب میں عام بچے بھی پڑھتے تھے، اس لئے باپ اور دادی نے ان کو وہاں نہ بھیجا اور چودہ برس کی عمر تک گھر میں تعلیم پاتے رہے۔ "تا چاردہ سالگی خانہ آموز بودم"۔ دادی نے پند نامہ

سعدی اور منطق الطیر فرید الدین عطار پڑھائی۔ باپ کو جب مصاحبت سے فرصت ملتی تو چند سطریں گلستان، بوستان کی پڑھا دیتے۔ خط پڑھنے کو دیتے۔ یہ کوشش رہتی کہ ایک بار پڑھا کر دوبارہ نہ بتائیں بلکہ یہ خود ایک بار سن کر اپنی زبان سے ادا کریں۔ اگر کبھی کہتے بھول گیا تو پہلے ملامت ہوتی پھر بتاتے۔

۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں پندرہ برس کی عمر میں مولانا شرف الدین سے علوم عربیہ کی تحصیل شروع کی۔ نحو، منطق، طبیعات، الٰہیات و فلسفہ، معانی و بیان اور اصول و فقہ یہ علوم مولانا کی خدمت میں حاصل کئے۔

راقم مضمون شروانی کو بھی نسبت تلمذ مولانا سے ہے دیکھو اور میرے فخر پر رشک کرو۔

مفتی شرف الدین صاحب
↓
مفتی عنایت احمد صاحب
↓
مفتی محمد لطف اللہ صاحب
↓
مولانا عبد الغنی خان صاحب
↓
شروانی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ

حاصل کلام کہ ابھی یہ علوم حاصل کر رہے تھے، فقہ، حدیث، تفسیر، ہئیت و ہندسہ حساب، فرائض۔ اسی عرصہ میں کابل سے زمان شاہ لاہور آپہنچے، انگریزی فوج نواب رام پور کے تمام خاندان کو نواب سعادت علی خاں کے فرزند کے ساتھ رام پور سے لکھنؤ لے گئی مولوی عبدالقادر کا سلسلۂ تعلیم درہم برہم ہو گیا۔ جو تحصیل علوم کی تھی وہ چار سال کی تعلیم کا نتیجہ تھی انیس برس کی عمر تھی کہ ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء میں ان کا چہرہ مولوی ضیاء النبی نے اپنے رسالہ میں لکھ دیا (یعنی فوج کے رسالہ میں ملازم ہو گئے) (اب وہ صورت ہی بگڑ گئی "چہرہ" کیسا اور رسالہ کہاں) مولوی صاحب ان کے حال پر بہت شفقت فرماتے تھے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ میرے تمام ولی نعمتوں نے مجھ پر ہمیشہ استحقاق سے زیادہ شفقت فرمائی ہے مگر بموجب مقولہ اشرف للمتقدم (پہلا رتبے میں زیادہ ہے) ان کا زیادہ ممنون ہوں۔"

ملازم تو فوج میں تھے، مگر مولوی صاحب کی صحبت میں علم حدیث، تفسیر اور فقہ کی تصحیح اور مقابلہ کا اکثر چرچا رہتا تھا، کبھی علم مناظر، اصطرلاب، ہندسہ کا شغل رہتا، کبھی فن ہئیت پر بحث ہوتی، اس طرح ان علوم سے واقف ہونے کا موقع مولوی عبدالقادر کو بھی ملا، اور جو کمی تحصیل میں رہ گئی تھی وہ بہت کچھ پوری ہو گئی۔

تذکرہ میں ہندسہ اور اصطرلاب کے متعلق مولوی ضیاء النبی کے بعض سوال اور اپنے جواب نقل کئے ہیں (ذرا ٹھہر کر یہ غور فرمایئے کہ یہ صورتِ تعلیم بالغان تو نہیں ہے، یقینی نہیں ہے اس لئے کہ یہ تعلیم زمانۂ حال کی ایجاد ہے)

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی عرصہ میں مؤلف تذکرہ کی شادی بھی ہو گئی تھی، چنانچہ وہ چند تغیرات کے بعد والد سے اجازت لے کر مرادآباد اپنی سسرال کو گئے، یہ سفر مؤلف کی زندگی میں اہم ہے اس سے ان کی زندگی کا عملی دور شروع ہوتا ہے اور جو تعلیم پائی تھی، عمل اس کے حسن و قبح کو عیاں کرے گا۔

مرادآباد میں مختلف لوگوں سے ملے۔ شدہ شدہ ڈاکٹر کرٹے سے ملے، ان کے ذریعہ سے حکام سے اسی عرصہ میں سررشتہ کے کام سے واقفیت حاصل کی، اس زمانہ کے واقعات چند

صفحوں میں لکھے ہیں، ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اجنبیت کے ہر موقعہ پر احتیاط سے کام کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ اب ذرا ایک لطیفہ ملاحظہ ہو، ایک روز ڈائرکٹر سے ملنے گئے۔ صاحب کے کہار نے اطلاع کی: "ایک مولوی سلام کو آئے ہیں۔" بلالیا اس روز سے ڈائرکٹر نے مولوی کہنا شروع کیا، مولوی مشہور ہو گئے، ایک موقع پر لکھتے ہیں:۔
"مولوی کا خطاب مجھ کو کہار نے دیا۔ شہرت ڈائرکٹر صاحب نے بخشی، اب میں اس خطاب سے تنگ آگیا ہوں۔"

——— مے باقی و ماہتاب باقی ———

شروانی

مقدمہ

از محمد ایوب قادری ایم اے (مرتب)

خود نوشت سوانح حیات اور یادداشتیں (MEMOIRS) تاریخ کے ماخذوں میں خاص اہمیت رکھتی ہیں، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان میں مولف کی ذات اور شخصیت بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہے اور واقعات کا توازن و تناسب قائم نہیں رہتا، کسی حد تک یہ صحیح ہے لیکن تاریخ کا تجربہ کار طالب علم اس سقم کا بآسانی پتہ لگا لیتا ہے اور واقعات کا مطالعہ ان کے صحیح پس منظر کے ساتھ کرنے میں اس کو کوئی خاص دقت نہیں ہوتی، خود نوشت سوانح اور یادداشتوں کے مطالعہ کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ بعض وقت مولف ایسے واقعات کا ذکر کرتا ہے جن کو دوسرے سوانح نگار اور مورخ غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور کبھی کبھی یہی "غیر اہم" واقعات بعض مسائل کی صحیح تصویر تیار کرنے کے لئے نہایت اہم اور ضروری ثابت ہوتے ہیں، اگر سوانح حیات اور یادداشتیں کسی تاریخی شخصیت کی مرتب کی ہوئی ہوتی ہیں، تو ان کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ زمان و مکان کا بھی اس کی افادیت پر بہت اثر ہوتا ہے، زیر نظر مجموعہ مولوی عبدالقادر رام پوری کے خود نوشت حالات اور یادداشتوں پر مشتمل ہے، مولوی صاحب عالم و فاضل شخص تھے، یہ "وقائع" اوائل انیسویں صدی کے متحدہ ہند کے سیاسی، معاشرتی اور علمی حالات کا ایک نادر مرقع ہے۔ اس میں اس دور کے بکثرت ایسے تاریخی واقعات ملتے ہیں جو اب تک ہمارے مورخین کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔

اس کتاب میں انیسویں صدی کے ابتدائی دور کی داستان ہے، اس وقت غیر ملکی اقتدار کے ساتھ ساتھ بر صغیر پاک و ہند میں مغربی تہذیب و تمدن کا دائرہ اثر بھی بڑھ رہا تھا ۱۸۰۱ء

میں نواب سعادت علی خاں، نواب وزیر اودھ نے روہیل کھنڈ اور دوآبہ انگریزوں کو دیدیا، ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا دہلی پر قبضہ ہو گیا۔ انہوں نے مغل حکمراں شاہ عالم ثانی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آہستہ آہستہ اپنے سیاسی اقتدار اور غلبہ کو وسیع سے وسیع تر کیا، اسی زمانہ میں مؤلف "وقائع" مولوی عبد القادر نے السیٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی، بعض انگریز حکام کی مہربانی اور تعلق سے بنگال کا سفر کیا، مراد آباد، دہلی، مضافات دہلی، راجپوتانہ اور اجمیر میں داروغہ پولیس، سرشتہ دار عدالت دورہ، صدر امین اور مفتی وغیرہ رہے، وہ جہاں جہاں پہنچے وہاں کے مفصل حالات لکھے ہیں، علماء و عمائد کا ذکر کیا ہے، معاشی اور سماجی حالات خاص طور سے بیان کئے ہیں، ظاہر ہے کہ مولوی عبد القادر کا یہ بیان کس قدر تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

مؤلف نے وقائع کو ۱۸۳۱ء میں مرتب کیا، اگرچہ مواد پہلے سے قلم بند کر لیا تھا، حبیب گنج کے نسخے میں آخری دو اوراق موجود نہیں ہیں، کتاب کو دو حصوں میں شائع کرنا تجویز ہوا ہے، پہلی جلد روہیل کھنڈ، بنگال اور دہلی کے حالات پر مشتمل ہے جس میں زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۶ء تک کے حالات آ گئے ہیں،

دوسری جلد راجپوتانہ کی ریاستوں اور اجمیر کے بیان میں ہے، پہلی جلد کو ہم نے چھ ابواب پر تقسیم کیا ہے، پہلا باب مؤلف کے خاندان، تعلیم ابتدائی ملازمت اور رامپور کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے، دوسرے باب میں سفر بنگال کا بیان ہے اور بقیہ چار ابواب میں دہلی اور مضافات دہلی کے مفصل حالات بیان کئے گئے ہیں۔

مؤلف "وقائع" مولوی عبد القادر کے پردادا، احمد[1] ابن مرزا محمد اسحاق متبحر عالم اور فاضل تھے علوم متداولہ میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ اپنے زمانہ کے محدث

---

[1] مرزا نصیر الدین (ابن مرزا عبد الہادی بن مولوی عبد القادر) نے نواب نجیب الدولہ کے حالات میں ایک کتاب "نجیب التواریخ" لکھی ہے، اس میں اپنے خاندان کا مختصر سا سلسلہ نسب بھی تحریر کیا ہے اور خود کو امیر تیمور کی اولاد میں بتایا ہے (نجیب التواریخ ص ۱ قلمی مملوکہ سید الطاف علی بریلوی)

تھے، آبائی وطن ہرات کے سیاسی حالات کی خرابی کی وجہ سے ۱۱۴۰ھ ۱۷۲۷ء اور ۱۱۵۰ھ ۱۷۳۷ء کے درمیان وہ دہلی آئے اور اپنے علم و فضل کی وجہ سے نواب غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کے مدرسے میں مدرس مقرر ہو گئے دہلی ہی میں شادی کر لی، مرزا احمد محدث کا انتقال ۱۱۷۰ھ ۱۷۵۶ء میں ہوا، انہوں نے تین بیٹے مرزا معظم، مرزا عظیم اور مرزا اسلم یادگار چھوڑے، مرزا معظم عین عالم شباب میں گھوڑے سے گر کر انتقال کر گئے۔ مرزا عظیم اپنے والد کی زندگی میں دکن چلے گئے، پھر ان کا کچھ حال معلوم نہیں ہوا، مرزا اسلم دہلی میں رہے انہوں نے ۱۱۷۴ھ ۱۷۶۰ء میں نواب عالی جاہ قاسم علی خاں والی بنگالہ کے لشکر میں ملازمت کر لی، اہل و عیال بنگال جانے کے ارادہ سے مراد آباد آئے کہ اسی درمیان میں نواب قاسم علی خاں کی حکومت ختم ہو گئی، مرزا محمد اسلم بنگال سے بحالت علالت براہ بریلی، مراد آباد پہنچے جہاں ۱۱۷۷ھ ۱۷۶۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا، انہوں نے مرزا محمد اکرم نامی ایک بیٹا یادگار چھوڑا جس کی عمر اس وقت آٹھ سال کے قریب تھی، مرزا محمد اکرم اپنی والدہ کے ہمراہ مراد آباد سے اپنے خالو مولوی محمد مقیم کے یہاں رام پور آ گئے، رام پور ہی میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی جب ۱۹ سال کی عمر ہوئی تو مراد آباد میں محلہ مغل پورہ میں مرزا غلام مصطفیٰ بیگ کی دختر سے شادی ہو گئی، مرزا محمد اکرم کو علماء کی صحبت سے رغبت تھی، خاص طور سے مفتی شرف الدین رام پوری کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ فرماتے تھے، تمام عمر صاحبزادہ نظام علی خاں خلف نواب فیض اللہ خاں بہادر کی مصاحبت میں رہے، شعر و شاعری سے ذوق تھا، آشنا تخلص فرماتے تھے، ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۰ء میں رام پور میں انتقال ہوا، تین بیٹے یادگار چھوڑے، مولوی عبد القادر، مرزا محمد ناصر اور مرزا غلام باسط۔

مولوی عبد القادر ۱۱۹۵ھ ۱۷۸۰ء میں رام پور میں پیدا ہوئے، دادی اور نانی نے بڑی توجہ سے تعلیم و تربیت فرمائی، صحت زبان کا خاص طور سے خیال رکھا گیا کہ شاہجہاں آباد کے محاورے کے خلاف نہ ہو نشست و برخاست اور خورد و نوش کے آداب سکھائے گئے اور ان کی مشق کرائی گئی، جب عمر چار سال چار ماہ کی ہوئی تو حسب رواج رسم تسمیہ خوانی ادا کی گئی اور باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، مفتی شرف الدین رام پوری نے بسم اللہ پڑھائی

دادی نے قرآن شریف کی تعلیم دی، اور سات سال کی عمر میں قرآن کی تعلیم سے فارغ ہو گئے، فارسی کی ابتدائی تعلیم بھی دادی نے شروع کرائی ان ہی بزرگ خاتون سے پندنامہ سعدی اور منطق الطیر وغیرہ کتابیں پڑھیں، اگر والد کو فرصت ملتی تو وہ گلستان اور بوستان کی چند سطریں پڑھا دیتے، اسی طرح چودہ سال کی عمر تک مولوی عبدالقادر گھر ہی پر تعلیم پاتے رہے۔

مولوی عبدالقادر نے ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں پندرہ سال کی عمر میں مولانا شرف الدین رام پوری سے علوم متداولہ کی تحصیل شروع کی مولانا شرف الدین اپنے عہد کے ممتاز اور نامور عالم تھے، نحو، منطق، طبعیات، الہیات، فلسفہ، معانی و بیان اور اصول فقہ وغیرہ مولانا شرف الدین کی خدمت میں حاصل کئے، مولوی نور عالم رام پوری سے میبذی کے کچھ اسباق پڑھے، مفتی شرف الدین صاحب کی خدمت میں چار سال تک تحصیل علم کا سلسلہ جاری رہا، تحصیل علم سے ابھی فراغ حاصل نہ ہوا تھا کہ رام پور میں بعض سیاسی حالات کی نا استواری کی وجہ سے مولوی عبدالقادر کا سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا اور تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں مولوی عبدالقادر مولوی ضیاء النبی رام پوری کے فوج کے رسالے میں ملازم ہو گئے، مولوی ضیاء النبی صاحب کی صحبت بابرکت میں علم تفسیر، حدیث، فقہ کی تصحیح اور مقابلہ کا اکثر چرچا رہتا، کبھی مناظرہ، اصطرلاب اور ہندسہ کا شغل رہتا، کبھی فن ہئیت پر بحث ہوتی، اس طرح مولوی عبدالقادر کو ان علوم سے واقف ہونے کا خوب موقع ملا اور تحصیل علم میں جو کمی رہ گئی تھی وہ بہت کچھ پوری ہو گئی۔

اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں مولوی عبدالقادر کی شادی ہو چکی تھی سسرال مراد آباد میں تھی، جب وہ اپنی سسرال مراد آباد آ گئے تو وہاں سرکاری عملے کے دو ایک انگریز افسروں سے تعارف ہو گیا، ان افسروں نے مولوی عبدالقادر کو جوہر قابل پایا، مراد آباد کے رجسٹرار مسٹر کارٹن نے مولوی عبدالقادر کو ٹھاکر دوارہ کا تھانیدار مقرر کر دیا، جہاں انہوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے علم، تجربہ، دیانت اور محنت سے اس شورہ پشت علاقے میں نظم و نسق قائم کر دیا، چوری، ڈکیتی اور لوٹ مار کے واقعات ختم ہو گئے اور جلد ہی

اعلیٰ حکام کی نظروں میں ایک مقام حاصل ہو گیا انکا اعتماد بڑھ گیا، ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء میں مولوی عبدالقادر کی دادی کا انتقال ہوا، اسی دوران میں ان کو امروہہ کا تھانیدار مقرر کیا گیا، کیونکہ اس طرف بھی نظم و نسق چنداں قابل اعتبار نہ تھا، چوری اور غارت گری کے ہنگامے برپا تھے، مولوی عبدالقادر نے مقامی حالات کے پیش نظر اپنی صوابدید سے انتظام کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے کا نظم و نسق بھی درست کر دیا۔ اس زمانہ میں سپرنٹنڈنٹ کا تبادلہ ہو گیا اور مولوی عبدالقادر مستعفی ہو گئے ویلڈر صاحب اسسٹنٹ کلکٹر مراد آباد مولوی عبدالقادر سے متعارف تھا، اس نے اردو زبان سیکھنے کی غرض سے ان کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا، مولوی عبدالقادر نے اپنے علم و فضل، قابلیت و اہلیت اور موقعہ شناسی و وفاداری کی بنا پر ویلڈر صاحب کی نظروں میں ایک خاص اعتماد حاصل کر لیا، یہانتک کہ اسکو ان کی مفارقت کسی وقت گوارا نہ تھی، بعض لوگوں کو یہ تعلق و ارتباط ناگوار ہوا اور انہوں نے کلکٹر مراد آباد کو سمجھایا کہ اسسٹنٹ کلکٹر مقامی حضرات سے بہت ربط و ضبط رکھتا ہے، جو نامناسب ہے، کلکٹر نے ویلڈر کو متنبہ کیا کہ مقامی لوگوں سے زیادہ رسم و راہ نہ رکھی جائے، مولوی عبدالقادر کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً اس ملازمت سے بھی قطع تعلق کر لیا۔

مولوی عبدالقادر کے سابق محسن کارٹن صاحب بنگال جا چکے تھے انہوں نے بنگال سے ان کی طلبی کا پروانہ مع سفر خرچ بھیجا کہ وہ جلد دیناج پور پہنچیں، چنانچہ فوراً سفر کی تیاری کر دی اور بنگال پہنچ گئے، وہاں وہ سرکاری ملازم نہ ہوئے، مگر کارٹن صاحب کے مشورے سے مختلف اوقات میں دو زمینداروں کی جاگیر کے انتظام میں منسلک رہے اس کے بعد ڈھاکہ کلکتہ اور مرشد آباد کی سیر کی اور وہاں کے علماء، فضلاء، اور امراء سے ملے غرض قریب تین سال بنگال میں گزارے، اس کے بعد اپنے والد کی طلبی پر واپس ہوئے اور ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۳ء میں اپنے وطن رام پور پہنچ گئے۔

اس وقت ویلڈر صاحب دہلی میں عدالت دورہ سے منسلک تھے، جب ان کو مولوی عبدالقادر کی بنگال سے واپسی کا علم ہوا تو انہوں نے لکھا کہ "تم دہلی چلے آؤ یہاں ملازمت کا موقع ہے" مولوی عبدالقادر ویلڈر صاحب کی اس طلبی پر رمضان ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۴ء میں دہلی

روانہ ہو گئے، وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ویلڈر صاحب نے جس جگہ کے لئے مولوی عبدالقادر کو بلایا تھا، وہ صیغہ ہی ایک دوسرے انگریز گارنر صاحب سے متعلق ہو گیا، لہٰذا اب اس تقرر کا تو کوئی سوال نہ رہا، البتہ ویلڈر صاحب نے دوسری یہ تجویز پیش کی کہ مولوی عبدالقادر کے بھائی غلام باسط کو تھانہ باڈلی (دہلی) میں تھانیدار مقرر کر دیا جائے اور وہ نگرانی کریں اور خود مولوی عبدالقادر سے شاہنامہ پڑھنا تجویز کیا، جب گارنر صاحب کو معلوم ہوا کہ ویلڈر صاحب نے مولوی عبدالقادر رام پوری کو عدالت دورہ کی سررشتہ داری کی امید میں بلایا تھا تو اس نے ان ہی کو سررشتہ دار مقرر کر دیا، اور ویلڈر صاحب کو شرمندگی کا موقعہ نہ دیا، گارنر صاحب خود بھی مولوی عبدالقادر کے حالات سے غائبانہ واقف تھا۔

مولوی عبدالقادر عدالت دورہ میں سررشتہ دار مقرر ہو گئے تو گارنر صاحب ان کی قابلیت و اہلیت سے اس قدر متاثر ہوا۔ ان پر اس قدر اعتماد کیا کہ جب اس کا تبادلہ کوہستان کو ہوا تو تمام عملے کا انتظام اس وقت تک کے لئے مولوی عبدالقادر کے سپرد کیا گیا جب تک کہ کوئی دوسرا افسر نہ پہنچے، گارنر صاحب کے تبادلے کے بعد عدالتِ دورہ کا کام ویلڈر صاحب سے متعلق ہوا، اسی زمانہ میں گورنر جنرل لارڈ مائرلنے شمالی ہند کا دورہ کیا، جب گورنر جنرل کا لشکر نواح دہلی (ہانسی وغیرہ) میں پہنچا تو لشکر کا حفاظتی انتظام مولوی عبدالقادر کے سپرد ہوا، لشکر میں چوری وغیرہ کا کوئی واقعہ نہ ہوا، گورنر جنرل کے دورے کے بعد مولوی عبدالقادر دہلی پہنچے، دہلی کے آثار و عمارات کو دیکھا، وہاں کے علماء و صلحا سے ملے، مولانا شاہ عبدالعزیزؒ زندہ تھے، ان کی مجالس میں شرکت کی، پھر عدالت دورہ پر واپس آگئے، گوہانہ، احصار اور ہانسی کے متعلقات کو دیکھا، اسی درمیان میں ایک چپراسی غیر حاضر ہو گیا کسی نے کہہ دیا کہ ویلڈر صاحب کہتے تھے کہ یہ سررشتہ دار (مولوی عبدالقادر) کی بدانتظامی کی بات ہے، بھلا ان کو اتنی برداشت کہاں، فوراً ایک اطلاعی عرضی لکھی، ۲۷ جون ۱۲۳۱ھ / ۱۹۱۵ء کو وطن کی راہ لی اور تین روز میں رام پور پہنچ گئے

رام پور میں نواب عنایت اللہ خاں نے مولوی عبدالقادر خاں کو اپنی مصاحبت میں رکھا اور کتاب "شافیہ" بطور وقت گزاری کے پڑھنے لگے، ۲۰ رجب ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء کو مولوی عبدالقادر کے

والد ماجد مرزا محمد اکرم آشنا کا انتقال ہو گیا، اس جانکاہ حادثہ کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالقادر لکھتے ہیں :-

"اس زمانہ میں غلہ گراں اور قرضہ بہت، باپ نے از قسم زیور، باغ، زمین کچھ نہ چھوڑا اور سارے شہر سے جان پہچان، چندروز تک چھوٹے بڑوں کی تعزیت آمد ورفت سے زخم پر نمک پاشی رہی اور روز کے گزارے کی دلخراش فکر علحدہ بالآخر ولی نعمت (نواب عنایت اللہ خاں) کی امداد سے سبکدوشی ہوئی"[1]

نواب عنایت اللہ خاں کا تعلق علاقہ کوہستان، الموڑہ، وغیرہ سے ہاتھی اور کتھے کی تجارت کا تھا اس سلسلے میں محصول سے متعلق کچھ تصفیہ ہو گیا۔ اس کے تصفیئے کے لئے مولوی عبدالقادر کو الموڑہ کے حاکم کے پاس بھیجے گئے۔ جب سفر سے واپسی ہوئی تو دسمبر ۱۸۱۷ء ۱۲۳۲ھ میں پھر ویلدر صاحب نے اُن کو دہلی طلب کر لیا۔ اور وہ ان کے سررشتہ دار مقرر ہو گئے۔ ۱۸۱۸ء ۱۲۳۳ھ میں اجمیر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور ویلدر صاحب اجمیر کے بند وبست کے لئے روانہ ہوئے۔ مولوی عبدالقادر ساتھ گئے۔

اوائل رمضان ۱۲۳۳ھ مطابق جولائی ۱۸۱۸ء میں مولوی عبدالقادر اجمیر پہونچے اور سیسے کی کان اور اس کی آمدنی و مصارف کی تحقیقات کے لئے ان کا تقرر ہوا۔ اُنھوں نے بڑی خوبی اور قابلیت سے اس کام کو انجام دیا اس کے بعد وقتاً فوقتاً دوسرے کام مثلاً اجمیر کی تجارت کی آمدنی کے نقشے کی درستی وغیرہ کے فرائض انجام دئے۔ مارچ ۱۸۱۹ء ۱۲۳۵ھ میں فتویٰ نویسی کا کام اُن کے سپرد ہوا۔ اسی عہدے کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی درگاہ کی امینی بھی سپرد ہوئی اُنھوں نے درگاہ کے انتظام میں بعض اصلاحات کیں اتفاق سے درگاہ کے پرانے قبر پوش کو جس کی چاندی ضائع ہو رہی تھی جلوا دیا اور بڑے خیمے کی بجائے جس پر ہر پانچ چھ سال کے بعد چار پانچ ہزار روپیہ لگتا تھا۔ اس پر ایک عمارت سات ہزار روپئے کے تخمینے کی تعمیر کرانی شروع کی۔ یہ بات خوش عقیدہ خُدّام اور پیرزادگان کو سخت ناگوار ہوئی اور اُنھوں نے مولوی عبدالقادر

---

[1] علم و عمل ص ۳۲۹

کے خلاف درخواست دے دی۔ جس کے نتیجے میں وہ درگاہ کی امینی کے عہدے سے ہٹا دئے گئے اور بدستور مفتی اور صدر امین رہے۔ ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء میں رخصت پر وطن آئے۔

مولوی عبدالقادر نہایت ذہین، موقعہ شناس اور سیاسی بصیرت کے مالک تھے۔ ڈیلدر صاحب یا دوسرے متعلقہ افسر تو برائے نام منتظم بندوبست تھے۔ بیشتر انتظامات ملکی، راجاؤں سے معاملات و معاہدات، تشخیص و جمعبندی، شہروں کی آبادی، فصل خصومات وغیرہ یہ تمام معاملات مولوی عبدالقادر کے مشورے اور رائے سے انجام پاتے تھے۔ یہ صحیح اور مخلصانہ مشورہ دیتے۔ اس لئے حکام ان کی قدر کرتے تھے۔

مولوی عبدالقادر ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۱ء تک مراد آباد کے صدر الصدور رہے[1] یہ اس زمانے کا بڑا عہدہ تھا جو کسی ہندوستانی کو ملتا تھا مولوی صاحب دس سال تک مراد آباد کی صدر الصدوری کے عہدے پر فائز رہے۔ ایک مرتبہ کسی کام میں دیر ہو گئی مراد آباد کے جج اوگڈن صاحب نے ناقدردانی کے انداز میں کوئی بات کہہ دی بھلا مولوی عبدالقادر کو کہاں برداشت ہو سکتی تھی فوراً صدر الصدوری سے استعفاء دیدیا۔ جج نے بعد کو معذرت چاہی مگر مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے قسم کھالی ہے کہ "اکنوں تا زندگی ملازمت انگریزی نخواہم کرد" اب میں تا زندگی انگریزی ملازمت نہ کروں گا یہ ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء کا واقعہ ہے۔

---

[1] حافظ احمد علی خاں شوق رامپوری نے لکھا ہے کہ وہ ۱۸۳۹ء میں ترک ملازمت کرکے دہلی گئے (کاملان رامپور کے ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء ص ۲۳۴

[2] مولوی عبدالقادر نے "وقائع" میں اپنے تفصیلی حالات ۱۸۳۱ء تک لکھے ہیں، مولوی عبدالقادر کے پوتے مرزا نظیر الدین ابن مرزا عبدالہادی نے بھی اپنے خودنوشت حالات "نگینہ انگشتری سلیمانی" کے نام سے فارسی میں لکھے ہیں جس کا اردو ترجمہ "وقائع نصیر خانی" کے نام سے ہم نے کیا ہے اور وہ وقائع عبدالقادر خانی (علم و عمل) کی جلد دوم میں شامل ہے مولوی عبدالقادر کے ۱۸۳۱ء کے بعد کے حالات جستہ جستہ اس کتاب میں شامل ہیں، جن کا خلاصہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اسی سال خاندان تیموریہ کے آخری فرمانروا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر نے مولوی عبدالقادر کو دہلی طلب فرمایا کیونکہ ان کا وزیر راجا موہن لال فوت ہوچکا تھا وزارت کے لئے کسی لائق تجربہ کار اور جہاندیدہ شخص کی ضرورت تھی جب مولوی صاحب حسب طلب حضور میں حاضر ہوئے تو منصب وزارت، خلعت ہفت پارچہ مع جیغہ، کلغی، تسبیح مروارید، اور عصائے زریں کار مرحمت فرمایا گیا" امیر الامراء، زبدۃ العلماء، دبیر الدولہ وکیل مطلق صادق الملک مستوفی الممالک مولوی عبدالقادر خاں بہادر ثابت جنگ" کا خطاب بارگاہ سلطانی سے عطا ہوا۔

مولوی عبدالقادر نے اپنے فرائض بہت حسن وخوبی سے انجام دئے بہادر شاہ ظفر بہت خوش ہوئے چند ماہ کے بعد حکم شاہی ہوا کہ قلعے کے وظیفہ خواروں کے معاملات، عمارت کے حسابات، ملازمین کا عزل ونصب اور تمام مقدمات بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے کی بجائے نواب زینت محل بیگم صاحب کے حضور میں پیش کئے جائیں مولوی عبدالقادر صاحب اس کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ "مخدرۂ علیا" کے حضور میں معاملات پیش کریں لہذا مستعفی ہو گئے[1]

کچھ دنوں دہلی میں دریا گنج میں نواب شمس الدین خاں رئیس فیروز پور جھرکہ (ش ۱۸۳۵ء) کی کوٹھی میں رہے۔ اسی زمانے میں اس کوٹھی میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کے برادر نسبتی علی بخش خاں[2] (ابن نواب الٰہی بخش خاں معروف) بھی رہتے تھے[3] یہی وہ زمانہ ہے کہ جب مولوی

---

[1] ملاحظہ ہو وقائع نصیر خانی (مشمولہ وقائع عبدالقادر خانی (علم وعمل) جلد دوم) (کراچی ۱۹۶۱ء) ص ۲۶ - ۲۹

[2] علی بخش ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے علی بخش خاں سے مرزا غالب کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے علی بخش خاں کو فیروز پور جھرکہ سے سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا، نواب احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد ان کا وظیفہ بند ہوگیا۔ جب نواب شمس الدین خاں، ولیم فریزر کے قتل کے سلسلے میں پھانسی پاگئے اور اُن کی ریاست ضبط ہوگئی تو سرکار انگریزی سے علی بخش خاں کے لئے سو روپے کی بجائے پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوگیا، علی بخش خاں کا انتقال ۳۱ دسمبر ۱۸۶۲ء کو ہوا، دہلی میں دفن ہوئے (غالب از غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۳۶ء) ص ۳۸ - ۳۹ -

[3] مولوی بشیر الدین لکھتے ہیں کہ "یہ وہ مکان تھا جس میں پہلے فیروز پور کے نواب شمس الدین رہتے تھے اور ان کے (باقی صفحہ ۳۴)

عبدالقادر اور مرزا غالب کے تعلقات رہے ہوں گے۔[۱]

مولوی عبدالقادر شاعری میں اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ لغات اور اصطلاحات کی بھرمار ہو۔ اس زمانے میں مرزا غالب کا رجحان مشکل پسندی کی طرف تھا اور وہ مرزا بیدل کے پیرو تھے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا غالب بڑی جانکاہی اور جگر کاوی سے ایسا کلام کہتے تھے جو الفاظ و تراکیب کے لحاظ سے نہایت پُرشکوہ اور شاندار معلوم ہوتا مگر معنی کے اعتبار سے چیستاں ہوتا تھا مولوی عبدالقادر تمکینؔ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے نہایت لطیف اور ظریفانہ انداز میں مرزا غالب کو سمجھایا کہ مشکل لغات اور پُرشکوہ الفاظ، کلام کی خوبی نہیں ہیں اور یہ طرز و انداز صحت مندانہ فکر اور قبولیت عام کے عنصر سے عاری ہے[۲] اس واقعے کو خواجہ الطاف حسین حالیؔ اسطرح لکھتے ہیں:۔

(بقیہ صفحہ ۳۳ سے آگے) مرزا علی بخش خاں رہنے لگے جنہوں نے دریا کے پیٹے میں ایک باغ بھی لگوایا تھا" واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم (آگرہ ۱۹۱۹ء) ص ۱۲۶

[۱] وقائع عبدالقادر خانی (علم و عمل) جلد اول میں ۱۸۱۶ء تک کے واقعات آگئے ہیں مولوی عبدالقادر ۱۸۱۷ء میں بسلسلۂ ملازمت دہلی پہنچے ۱۸۱۸ء واپس آگئے ۱۸۱۹ء میں دوبارہ گئے ۱۸۲۱ء میں ان کا تبادلہ اجمیر ہوگیا دہلی میں مرزا غالب کے مستقل قیام کا سلسلہ قریب قریب اسی زمانے سے شروع ہوا۔ غلام رسول مہر صاحب کا خیال ہے کہ غالب ۱۸۱۲ء میں مستقل طور سے دہلی میں سکونت پذیر ہوئے (غالب از مہر ص ۸۷) ۱۸۲۶ء تک مولوی عبدالقادر کا مستقل تعلق راجستھان سے رہا وقائع عبدالقادر خانی ۱۸۳۱ء میں ختم ہو جاتی ہے۔ مولوی عبدالقادر وقائع کے اختتام پر مولوی محمد اسمٰعیل شہید دہلوی کا ذکر شروع کرنے سے پہلے لکھتے ہیں کہ "چونکہ اکس کے بعد میں نے اجمیر اور دہلی کو نہیں دیکھا لہذا جو باتیں رہ گئی ان کو یہاں نقل کرتا ہوں" (علم و عمل، وقائع عبدالقادر خانی جلد دوم، کراچی ۱۹۶۱ء ص ۳۳۳) اور وقائع میں صرف ۱۸۳۱ء تک کے حالات شامل ہیں لہذا اس میں غالب کا ذکر نہیں ہے خیال یہ ہے کہ جب مولوی عبدالقادر بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ ہوئے تو اُن کے تعلقات مرزا غالب سے ہوئے ہوں گے۔

[۲] ملاحظہ ہو یادگار غالب از خواجہ الطاف حسین حالیؔ (شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۳۲ء) ص ۹۸-۱۰۲

"ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے جن کو چند روز قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا مرزا (غالب) سے کسی موقعہ پر یہ کہا کہ آپ کا ایک شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال ؎ پھر دوا جتنی ہی کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سنکر سخت حیران ہوئے اور کہا کہ حاشا یہ میرا شعر نہیں ہے۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کے کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرایہ میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں" [۱]

صاحبِ تذکرہ کاملانِ رامپور اس سلسلے میں یہ نشاندہی فرماتے ہیں کہ مرزا غالب سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے کہا کہ مولوی (عبدالقادر) صاحب نے آپ کے کلام سے ظرافت کی ہے [۲]

خواجہ الطاف حسین حالی اس قسم کے واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان نکتہ چینیوں اور تعریضوں سے مرزا غالب متنبہ ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہِ راست پر آگئی۔ مولوی عبدالقادر نے اُردو زبان کے محاورات، تذکیر و تانیث، سند الفاظ، اور کلام کی سلاست و روانی کے سلسلے میں بڑی صحت مندانہ بحث کی ہے اور غیر جانبدارانہ انداز میں میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا پر بھی تنقید کی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مولوی عبدالقادر جیسے نقادانِ سخن کی نکتہ چینیوں اور تعریضوں سے مرزا غالب نے مشکل پسندی کو چھوڑ کر سلاست و روانی کو اختیار کیا۔ اور مرزا کے دل میں انکا ایک خاص مقام تھا [۳]

اس کے بعد نواب محمد سعید خاں والی رامپور (ف ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء) کی طرف سے مولوی عبدالقادر کو طلبی کا خط پہنچا نواب رامپور اور مولوی عبدالقادر میں مکتب کے زمانے سے تعلقات تھے جس زمانے میں مراد آباد میں مولوی عبدالقادر صدر الصدور تھے تو نواب محمد سعید خاں وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، نواب صاحب نے مولوی عبدالقادر کو رامپور میں عدالت دیوانی اور فوجداری کا مفتی، مدرسہ عالیہ کا نگراں اور حاکم مرافعہ مقرر کیا۔

---

[۱] یادگارِ غالب ص ۱۰۱ [۲] تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۲۶۴

[۳] خطوطِ غالب (جلد دوم مرتبہ غلام رسول مہر) (کتاب منزل لاہور) ص ۲۱۲

نواب محمد سعید خاں کے صاحبزادے نواب یوسف علی خاں (ف ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۵ء) اور کاظم علی خاں (ف ۱۲۹۹ھ/۱۸۷۹ء) مرادآباد میں مولوی عبدالقادر کے شاگرد رہ چکے تھے اب پھر حکم ہوا کہ وہ مولوی صاحب سے مزید استفادہ کریں۔ اسی طرح نواب کلب علی خاں (ف ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء) اور صاحبزادہ فدا علیخاں کو حکم ہوا کہ وہ بھی مولوی عبدالقادر کی خدمت میں استفادہ علم کے لئے حاضر ہوا کریں [1]

مولوی عبدالقادر شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے فارسی کے اکثر اشعار موقع بہ موقع "وقائع" میں بھی موجود ہیں جس سے ان کی قادر الکلامی اور پختہ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ غمگین تخلص تھا۔ اُردو کا کچھ نمونہ کلام بھی "وقائع" میں ہے۔ منشی امیر احمد مینائی لکھتے ہیں:۔

"عربی فارسی اُردو بھاکا مرہٹی سب زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کلیات ان کا گم ہوگیا، مگر اُردو اور فارسی کچھ شعر ملے کہ درج تذکرہ ہوئے

کیونکر نہ کروں پیری میں مَیں سیر جہاں کی　　　دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا!

حرم میں برہمن رکھا نام میرا　　　گیا دیر میں تو مسلمان ٹھیرا
پر اس بُت کے نزدیک کیا جائے غمگیں　　　ہوا کفر ثابت کہ ایماں ٹھیرا

یہ ہے قسمت کی خوبی دیکھ اے میرے جنازے پر　　　نمازی یہاں تلک بھکے کہ اک تکبیر کم کردی

کس کی چتون نے مجھکو مارا ہے　　　اپنی آنکھوں کا جرم سارا ہے [2]"

مولوی عبدالقادر کا جس طرح کلّیات مفقود ہے اسی طرح اس فاضل کی دوسری تصنیفات بھی آج معدوم ہیں۔ اتفاق سے اُنھوں نے ۱۸۳۱ء تک کی تصنیفات کی ایک فہرست "وقائع" میں نقل کردی ہے جو درج ذیل ہے۔

---

[1] وقائع نصیر خانی ص ۲۹-۳۰۔ [2] انتخاب یادگار۔ از منشی امیر احمد مینائی (تاج المطابع لکھنؤ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء)

(۱) رسالہ ہشت ورقی:۔ اس رسالہ میں جد مشتر کے زمانہ سے شاہ عالم ثانی کی وفات تک ہر ایک بادشاہ کی مدت حکومت اور ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں حکومت منتقل ہونے کے حالات لکھے ہیں۔

(۲) تعلیقات بر جامع البرکات، شیخ عبدالحق دہلوی۔

(۳) شرح حکم مرتضوی در منافع امر و نہی مصطفوی۔

(۴) سہو اقلام علمائے علام

(۵) ترجمہ رسالہ حسن العقیدہ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی

(۶) شرح رسالۂ عقائد۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی

(۷) رموز اسماء معبودان ہنود۔

(۸) شرح میزان البلاغت۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی۔

(۹) تعلیقات بر شمائل ترمذی۔

(۱۰) کشف حقیقت دعا و اجابت۔

(۱۱) رسالہ قبلہ نما۔ اس رسالہ سے صحیح مذہبی راستہ معلوم ہو سکتا ہے۔

(۱۲) رسالہ عروض۔ مختصر و مفید ہے

(۱۳) قواعد اُردو۔ یہ کتاب ویلدر کے پاس رہ گئی۔

(۱۴) حکایات زبان اُردو۔ اس رسالہ میں ساٹھ حکایتیں ہیں جن میں بازاری، تاجر، صوفی، علماء مشائخ اور دفتری لوگ، غرض کہ ہر طبقے کے محاورات کہانیوں کے انداز میں بیان کئے گئے ہیں یہ کتاب بھی ویلدر صاحب کے پاس رہ گئی۔

(۱۵) امثال ہندی و فارسی۔ دونوں زبانوں کی وہ مشہور امثال جن کا مطلب ایک ہو اُس رسالہ میں درج کی گئی ہیں۔

(۱۶) تاریخ احوال اجمیر و مارواڑ۔ اس کتاب کی نقل ویلدر صاحب نے سر جان مالکم کے پاس بھیجدی تھی۔

(۱۷) رسالۂ شطرنج۔ یہ وہ رسالہ ہے جس کے مطالعے سے شطرنج باز کو تہذیب اخلاق، منطق، حکمت، کلام، طب،

ہندسہ، فقہ اور اصول وغیرہ علوم کا شوق پیدا ہو جائے کیونکہ اس میں ہر فن کے نمونے کھیل کی شکل میں بیان کئے گئے ہیں

(۱۸) رسالہ آداب نکاح۔ اس رسالہ میں فلسفۂ نکاح اور شرعی احکام کو عقلی طور پر بیان کیا گیا ہے

(۱۹) رسالہ فوائد صوم۔

(۲۰) برہان۔ اس رسالہ میں رمل، جفر، شگون، فال، قرعہ، استخارہ، تسخیر اور ٹوٹکے کا باطل ہونا اور جادو کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

(۲۱) رسالہ امکان خرق عادات۔ اس رسالے میں عقلی طور پر خرق عادات کی حقیقت کی تشریح کی گئی ہے۔

(۲۲) تربیت و تعلیم علوم و تربیت اطفال۔

(۲۳) طریق انتظام ملک۔

(۲۴) طرز تحریر۔ اس رسالہ میں احکام، اخبار، عرضی، ترجمہ، علمی مطالب، معاملات شوقیہ، تعزیت، تہنیت، سفارش کے لکھنے کا فرق اور رزیڈنسی و ایجنسی کی تحریر کی وضع بیان کی گئی ہے

اپنی تصنیفات کے متعلق وہ لکھتے ہیں:-

"میرے بعد جس کے بھی ہاتھ یہ رسائل لگیں اگر اپنے ہی نام سے شائع کر دے، تب بھی ہم خوش ہیں اور اگر کسی نالائق کے ہاتھ پڑ گئے تو وہ دوا فروشوں کے حوالہ کر دے گا۔" [۱]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالقادر کا یہ اندیشہ صحیح نکلا اور یہ تمام قیمتی ذخیرۂ کتب آج قطعاً ناپید ہے اور علمی دنیا اُن سے استفادہ کرنے سے محروم ہے۔

مولوی عبدالقادر کے اس مجموعۂ تصانیف کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں (۱) مذہبی (۲) تاریخی (۳) علمی و ادبی۔ مذہبی تصنیفات میں (۱) تعلیقات بر جامع البرکات (۲) شرح حکم تقوی (۳) ترجمہ رسالہ حسن العقیدہ (۴) شرح رسالہ عقائد شاہ عبدالعزیز (۷)، کشف حقیقت عادات اجابت

---

[۱] علم و عمل ص ۲۰۰

(۸) رسالہ قبلہ نما (۹) رسالہ آداب نکاح (۱۰) رسالہ فوائد صوم (۱۱) بُرہان (۱۲) رسالہ امکان خرق عادات۔ شامل ہیں یہ تصنیفات مولوی عبدالقادر کے علم وفضل پر دال ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث، فقہ، عقائد اور کلام پر کیسی ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ مولوی عبدالقادر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے خانوادے سے خاص طور سے متاثر ہیں۔ افکار وخیالات کے اعتبار سے بھی ولی اللہی مسلک کے متبع ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مجلس وعظ میں بڑی عقیدت سے شریک ہوتے ہیں۔ شاہ محمد اسمٰعیل شہید کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔

تاریخی کتابوں میں (۱) رسالہ ہشت ورقی اور (۲) تاریخ احوال اجمیر ومارواڑ ہیں۔ پہلی کتاب گو صرف آٹھ اوراق پر مشتمل ہے ظاہر ہے کہ مختصر سا رسالہ ہوگا۔ دوسری کتاب "تاریخ احوال اجمیر ومارواڑ" ضخیم ہونی چاہیے۔

علمی وادبی عنوان کے تحت (۱) سہو اقلام علمائے علاّم (۲) شرح میزان البلاغت شاہ عبدالعزیز (۳) رسالہ عروض (۴) قواعد اُردو (۵) حکایات زبان اُردو (۶) امثال ہندی وفارسی (۷) رسالہ شطرنج (۸) تربیت وتعلیم علوم وتربیت اطفال (۹) طریق انتظام ملک (۱۰) طرز تحریر۔ آتی ہیں۔ ان کتابوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولوی عبدالقادر نے اس زمانہ میں بعض کتابیں اُردو زبان میں لکھی ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُنھوں نے یہ کتابیں انگریز حکام کو اُردو سکھانے کی غرض سے تصنیف کی ہوں گی۔ اُردو نثر کی ابتدائی اور تدریجی ترقی کے مطالعے میں یہ تصنیفات خاص اہمیت کی مالک ہیں۔ مگر افسوس کہ آج ان نوادر کے صرف نام ہی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں رسالہ عروض، قواعد اردو، حکایات زبان اُردو اور امثال ہندی و فارسی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مولوی عبدالقادر جس طرح صاحب تصنیف تھے اسی طرح صاحب درس بھی تھے اور اس فن سے ان کو طبعی مناسبت تھی۔ پہلی مرتبہ جب وہ مراد آباد پہنچے تو وقت گزاری کے لیے مرادآباد کی شاہی مسجد میں پہنچ جاتے وہاں اکثر طلباء کتابیں لے آتے، جن میں نواب یوسف علی خاں رئیس رامپور وکاظم علی خاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اور مولوی عبدالقادر سے استفادہ کرتے۔ سفر بنگال میں بھی بعض لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ نواب عنایت اللہ خاں نے

رامپور میں ان سے "شافیہ" پڑھی، رامپور کے دوسرے صاحبزادگان نواب کلب علی خاں وصاحبزادہ فدا علی خاں نے بھی استفادہ کیا۔ اکثر انگریز حکام نے اُردو فارسی کی تحصیل کی لیکن جب ۱۸۳۵ء کے بعد وہ دہلی پہنچے تو اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب (ف ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) حضرت شاہ رفیع الدین صاحب (ف ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) شاہ ابوسعید مجددی (ف ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۵ء) شاہ غلام علی (ف ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) شاہ محمد اسمٰعیل (ف ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) مولوی رشید الدین خاں (ف ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) اور مولانا فضل امام (ف ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء) وفات پا چکے تھے۔ ان کے جانشین اور فیض یافتہ علماء مسند درس وتدریس اور سجادہ رُشد وہدایت سنبھالے ہوئے تھے۔ اور دہلی کی علمی روایات برقرار تھیں۔ اکثر علماء درس وتدریس اور علوم دین کی نشرواشاعت میں مصروف تھے۔ ان علمائے ربانیین میں شاہ مولانا محمد اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) شاہ احمد سعید مجددی (ف ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء) شاہ عبدالغنی (ف ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء) مفتی صدرالدین (ف ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) مولانا فضل حق خیرآبادی (ف ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) مولانا مملوک علی (ف ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء) اور مولوی کریم اللہ دہلوی (ف ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء) مولوی کرامت علی (ف ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء) سرفہرست ہیں۔ ان ہی علماء کے ساتھ ہمارے مولوی عبدالقادر بھی دہلی میں درس دیتے ہیں۔ چنانچہ آخری زمانے کے نامور اہل حدیث عالم (شمس العلماء) میاں نذیر حسین دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) نے مولوی عبدالقادر سے تحصیل علم کی[1]

مولوی عبدالقادر آخر وقت تک رامپور میں رہے وہ وہاں "مولوی عبدالقادر چیف" کے نام سے مشہور تھے، مولوی صاحب، حضرت مولانا شاہ جمال الدین رامپوری سے بیعت تھے مولوی عبدالقادر کا ۷ رجب ۱۲۶۵ھ (۳۰ مئی ۱۸۴۹ء) کو ستر سال کی عمر میں رامپور میں انتقال ہوا[2] اور وہ اپنے مُرشد شاہ جمال الدین کے مزار کے پاس (واقع بریلی دروازہ) دفن ہوئے۔

---

[1] الحیاۃ بعد الممات از فضل حسین (مطبع اکبری آگرہ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)

[2] منشی امیر احمد مینائی لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالقادر نے پینسٹھ برس کی عمر پائی (انتخاب یادگار ص ۲۰۲) مینائی مرحوم کا یہ بیان درست نہیں اس لئے کہ مولوی عبدالقادر ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء میں پیدا ہوئے جیسا کہ انھوں نے خود "وقائع" میں لکھا ہے (باقی صفحہ ۴۱ پر)

مولوی عبدالقادر نے دو بیٹے یادگار چھوڑے، بڑے بیٹے مولوی مرزا عبدالہادی (۱۲۱۵ھ تا ۱۲۸۷ھ)[۱] اور چھوٹے مرزا عبدالقیوم (۱۲۲۷ھ تا ۱۲۷۳ھ) تھے۔ مولوی عبدالہادی سرکار انگریزی میں ملازم رہے اور ڈپٹی کلکٹری تک ترقی کی۔ ان کے صاحبزادے مرزا نصیرالدین تھے۔ جنہوں نے مشہور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کے حالات میں ایک کتاب "نجیب التواریخ" مرتب کی ہے[۲] مرزا عبدالقیوم رئیسانہ زندگی گزارتے تھے ۱۲۷۳ھ میں ۴۶ سال کی عمر میں انتقال ہوا[۳]

ترتیب کے سلسلہ میں چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ مترجم نے تمام ترجمہ ایک دفتر میں لکھا ہے نہ کوئی عنوان ہے نہ پیراگراف، ابواب کی تقسیم، پیراگرافوں کی پابندی، عنوانات یہ سب ہمارے قائم کئے ہوئے ہیں۔ مترجم نے ترجمہ میں لفظی پابندی پر زور دیا ہے۔ ہم نے بامحاورہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس میں احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے۔ اصل کتاب جابجا کرم خوردہ ہے اس لئے ترجمہ میں بھی وہ مقامات چھوٹے ہوئے ہیں۔ خاص طور سے انگریزی حکام کے نام نہایت غلط تحریر ہوئے ہیں حتی الوسع ان ناموں کی صحت کر دی گئی ہے لیکن پھر بھی بعض مشتبہ معلوم ہوتے ہیں ترتیب و حواشی کے سلسلہ میں ہمیں سب سے زیادہ مدد اپنے ذاتی کتب خانہ سے ملی۔ اس کے علاوہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے کتب خانوں سے بھی مدد ملی۔

جن کتابوں کا حواشی میں حوالہ دیا گیا ہے۔ ان میں مؤلف کے نام، مطبع، مقام اور سن طباعت کو ضرور لکھا گیا ہے اکثر ایسی کتابیں ملیں جن میں سن طباعت یا بعض اوقات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰ سے آگے) اور ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں ان کا انتقال ہوا لہذا انتقال کے وقت ان کی عمر ستر سال تھی۔

[۱] ملاحظہ ہو وقائع نصیر خانی ص ۵۵ - ۶۰، ۱۱۱

[۲] مصنف کا خود نوشت نسخہ عبدالسلام کلکشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے۔

[۳] ملاحظہ ہو وقائع نصیر خانی ص ۵۴ - ۵۵

مقام طباعت بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں قوسین میں مطبوعہ لکھ دیا ہے۔ خاتمہ کتاب میں دو ضمیمے نوابان رامپور اور دہلی کے رزیڈنٹ وایجنٹ، فہرست کتب حوالہ جات اور اشاریہ بھی شامل کئے گئے ہیں۔

محمد ایوب قادری
۲۰ رجب المرجب ۱۳۷۹ھ
مطابق ۱۹ر جنوری ۱۹۶۰ء

نظر ثانی ۱۹ر جنوری ۱۹۶۹ء
بروز یکشنبہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا خمیر اوّلین آب و گل سے عبارت ہے
اور آخر کار زیر خاک ہی جاتا ہے۔ چنانچہ ہماری یہ آمد و رفت
خود اختیاری نہیں بلکہ یہ چند روزہ زندگی بھی کسی اور ہی کے
قبضے میں ہے جو بے حد ہوشیار اور بے مثل قدرت والا ہے
جس نے اس قالب خاکی میں جان ڈالی پھر عقل و ہوش
بخشا اور ہماری جنس میں سے ایک ایسی ذات[1] کو پسند
کیا جس نے تمام اشیاء کو کانٹے کی تول کر دکھایا تاکہ ہم لوگ
ظلم و ستم سے باز رہیں اور جب عالم آخرت میں پہونچیں تو
ہمیشہ آرام سے رہیں یہ بے بضاعت اس سے زیادہ کیا
حمد و ثنا کر سکتا ہے۔

عبد القادر

[1] حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔

بابِ اوّل

خاندان میرے بزرگوں میں اسحٰق نامی آذربائیجان میں ایک خانہ نشین شخص تھے جو خشک سالی کی بناپر آذربائیجان سے ہرات پہونچے اور چند روز وہاں قیام کیا اور ہرات میں احمد نامی ..... [۱] بچپن ہی میں رہنمائی کی بناپر سب سے پہلے سینے کو گنجینۂ عرفان بنایا، احمد نے اُس زمانہ میں ہندوستان کا راستہ لیا، جبکہ محمود خاں اور اشرف خاں افغان، ایران میں ہنگامے کر رہے تھے۔ احمد سیدھے دہلی پہونچے کچھ عرصہ تک ان کو کسی نے نہ پوچھا یہاں تک کہ جو کچھ سرمایہ پاس تھا خورد و نوش میں ختم ہوگیا اور سوائے رحمت باری کے کوئی ذریعہ نہ رہا تب رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور بغیر کسی کی دستگیری کے مدرسہ غازی الدین [۲] میں امامت کی جگہ مل گئی اور مولوی نذر محمد مدرس اور مرزا جان (متولی) سے دوستانہ بلکہ برادرانہ راہ و رسم پیدا ہوگئی۔ مرزا احمد کا ایک برلاسی نسل کی لڑکی سے عقد ہوگیا جس سے تین لڑکے محمد اعظم، محمد معظم اور محمد اسلم پیدا ہوئے سب نے پیشہ سپہ گری اختیار کیا، محمد معظم عالم نوجوانی میں نظام الدین اولیاؒ کے راستہ میں گھوڑے سے گر کر جان بحق تسلیم ہوا اور

---

[۱] (مرزا) اسحاق ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء میں تبریز میں پیدا ہوئے اور نادر شاہ کی جنگ میں ہرات میں فوت ہوئے مرزا احمد (مرزا) اسحاق کے بیٹے تھے مروجہ علوم کی تحصیل نامور علماء سے کی علم حدیث میں محدث کا درجہ رکھتے تھے ۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء اور ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء کے درمیان دہلی آئے احمد محدث کا ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ کاملان رامپور از حافظ احمد علی خاں شوق (ص ۳۶۸، ۳۶۹) مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء)
یہ مقام کرم خوردہ ہے مگر مفہوم واضح ہے کہ احمد کی پیدائش اور تعلیم و تربیت کا ذکر ہے۔

[۲] مدرسہ غازی الدین خاں فیروز جنگ المتوفی ۱۷۱۰ء (والد نظام الملک آصف جاہ اول) نے اجمیری دروازہ کے پاس قائم کیا تھا مدرسے کی عمارت کے ساتھ ایک خوب صورت مسجد بھی تعمیر کرائی تھی اور پاس ہی مقبرہ بنوایا جہاں خود دفن ہوئے۔ اس مدرسہ کا دوسرا دور ۱۷۹۲ء میں شروع ہوا اور ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہوگیا جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کی ایک مشہور درس گاہ تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے "مرحوم دہلی کالج" میں مدرسہ غازی الدین کا بانی فیروز جنگ ثانی خلف نظام الملک آصف جاہ کو لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ (ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں از ابوالحسنات ندوی مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء ص ۴۳، "مرحوم دہلی کالج" از مولوی عبدالحق مفید عالم پریس لاہور ۱۹۴۵ء) ص ۲

محمد معظم باپ کی اطلاع بغیر دکن کو روانہ ہو گیا پھر اس کی کوئی خبر نہیں ملی. محمد اسلم باپ کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا، اور اس کا نکاح خواجہ محمد امین پسر خواجہ محمد اسحاق کی لڑکی کے ساتھ ہو گیا خواجہ محمد امین اس شہر دہلی میں فو وارد تھے اس کے بعد جب شہر دہلی ایرانی مسلمانوں[1] اور کافران دکن[2] کے ہاتھوں تباہ ہوا تو محمد اسلم والدین کے حکم سے اپنی بیوی اور ہفت سالہ لڑکے محمد اکرم کو چھوڑ کر قاسم علی خاں[3] عالی جاہ کے لشکر میں بنگال پہونچے اور وہاں اپنی آسائش کا سامان فراہم کر لیا اور وہیں رہنے کا ارادہ کر لیا کہ ......[4] خط لکھا کہ نامہ بر کے ہمراہ فوراً چلے آئیں وہ وہاں سے روانہ ہو کر مراد آباد پہونچے تھے کہ زمانہ نے پلٹا کھایا اور دوسرا نامہ بر پہونچا کہ جہاں بھی پہونچے ہو، آ۔ گے پیر نہ بڑھائیں میں بھی آتا ہوں اس شہر مراد آباد میں خاندان رستم خاں عالمگیری کے کہ ......[5] سید احمد امیر کبیر قشون افغانان کٹھیڑ کے درمیان تھی کوئی شناسائی نہ رکھتے تھے ان کے ہمسائے کے مکان پہ ......[6] اور ان بزرگوارنے جو کچھ نوکری میں فراہم کیا تھا قاسم علی خاں کی شکست[7] میں ......[8] اور بہ ہزار دشواری بانس بریلی تک آیا اور کارواں سرائے میں قیام کیا سواری کا گھوڑا مر چکا تھا کوڑی پاس نہ رہی تھی راستہ کی تکالیف کی وجہ سے سخت بخار میں مبتلا ہوا اور بیماری نے طول کھینچا اب گو ......[9] تھا. لیکن چل نہیں سکتا تھا ......[10] آرام لیا ......[11] دروازہ پر آیا ......[12] سوداگر کے لڑکے نے جس کی دہلی میں مدرسہ (غازی الدین) کے سامنے دکان تھی اس کو (محمد اسلم) دیکھ کر پہچان لیا اور کہا کہ میاں

---

[1] حملہ نادر شاہ ۱۷۳۹ء   [2] مرہٹہ گردی مراد ہے

[3] قاسم علی خاں کو انگریزوں نے ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کی بجائے مرشد آباد کا نواب بنایا تھا۔

[4] یہ مقام کرم خوردہ ہے. مفہوم واضح ہے کہ محمد اسلم نے اپنے اہل و عیال کو بلانے کا ارادہ کیا تھا۔

[5] و [6] یہ مقامات کرم خوردہ ہیں   [7] قاسم علی خاں نواب مرشد آباد نے جب انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننا پسند نہ کیا تو انگریزوں نے ۱۷۶۳ء میں دوبارہ میر جعفر کو مرشد آباد کا نواب بنا دیا ۱۷۶۳ء میں قاسم علی خاں بریلی پہونچے حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے بہت کچھ دلدہی اور خاطر مدارات کی اور اپنی پناہ میں لیکر آنولہ سے تین کوس کے فاصلہ پر مقام اتر چھینڈی میں نواب سعد اللہ خاں مرحوم کی حویلی میں مقیم کیا جہاں وہ پانچ سال رہے ۱۷۷۷ء میں قاسم علی خاں کا دہلی میں انتقال ہوا۔ (حیات حافظ رحمت خاں از سید الطاف علی بریلوی، نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۳ء ص ۱۳۲، سیر المتاخرین جلد دوم غلام حسین طباطبائی نولکشور پریس ۱۸۹۷ء ص ۶۹۵ ـ ۱۳، ۷، تواریخ ڈھاکہ مولفہ رحمن علی طیش مطبوعہ اسٹار آف انڈیا ۱۹۱۰ء) ص ۱۱۰، ۱۱۱، تواریخ جدید صوبہ اڑیسہ و بہار مولفہ اولاد حیدر فوق مطبوعہ مطبع اکبری پٹنہ ۱۹۱۵ء

[8] و [9] و [10] و [11] و [12] یہ مقامات کرم خوردہ ہیں مگر سیاق و سباق سے مفہوم واضح ہے۔

تمہارے بیوی بچے تو مراد آباد میں ہیں تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جواب دیا کچھ نہیں تنگدستی اور ناتوانی کی وجہ سے نہ چلنے کی طاقت ہے اور نہ رہنے کی کوئی صورت، سوداگر نے کہا کہ جو کچھ ہمیں میسّر ہے وہ تمہاری ہی برکت سے ہے کل میں اپنے آدمیوں کو بلانے کے لئے مراد آباد بہلی بھیج رہا ہوں اس سے بہتر کیا ہوگا کہ تم اس میں بیٹھ کر آرام سے گھر پہونچ جاؤ اُنھوں نے اُس کی اس آشنا دوستی کی خوب داد دی اور علی الصباح بریلی سے مراد آباد کو روانہ ہو گئے اور مٹھی بھر ناتواں ہڈیوں کو بصد دشواری گھر پہونچایا چند ماہ زندہ رہے، مرض میں زیادتی ہوتی رہی علاج کے لئے ہاتھ تنگ تھا آخر کار اس خاکدان کو چھوڑ ہی دیا اور سید احمد کے اصطبل کے متصل قبرستان میں ان کو سپرد خاک کیا گیا[1]۔

محمد اسلم نے ایک ہشت سالہ لڑکا مسمی محمد اکرم چھوڑا جس کا سرپرست سوائے اس کی ماں

مرزا محمد اکرم کے کوئی نہ تھا ماں ہی نے اس کو قرآن شریف پڑھایا اس کے بعد مادر مشفقہ اپنی بڑی بہن سے ملاقات کے لئے مصطفےٰ آباد عرف رامپور آئیں رامپور، مراد آباد سے جانب مشرق دس کوس کے فاصلے پر ہے ان کی بہن مولوی محمد مقیم صاحب[2] (نواب فیض اللہ خاں کے فرزند محمد علی خاں کے اُستاد) کی بیوی تھیں اُنھوں نے کہا کہ بہ نسبت مراد آباد کے تمہارا یہاں رہنا بہتر ہے کیونکہ وہاں تمہارا غم خوار کون ہے؟ اُنھوں نے بھی اس کو منظور کرلیا...... [3] .... تہ دل سے سُن کر کبوتروں کو اپنے ہم عمر دوستوں کے

---

[1] مرزا محمد اسلم کا انتقال مراد آباد میں ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں ہوا (تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۶۹)

[2] مولوی محمد مقیم نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کی طرف سے بطریق سفارت گورنر کے پاس بھی آتے جاتے تھے (تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۷۳)

[3] یہاں ایک صفحہ متن کتاب سے غائب ہے مگر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس مقام پر مولوی عبد القادر نے اپنے والد مرزا محمد اکرم اور اپنی پیدائش کا ذکر کیا ہے مرزا محمد اکرم کا مفصل حال تذکرہ کاملان رامپور میں تحریر ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے:-

"مرزا محمد اکرم ولد مرزا محمد اسلم ——— مرزا محمد اسلم کے انتقال کے وقت مرزا اکرم کی عمر سات سال کی تھی آپ اپنی والدہ کے ساتھ ۱۱۹۲ھ میں اپنی خالہ مولوی محمد مقیم کی بیوی کے گھر رامپور آئے تحصیل علم کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں آپ کی شادی مراد آباد محلہ مغلپورہ میں مرزا غلام مصطفےٰ بیگ کی دختر سے ہوئی علماء کی صحبت سے رغبت تھی اردو شاعری کا مذاق بھی تھا آشنا تخلص تھا تمام عمر صاحبزادہ نظام علی خاں خلف نواب فیض اللہ خاں کے مصاحبوں میں رہے ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں رامپور میں انتقال ہوا اور شاہ بغدادی کے احاطہ مزار میں چبوترہ کے نیچے دباقی صفحہ ۴۸ پر)

سپرد کیا۔[۱]

تعلیم و تربیت

اسی عرصہ میں میری نانی جو میری دادی کی طرح سوائے میری والدہ کے کوئی اور اولاد نہ رکھتی تھیں اس (والدہ) کی جدائی سے پریشان تھیں۔ میری دادی کے بلانے پر گھر اور عزیزوں کو مرادآباد چھوڑ کر رامپور پہونچ گئیں اور اپنی لڑکی کے ساتھ رہنے لگیں چار سال تک یہ دونوں بوڑھیاں میری پرورش کرتی رہیں۔ میری زبان کھلتے ہی سب سے پہلے لفظ اماں، ابا سے آشنا ہوئی اور وہ (دادی)، میری والدہ کو بھی دہلی کی اردو سکھاتی تھیں اور ہمیشہ یہ رہتا کہ جو بات مرادآباد کے محاورے کی، دہلی کے محاورے کے خلاف زبان پر آتی ان (والدہ) کو اس پر فوراً متنبہ کر دیتیں جب میری زبان سے حرف صاف نکلنے لگے تو مولانا شاہ جمال الدین لاہوری نے مجھے آیۂ کریمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا[۲] بطریق رسم سکھائی۔ پھر دادی اور نانی نے خورد و نوش کا وہ طریقہ جس سے دیکھنے والے کو ناگوار گزرے بتایا کہ غٹ غٹ کی آواز نہ نکلے اور پانی کا اتنا گھونٹ نہ لے کہ حلق میں گھٹ جائے اور کسی کے سامنے اشیائے خوردنی دیکھ کر اس پر نظر نہ جائے اور بے بلائے جا کر پہلو بہ پہلو نہ بیٹھے بلکہ اجازت ہوتے ہوئے فاصلے سے سامنے بیٹھے آنکھ ناک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷ سے آگے) دفن ہوئے آپ نے تین فرزند مولوی مفتی عبدالقادر خاں، مرزا محمد ناصر اور مرزا غلام باسط یادگار چھوڑے"

("تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۶۹)

منشی امیر احمد مینائی انتخاب یادگار میں لکھتے ہیں :۔

"مرزا محمد اکرم ولد مرزا محمد اسلم مرو متین تھے ظریف و ذہین تھے کلام میں لطافت ہے ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء سال رحلت ہے پچہتر سال کی عمر پائی چند شعر ملے وہ درج تذکرہ ہوئے"

آئینہ اس کے ہاتھ سے اک بار گر پڑا　　　آنکھوں کی اپنی جب اسے مستی نظر آئی
آشنا کو نہ اٹھا بزم سے اپنی ظالم　　　ایسے ملنے کے نہیں ناز اٹھانے والے
{ انتخاب یادگار از منشی امیر احمد مینائی تاج المطابع لکھنؤ ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء ص

مرزا محمد اکرم کا سال وفات ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء ہے انتخاب یادگار میں سال وفات صحیح نہیں لکھا ہے اسی طرح ان ہر دو تذکرہ نویس مؤلف تذکرہ کاملان رامپور و مؤلف انتخاب یادگار نے جس جگہ مولوی عبدالقادر خاں کا حال تحریر کیا ہے وہاں ان کے والد کا نام مرزا محمد اکرم کے بجائے مرزا محمد کرم لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ کم و بیش یہی اصلات مرزا نصیر الدین نے لکھے ہیں انھوں نے سال وفات ۱۲۳۳ھ لکھ دیا ہے، ملاحظہ ہو وقائع نصیر خانی ص ۲۱ و ۲۲، مولوی قدرت اللہ شوق آشنا کے کلام کا طویل انتخاب دیا ہے "تذکرہ طبقات الشعراء از قدرت اللہ شوق (مرتبہ نثار احمد فاروقی) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۸ء ص ۶۱۹ - ۶۲۳ [۱] مرزا محمد اکرم کو بچپن میں کبوتر روں سے دلچسپی تھی جب ان کو نصیحت کی گئی تو کبوتر دوستوں کے سپرد کر دیئے [۲] ترجمہ: سب تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو اولاد نہیں رکھتا اور نہ کوئی اس کے ملک میں شریک ہوا اور نہ کوئی کمزوری کا سہارا ہے اس کی بڑائی کر بڑا جان کر۔

اور منہ کو صاف رکھے۔

میرے والد جب مجھکو مولانا جمال الدین لاہوری کے سامنے لے جاتے تو وہ ہر کام اور ہر وقت کی مقررہ دعائیں مجھے تعلیم فرماتے، چنانچہ جب میری عمر کے چار سال چند ماہ گزر گئے تو برسم اہل اسلام طے ہوا کہ بزم احباب میں قرآن شریف کی تعلیم شروع کرائی جائے حسب الارشاد جناب مولانا جمال الدین، میں نے سورۂ اقراء زبانی پڑھ دی اگرچہ ہنوز حرف شناس نہ تھا مگر والدہ کی زبانی یاد کر چکا تھا .... اس کے بعد دادی نے قرآن شریف کی تعلیم دی جبتک آموختہ ٹھیک نہ سن لیتی تھیں کسی بات کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی یاد کر لینے سے پہلے کھانا بھی نہیں ملتا تھا سات سال کی عمر میں قرآن شریف ختم ہوا اور حضرت مولانا نے نماز سکھائی، اب کچھ نماز کی تاکید بھی مجھ پر ہونے لگی چونکہ اس وقت جداگانہ معلم رکھنے کی گنجائش نہ تھی اور والدین خورد سالی کی بناء پر عام مکتبوں میں جہاں عام لوگوں کے بچے بھی ہوتے ہیں بھیجنا مناسب نہیں سمجھتے تھے لامحالہ چودہ برس کی عمر تک گھر میں پرورش پاتا رہا۔ دادی نے پند نامہ سعدی (کریما) اور منطق الطیر خواجہ فریدالدین عطار پڑھائی اس کے بعد والد صاحب اگر مصاحبت (صاحبزادہ نظام علی خاں) سے جو شبانہ روز کی حاضرباشی تھی فرصت پاتے تو کبھی چند سطور گلستاں کی اور کبھی ایک دو شعر بوستان کے اور کبھی کسی کی تحریر پڑھنے کے لئے مجھے دیتے اور اس بات کا ہمیشہ لحاظ رہتا کہ جو بات ایک مرتبہ میری زبان سے ٹھیک نکل گئی اس کو دوبارہ خود نہ کہتے بلکہ میں ہی اس کو کہتا اور اگر میں اپنی فراموشی کا اظہار کرتا تو کچھ سخت سست کہنے کے بعد یاد دلا دیتے۔

والد صاحب کو جس وقت فرصت ملتی روزانہ ایک مرتبہ حضرت مولانا جمال الدین لاہوری کی خدمت میں حاضر ہو کر مذہبی و ادبی علوم اور تہذیب اخلاق حاصل کرتے تھے، حضرت مولانا کی تعلیم کی برکت سے میرے والد نے باوجود عالم جوانی کے اقوال و افعال میں وہ طرز بزرگانہ حاصل کر لیا کہ رندوں اور زاہدوں کے دل مسخر ہونے لگے۔

کوائف رامپور جب میری عمر تیرہ سال ہو گئی[1] تو شہر (رامپور) میں ایک عام حادثہ پیش آیا کہ ۱۸ ذی الحجہ سنہ ۱۲۰۸ھ ۱۷۹۳ء کو نواب فیض اللہ خاں[2] والی شہر نے ایک دنبل کے عارضہ میں جو ناگہاں انکی

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ مولف کی سن پیدائش ۱۱۹۵ھ ۱۷۸۰ء ہے۔

[2] نواب فیض اللہ خاں پسر نواب علی محمد خاں والی روہیل کھنڈ ۱۱۴۶ھ ۱۷۳۳ء میں آنولہ میں پیدا ہوئے جب انتظامی امور کے لحاظ سے روہیل کھنڈ کی تقسیم کی گئی تو شاہ آباد اور رامپور وغیرہ کا علاقہ نواب فیض اللہ خاں کو ملا ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کر کے صرف رامپور (باقی صفحہ ۵۰ پر)

پشت پر نکل آیا تھا اس دار فانی کو چھوڑ کر ملک جاودانی کی راہ لی اور نواب محمد علی خاں[۱] ان کے بڑے لڑکے اور ولیعہد ان کے جانشین ہوئے اور باپ کے خزانے کو جو ستر لاکھ سے زیادہ نصرت خاں مرحوم کے ہاتھوں میں اس کے لڑکوں شجاعت خاں، فیض محمد خاں اور دوست محمد خاں کی تحویل میں تھا وہاں سے اٹھوا کر اپنے گھر منگوا لیا لیکن بموجب فرد تین لاکھ روپے کی اشرفیاں کم نکلیں اور یہ تینوں فرزند پابہ زنجیر ہوئے۔

نواب محمد علی خاں کے سب بھائی یعنی حسن علی خاں، فتح علی خاں، غلام محمد خاں، یعقوب علی خاں قاسم علی خاں اور کریم اللہ خاں (جواب تک صحیح[۲] و سالم مراد آباد میں ہیں) اور عموی زادوں یعنی نصر اللہ خاں پسر نواب عبد اللہ خاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹ سے آگے) کا علاقہ نواب فیض اللہ خاں کو چھوڑا۔ یہ رئیس باتدبیر، شجاع، مدبر، خداترس اور پابند شرع تھا۔ (اخبار الصنادید از حکیم نجم الغنی رامپوری جلد اوّل نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۸ء ص ۵۹۰)

[۱] نواب محمد علی خاں نواب فیض اللہ خاں کے سب سے بڑے بیٹے تھے ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء میں پیدا ہوئے ان کی شادی محب اللہ خاں ولد دوندے خاں کی بیٹی اجابن بیگم کے ساتھ ہوئی تھی جس سے احمد علی خاں پیدا ہوئے۔ نواب فیض اللہ خاں نے محمد علی خاں ہی کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور اپنی زندگی ہی میں اپنے تمام عہدہ داروں بیٹوں اور بھتیجوں سے محمد علی خاں کو نذریں دلوا دی تھیں جیسا کہ جنگ نامہ دو جوڑہ سے اندازہ ہوتا ہے:۔

خلف ایک تھا ان کا محمد علی	تھی اس پر نہایت ہی شفقت دلی
نہایت اسے پا کے عالی مزاج	کیا تھا مقرر اسے دینا راج
لہٰذا اسے اپنے جیتے ہی جی	ولی عہد کر اپنی دستار دی
وے کہتے تھے ہر ایک سے سن اے حبیب	محمد علی خاں ہے عالی نصیب
تولد ہوا گھر میں جب سے یہ پور	اسی دن سے دولت نے پکڑا ظہور
کیا اس لئے میں نے مختار اسے	کرو ں ہوں یہیں دل سے بہت پیار اسے
تم اس کو رئیس اپنا جانا کرو	سدا حکم تم اس کا مانا کرو

(جنگ نامہ دو جوڑہ از محمد معظم عباسی)
(قلمی، مملوکہ محمد ایوب قادری) ص ۳۔۲

[۲] یعنی سال تدوین کتاب ۱۲۳۵ھ

اور مصطفےٰ خاں[1] پسر نواب اللہ یار خاں اور احمد یار خاں پسر نواب محمد یار خاں[2] (جو اب تک ٹانڈہ میں بسر اوقات کر رہے ہیں) سب نے اس کے فرمان پر سر تسلیم خم کر لیا مصطفےٰ خاں اس وقت لکھنؤ میں تھے۔ مگر غلام محمد خاں نے جو نواب محمد علی خاں کا حقیقی بھائی تھا اور باپ کے زمانے سے ریاست کے خواب دیکھ رہا تھا اپنے دل میں کچھ اور منصوبہ گانٹھا اگرچہ مسند نشین نے پہلے چاروں بھائیوں کو بطور خلعت "دو سو اشرفیاں عطا کیں اور غلام محمد خاں کو جو ان میں کمسن تھا مصاحبت اور فوجی مختاری کا امتیاز بھی بخشا لیکن اس کے حوصلے نے اس پر قناعت نہ کی بلکہ فوج کے شوریدہ سروں مثل خاندان محمد عمر خاں اور مصطفےٰ خاں عرف بنجو خاں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور کہا کہ اس شخص کی ریاست میں اعلیٰ و ادنیٰ میں کوئی امتیاز نہ رہے گا[3] جیسا کہ اس کے لڑکے کی خصلت سے ظاہر ہے۔

---

[1] مصطفےٰ خاں نواب اللہ یار خاں کے فرزند تھے نواب فیض اللہ خاں نے اپنی ایک بیٹی (نواب محمد علی خاں کی حقیقی بہن) کا عقد مصطفےٰ خاں کے ساتھ کر دیا تھا اور بطور فرزندان کی پرورش کرتے تھے شاہ عالم بادشاہ دہلی نے ان کو "امتیاز الدولہ مبارز الملک نواب مصطفےٰ خاں بہادر حشمت جنگ" کا خطاب دیا تھا رامپور کا نام ان ہی کے نام پر مصطفےٰ آباد رکھا گیا نواب محمد علی خاں کے معاملے کی کوشش نواب آصف الدولہ کے دربار میں نواب مصطفےٰ خاں نے کی۔ (اخبار الصنادید جلد اول ص ۲۹۴، ۲۹۵، ۵۹۴)

[2] نواب محمد یار خاں علی محمد خاں والیٔ روہیل کھنڈ کے پسر چہارم تھے آنولہ سے چار میل بجانب مشرق ٹانڈہ عرف محمد نگر میں سکونت پذیر تھے شاعری سے ذوق تھا امیر تخلص تھا ابتدا میں قائم چاندپوری سے مشورہ کرتے تھے اور انتہا میں مصحفی سے تلمذ ہوا۔ نواب محمد یار خاں امیر کی سرپرستی کی بدولت فدوی لاہوری، میر محمد نعیم، پروانہ علی شاہ مراد آبادی، میاں عشرت، حکیم کبیر علی سنبھلی وغیرہ ٹانڈہ میں مقیم رہے مصحفی نے ٹانڈہ کی پر لطف صحبتوں کو بڑی حسرت و آرزو سے لکھنؤ میں یاد کیا ہے حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے ٹانڈہ کو تاخت و تاراج کیا فیض اللہ خاں نے نواب محمد یار خاں کو رامپور بلا لیا اور پچاس ہزار روپئے سالانہ مصارف کے لئے مقرر کر دیئے ذیقعدہ ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں نواب محمد یار خاں کا رامپور میں انتقال ہوا۔ (اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۵۶۰ و ۵۵۹۔ انتخاب یادگار صفحہ ۳۱، ۳۲) تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۹ء ص ۳۲۸، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء ص ۱۹۸، تذکرہ شعرائے اردو مؤلفہ میر حسن دہلوی مطبوعہ دہلی ۱۹۴۰ء ص ۱۳، گلشن ہند از مرزا علی لطف مطبوعہ لاہور ۱۹۰۶ء ص ۳۵، تذکرہ ہندی از مصحفی، مطبوعہ دہلی ۱۹۳۳ء ص ۱۳ - ۱۵، تذکرہ طبقات الشعراء از قدرت اللہ شوق ص ۴۲۲ - ۴۵۱،

[3] حکیم نجم الغنی رامپوری نے اپنی کتاب میں ان تمام اسباب کو مفصل بیان کیا ہے جن کی بنا پر سرداران روہیلہ نواب محمد علی خاں سے بگڑ بیٹھے (باقی صفحہ ۵۲ پر)

نواب محمد علی خاں کی معزولی

جب (محمد عمر خاں اور مصطفےٰ خاں عرف نجو خاں) کے دونوں خاندان جو برادری، بہادری اور زور وزر کے لحاظ سے اس لشکر میں ممتاز تھے رئیس سے بدگمان ہو گئے تب اُنھوں نے اوروں کو بھی اپنا ہم نوا کر لیا۔ بتاریخ ۱۳ محرم ۱۲۰۹ھ [۵] کہ ابھی دوپہر بھی نہیں ہوا تھا مُلا بدر الدین کو غلام محمد خاں نے رئیس (نواب محمد علی خاں) کے پاس یہ پیام دیکر بھیجا کہ اس کے سردار نہایت بد دل ہو کر میرے پاس آتے ہیں ان کی تسلّی کے لئے ان کو دری خانے میں لاتا ہوں حضور بے دماغ نہ ہوں بلکہ تسلی بخش کلمات فرمادیں۔ حکم ہوا لے آؤ اسی اثناء میں خدمت گار نے ادب سے جُھک کر عرض کی کہ اس وقت شہر میں کچھ اور ہی شہرت اُڑ رہی ہے کہ ایک بھائی باپ کی مسند کا طالب آرہا ہے، امیر پاک باطن نے (خدمت گار سے) فرمایا کہ "ارے لڑکے بکواس نہ کر۔ اوّل تو وہ میرے بیٹے کے بجائے ہے دوسرے اس نے مجھ سے پختہ عہد و پیمان کر لیا ہے لوگ آپس میں بھڑانا چاہتے ہیں اس کے اور میرے درمیان تفرقہ ڈال کر اپنی گرم بازاری چاہتے ہیں۔ یہ باتیں ختم ہی ہوئی تھیں کہ دیکھا ایک گروہ کا گروہ ڈھال تلوار اور زرہ بکتر سے لیس مجلس آرائے کے زینے پر چڑھا چلا آرہا ہے، نواب محمد علی خاں نے بھائی (غلام محمد خاں) کی طرف متوجہ ہو کر دریافت کیا کہ اس بے سرو سامانی کے ساتھ یہ گروہ کیوں آرہا ہے؟ تب اس نے کہا۔ [۶]

برادر چناں با برادر بگفت ۔۔۔ کہ من حرف حق را نخواہم نہفت

کہا بھائی نے اپنے بھائی سے یوں ۔۔۔ نہ میں حرف حق کو چھپا ہی سکوں

ستمگارہ و کجرو و خودسری ۔۔۔ نزیبد ترا بر مہاں سروری

تو ظالم ہے خودسر ہے بدکار ہے ۔۔۔ تری سروری بس نہ درکار ہے

(حاشیہ صفحہ ۵۱ سے آگے) نواب محمد علی خاں کی طبیعت سخت گیر تھی وہ دربار آصفی کے آداب ان پٹھانوں پر جاری کرنا چاہتا تھا جن کے یہ لوگ عادی نہ تھے۔ نواب آصف الدولہ کی تعلیم و صحبت سے نواب محمد علی خاں نے امامیہ مذہب بھی اختیار کر لیا تھا۔ (اخبار الصناديد جلد اول ص ۶۰۹، ۶۰۷، ۶۰۰) قیصر التواریخ جلد اول از کمال الدین حیدر حسینی مطبوعہ نولکشور پریس ۱۸۹۶ء ص ۱۰۸

۵ اخبار الصناديد (جلد اوّل) اور انتخاب یادگار میں اس ہنگامہ کی تاریخ ۱۳ محرم ۱۲۰۹ھ تحریر ہے ۶ حکیم نجم الغنی رامپوری نے منتخب العلوم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نواب غلام محمد خاں نے کہا کہ: "داوا آپ مسند سے اُتر جائیے تمام لوگ آپ سے ناراض ہیں اور میری فہمائش کو خیال میں نہیں لاتے ہیں آپکو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا اور ان کو بھی فہمائش کرتے کرتے عاجز آگیا (اخبار الصناديد جلد اول ص ۶۱۵)

تو برخیز و بنشیں بیک گوشہ	رسانم ہمانجا ترا توشہ
تو اب اُٹھ یہاں سے پکڑ ایک گوشہ	تجھے میں وہیں پر دلاؤں گا توشہ
شنید ایں و آمد چو شیر ژیاں	کہ ناگہ رسد بر سر گلہ باں
یہ سنکر غضنفر جو بپھرا اُٹھا	سر گلہ باں پر اچانک پڑا
سپر ہا ز لشکر ز سالار تیغ	تو گوئی کہ برقِ جہاں ست د میغ
سپر لشکری کی تھی تلوار شاہ	چمکتی تھی بجلی ز ابرِ سیاہ

اس مار پیٹ کے ہنگامے میں اچانک امیر کا دامن پیر کے نیچے آگیا پیر پھسلا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس وقت غلام محمد خاں کے دستے کے ایک بہادر جوانمرد غلام نامی[۲] نے پیچھے سے تلوار ماری اوروں نے بھی چاہا کہ وہیں اس کا کام تمام کردیں لیکن سیف الدین خاں[۳] خود سپر بنکر درمیان میں آگئے بہادر خاں اور عظیم اللہ خاں (فرزند مصطفےٰ خاں) بھانجے نے، پالکی میں ڈال کر دیوان عام کے مشرقی دروازے سے جواب نہیں ہے باہر نکالا اور باپ کی محلسرائے میں کریم اللہ خاں اور حسن علی خاں کی والدہ[۴] کے پاس پہنچادیا[۵] اور کلو نام جراح کو علاج کے لئے مقرر کیا[۶]

---

[۱] حکیم نجم الغنی رامپوری نے جام جہاں نما (قدرت اللہ شوق) کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جب نواب محمد علی خاں تلوار لیکر جھپٹے تھے تو سپاہی کائی کی طرح پھٹ گئے تھے۔ گھبراہٹ میں بعض چبوترے کے تلے گر گئے نواب محمد علی خاں نے نواب غلام محمد خاں پر کئی وار کئے مگر سرداروں کی سپروں کی آڑ کی وجہ سے ان کے کوئی زخم نہ آیا" (اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۱۵)

[۲] حکیم نجم الغنی نے لکھا ہے کہ یہ تلوار بلند خاں نے ماری تھی (اخبار الصنادید جلد اوّل ص ۶۱۵)

[۳] سیف الدین خاں اور بہادر خاں نواب محمد علی خاں کے ماموں تھے (انتخاب یادگار ص ۴۳)

[۴] کریم اللہ خاں کی والدہ کا نام نہایت بیگم تھا جو قبیلہ بنیر وال سے تھیں اور حسن علی خاں کی والدہ کا نام تاج بیگم تھا یہ قبیلہ کمال زئی سے تھیں (اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۰۱)

[۵] محل میں پہونچکر نواب محمد علی خاں نے اپنے لڑکے نواب احمد علی خاں کو دو نصیحتیں کیں "ایک تو یہ کہ میں امامیہ مذہب ہوں اگرچہ جانتا ہوں کہ میری تجہیز و تکفین اس مذہب پر نہ ہوسکے گی مگر تم کو اپنے مذہب سے آگاہ کردیا، دوسری نصیحت یہ ہے کہ تم نواب وزیر الملک (نواب آصف الدولہ) کی سرکار میں مستغیث ہونا وہ ضرور تمہاری کمک کریں گے اور تم رئیس ہوجاؤ گے مگر وقت پاکر بطرز مناسب میرے دشمنوں سے انتقام ضرور لینا" یہ کہکر بیہوش ہوگئے" (انتخاب یادگار ص ۴۴) [۶] محمد معظم ساکن بریلی مؤلف جنگ نامہ دو جوڑہ نے معالج کا نام عبد الغفور لکھا ہے اور یہ معاصر شہادت ہے (باقی صفحہ ۵۴ پر)

نواب غلام محمد خاں کی مسند نشینی

(ان واقعات کے بعد) ہر شخص نے نواب غلام محمد خاں کی نوابی کا مجرا ادا کیا۔ نواب محمد علی خاں کی حکومت کا رویہ بے حد پریشان کن تھا فوجی سردار جو چاہتے کر گزرتے، اسی روز نصرت خاں کے لڑکوں کو رہائی مل گئی نواب محمد علی خاں کی مسند نشینی کے ۲۶ روز بعد ظالموں کا دستِ ستم کم ہوا[1] آخر خاص مشیروں کی یہ رائے ہوئی کہ مظلوم امیر (نواب محمد علی خاں) کی شہر میں نگہداشت دشوار ہے قلعہ خام (گڑھی) میں جو شہر سے باہر بجانب شمال کوس بھر کے فاصلے پر واقع ہے (اور ابھی تک اس کے آثار باقی ہیں) رکھا جائے چنانچہ سید حسن شاہ[2] کو بیگمات کے پاس بھیجکر اُن کی حفظ جان کے متعلق قسم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳ سے آگے) بلایا شتابی سے عبد الغفور، جو ٹانگے لگانے میں تھا ذی شعور

زمانے میں زخموں کی جا وہ نحت کی | ولا سرد کو آتش گرم دی

جو ٹانکے لگے ساٹھ یا چار کم | اس ہوشیار کا آیا غفلت میں دم

(جنگ دو جوڑہ قلمی ص ۲۰)

[1] نواب محمد علی خاں ۸ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۴ء کو مسند نشین ہوئے اور ۴ محرم الحرام ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء کو معزول ہوئے۔ اس طرح ان کا دورِ حکومت صرف ۲۶ روز رہا

[2] سید حسن شاہ کے والد سید علی شاہ نواب علی محمد خاں والی روہیل کھنڈ کے زمانے میں ترمذ سے آکر آنولہ میں مقیم ہوئے سید علی شاہ کا انتقال آنولہ ہی میں ہوا اور وہیں نواب علی محمد خاں کے مقبرے کے پاس تالاب کے شمال مغربی گوشے میں دفن ہوئے ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۸ء میں جب روہیلوں اور فرخ آباد والوں کے درمیان جنگ ہوئی تو نواب سعد اللہ خاں کو سید حسن شاہ گود میں لیکر ہاتھی میں بیٹھے اور خدا کے فضل سے نواب سعد اللہ خاں مامون و محفوظ رہے جس وقت نواب فیض اللہ خاں رامپور میں آئے تو سید حسن شاہ کو بھی مع اہل و عیال رامپور لے آئے اور بہت اعزاز و اکرام سے رکھا (تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۰۹ سفرنامہ مخلص مرتبہ ڈاکٹر اظہر علی مطبوعہ ہندوستان پریس رام پور ۱۹۴۶ء ص ۸۶ — حیات حافظ رحمت خاں ص ۴۵

مؤلف اخبار الصنادید نے نواب محمد علی خاں کے واقعات کے سلسلے میں سید حسن شاہ ہی کا نام بطور ضامن تحریر کیا ہے اور ان کا یہ بیان معاصر شعرا دونوں مثلاً جنگ نامہ دو جوڑہ (منظوم عباسی جنگ نامہ تسلیم، نظم عبدہ، نظم ضامن وغیرہ پر مبنی ہے مگر منشی امیر احمد مینائی لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ حافظ جمال اللہ صاحب پیر و مرشد نواب غلام محمد خاں، نواب محمد علی خاں کے ضامن بنے تھے اور جب نواب محمد علی خاں مار ڈالے گئے اور" یہ خبر محل میں پہونچی ادھر آپ (نواب محمد علی خاں) کی بہنوں نے حضرت شاہ جمال اللہ صاحب قدس سرہٗ کے پاس کسی کو بھیجا کہ حضرت یہ کیا ہوا اور اُدھر نواب غلام محمد خاں صاحب بہادر نے بھی حضرت کے پاس کہلا بھیجا کہ مجھے مطلق خبر نہیں کہ نواب محمد علی خاں بہادر (باقی صفحہ ۵۵ پر)

ساتھ پختہ عہد کر لیا کہ نہایت حفاظت اور راحت و آرام سے لیجائیں گے اور وہاں کے نگہبانوں کے سپرد کریں گے۔ دوسرے روز نیا رئیس باپ کی جگہ ایوان میں آیا اور درباریوں کو مجرائی اور سلامی کا موقع دیا اور تینوں بھائیوں کو جو اس سے بڑے تھے یعنی حسن علی خاں، فتح علی خاں اور نظام علی خاں کو چھ ہزار روپے سالانہ کا اضافہ فرمایا بارہ ہزار پہلے سے مل رہے تھے اس کے بداندیشوں نے اس پر آمادہ کر دیا کہ قیدی امیر کو ختم ہی کر دینا چاہیئے۔ سننے میں آیا ہے کہ اس کے زخم اچھے ہونے لگے ہیں اور جراح رقم کے لالچ میں وہاں سے ہٹتا ہی نہیں، ایک رات سید خاں کے ہمراہ جو نواب غلام محمد خاں کا پرانا کارگزار تھا امین الدین خانساماں، کسرول[۱] کے کلالوں میں سے اور منسا پوربیہ (بکسریہ) اور اعلام روہیلہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴ سے آگے) کو کس نے قتل کیا وہاں حضرت کا یہ حال تھا کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا تھا اسی وقت سے پیٹ میں درد شدید پیدا ہو گیا تھا مضطربانہ ٹہل رہے تھے اور پسینہ متصل جاری تھا یہاں تک کہ پاؤں عرق میں غرق ہو ہو جاتے تھے۔ یہ پیغام جو شخص لے گیا تھا آپ نے اس سے بدمزہ ہو کر فرمایا کہ خیر میں نے تو خمیازہ ضامن ہونے کا اٹھایا کہ گھڑی دو گھڑی میں میرا کام تمام ہے مگر کہدینا کہ تم سب کے واسطے بہت برا ہوا، اور یہ امر باعث زوال و دولت ہو گیا۔ نو دس بجے ملک کی یہ گفتگو تھی مرید جمع ہوتے جاتے تھے سورۂ یٰسین کی تکرار ہو رہی تھی اسی حالت میں گیارہ بجے دن کو انتقال فرمایا۔ (انتخاب یادگار ص ۴۴) اس سلسلے میں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ منشی امیر احمد مینائی نے نواب محمد علی خاں کے قتل کی تاریخ ۲۰ر صفر ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء لکھی ہے نجم الغنی خاں نے ۲۱ر محرم ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء دفن کی تاریخ لکھی ہے (اخبار الصنادید ص ۶۲۰) حالانکہ قتل کی تاریخ نجم الغنی خاں ۲۲ر محرم کی شب تحریر کرتے ہیں (اخبار الصنادید ص ۶۱۹) اور تذکرہ کاملان رامپور کے بیان کے مطابق شاہ حافظ جمال اللہ کے انتقال کی تاریخ ۳ر صفر ۱۲۰۹ھ ہے (تذکرہ کاملان رامپور ص ۹۰)

[۱] حکیم نجم الغنی خاں جنگ نامہ دو جوڑہ (معظم) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "اس زمانہ میں صاحبزادہ مصطفٰے خاں ابن اللہ یار خاں ابن علی محمد خاں بہادر کے توسط سے جن سے نواب محمد علی خاں کی حقیقی بہن منسوب تھی آصف الدولہ تک خفیہ دادخواہی کی اور عرضی بھیجی اس پر انھوں نے لکھا کہ نواب محمد علی خاں مجروح کو فوراً یہاں بھیجدو ہم یہاں انگریزی ڈاکٹروں سے ان کی مرہم پٹی کرائیں گے جب اس مضمون کا شقہ آصف الدولہ کا رامپور میں پہونچا تو سب افسروں نے صلاح کی کہ نواب محمد علی خاں کا کام تمام کر دینا چاہیئے ورنہ بڑا جھگڑا پیدا ہوگا" (اخبار الصنادید ص ۶۱۹) اور منشی امیر احمد مینائی لکھتے ہیں کہ "جب مرہم پٹی ہوتے ہوتے زخموں میں اندمال کی صورت نظر آنے لگی تو پہرے پر جو سپاہی کھڑا تھا اس سے نواب نے کہا کہ ارے سنتا ہے اب میرے زخم اچھے ہو چکے ہیں سرداروں سے کہدینا کہ ایک ایک سے سمجھوں گا اور مونچھوں کی رسیاں بٹواؤں گا" (انتخاب یادگار ص ۴۶)

[۲] کسرول مراد آباد کا ایک محلہ ہے جہاں کلال شیوخ کی آبادی ہے۔

روہیلہ اس بیہودہ کام کے لئے وہاں پہونچے اور بحالت خواب اعلام[1] نے پستول کی گولی ان کے سینہ پر ماری منسانے گلا گھونٹ دیا امین الدین (کلال) ان کے سینۂ بے کینہ پر چڑھ بیٹھا اور ان (نواب محمد علی خاں) کی روح عالم جاودانی میں پہونچ گئی آخر شب میں اس گروہ نے شہر میں آکر خونِ بے گناہ کے غازے سے اپنی سرخروئی ظالم امیر (نواب غلام محمد خاں) کے سامنے ظاہر کی صبح صادق کے ہوتے ہی سرکاری چوبدار بھائیوں اور سرداروں کے گھر گیا اور یہ فرمان پہونچایا کہ رات نواب محمد علی خاں نے خودکشی کرلی ان کی تجہیز و تکفین کے لئے چلنا چاہیئے، چنانچہ سب لوگ گئے اور نہلا کفنا کر اس مقبرہ میں جہاں اِن کا بہت سا خاندان سو رہا ہے دفن کردیا لیکن باوجود اس لیپا پوتی کے وہ خون ناحق چھپ نہ سکا اور جو واقعہ گزرا تھا اکثر کی زبان زد ہوگیا وہاں سے (یعنی دفن سے واپسی پر) تمام لوگوں نے رئیس کے سامنے آکر رسم تعزیت ادا کی کیونکہ وہ اس کا مشفق بھائی تھا رئیس بھی کلمات حسرت آمیز زبان پر لاتا کہ میرا قوت بازو نہ رہا اور آنکھوں سے آنسو پونچھتا لوگ نواب آصف الدولہ کو اس (نواب محمد علی خاں) کا حامی سمجھتے تھے اس لئے ایک محضر تیار کیا گیا اور ناکردہ گناہ (خودکشی) کو اس کی طرف منسوب[2] کیا اسی پر فسخ بیعت کی بنیاد رکھی اور اسی کو اپنے نفس کا قاتل تحریر کیا، اس محضر نامہ کو خاندانیوں اور خورد و کلاں افغانی سرداروں کی مہروں سے قابل اعتماد بنادیا محمد اکبر خاں[3] خلف حافظ رحمت خاں کا وظیفہ اس جرم میں ضبط ہوگیا کہ وہ ابطال شہادت یعنی صفائی کے گواہوں میں شامل نہ ہوئے اور علماء نے بھی اس پر اپنی گواہی لکھدی مگر اکبر شاہ[4]

---

[1] حکیم نجم الغنی خاں رام پوری اور منشی امیر احمد مینائی نے اس کا نام اعلام کے بجائے الہام خاں لکھا ہے

(اخبار الصنادید ص ۶۱۹، انتخاب یادگار ص ۴۶)

[2] محضر کا مضمون یہ تھا "نواب محمد علی خاں نے غیرت کی وجہ سے تمنچہ مار کر خودکشی کرلی ہے، شب کو ان کی آرام گاہ میں خبر ہوا دیکھا تو وہ مرے پڑے تھے"

(اخبار الصنادید جلد اول ص ۲۲۷)

[3] نواب محمد اکبر خاں حافظ الملک کی شہادت کے بعد رام پور میں سکونت پذیر ہو گئے، نواب فیض اللہ خاں نے اپنی ایک بیٹی مینا بیگم کی شادی انکے ساتھ کردی اور چار سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا۔ انشاء پردازی میں کامل دستگاہ تھی خط شکست بہت اچھا لکھتے تھے نہایت متقی پرہیزگار مناہی شرعیہ سے بیزار اور افعال شنیعہ سے متنفر تھے۔ آغاز جوانی سے آخر عمر تک صوم و صلوٰۃ کے نہایت پابند رہے۔ (اخبار الصنادید جلد اوّل ص ۵۰۵ حیات حافظ رحمت خاں ص ۳۰۱) [4] مولوی اکبر شاہ کا کچھ حال معلوم نہ ہوسکا تذکرہ کاملانِ رامپور میں جام جہاں نما (قدرت اللہ شوق) کے حوالہ سے صرف نام درج ہے۔ (تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۴۹)

نیز دو اور خدا پرست خانہ نشین مولوی جمال الدین لاہوری[1] اور مخدومی سراج احمد سرہندی[2] نے (خدا ان کی مغفرت کرے) کہ ان دونوں بزرگوں کو اس صورت میں (بصورت تصدیق محضر) سوائے اپنی دین فروشی کے اور کوئی باعث نہ تھا (اس محضر پر دستخط کئے[3]) الغرض اس محضر کو نواب آصف الدولہ کے پاس لکھنؤ روانہ کر دیا اور فتح علی خاں کو معذرت و اصلاح کے لئے بھیجکر موانست کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

آصف الدولہ کی رامپور پر فوج کشی اس کے بعد معلوم ہوا کہ آصف الدولہ کا، رئیس خود سر و برادر کش کی گوشمالی کا پختہ ارادہ ہے۔ نواب غلام محمد خاں سامانِ جنگ کی تیاری، فوج کی نگہداشت، توپوں کی آراستگی اور برق اندازی کی مشق میں منہمک ہو گئے اور ابلہ فریبی کی غرض سے اس فساد انگیزی کا نام جہاد رکھ لیا۔ آخر فتح علی خاں نے (لکھنؤ سے) لکھا کہ مصالحت کی اُمید بالکل نہیں رہی تب سعادت خاں عمر خیل افضل گڑھ والا سکھوں کو لانے کے بہانے سے سیکڑوں اشرفیاں لے کر بجانب جمن روانہ ہو گیا اور یہاں پر (رام پور میں) ہر کس و ناکس جو بھی آتا نوکر ہو جاتا اور

---

[1] مولوی جمال الدین ولد کفایت علی لاہور وطن تھا حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے علوم عقلی و نقلی اور حدیث و تفسیر کی تحصیل کی شاہ عبد العزیز دہلوی کے ہم سبق تھے شاہ فخر الدین دہلوی سے بیعت کی اور خلافت پائی اول مراد آباد آئے اور وہیں شادی کی اس کے بعد رامپور پہونچے نہایت منکسر المزاج اور حلیم الطبع تھے ۱۹ جمادی الاول ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۹۲، ۹۱، انوار العارفین از مولوی محمد حسین مراد آبادی مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء ص ۵۱۲

[2] مولوی سراج احمد ولد مولوی محمد مرشد ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء میں سرہند میں پیدا ہوئے ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء میں ان کے والد رام پور آ گئے مولوی سراج احمد کی تمام تر تعلیم و تربیت رامپور میں ہوئی بڑے عالم فاضل اور صاحب نسبت تھے خصوصاً حدیث میں دستگاہ کامل تھی لکھنؤ میں ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء کو انتقال ہوا رامپور میں دفن ہوئے علم حدیث میں چند تصانیف ہیں خاندانِ مجددیہ کے حالات میں ایک کتاب سیر المرشدین لکھی (تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۱۴۸، ۱۴۷)

[3] حکیم نجم الغنی خاں رامپوری محضر پر مہر کرنے کی بابت لکھتے ہیں کہ "اس محضر پر چھوٹے بڑے تمام افسروں کی مہریں ہوئیں علما کے پاس وہ محضر گیا تو انھوں نے بھی مہریں کر دیں مشائخ نے بھی مہریں کیں اور قاضی نے بھی مہر لگائی مگر سرداروں میں سے محمد اکبر خاں خلف حافظ رحمت خاں نے اور افسرانِ فوج میں سے قلندر خاں نے اور علما میں سے اخون اکبر شاہ اور مولوی عبد العزیز نے اور مشائخ میں سے میاں حسن شاہ نے اور خاندانِ غوث میں سے نصر اللہ خاں خلف عبد اللہ خاں نے مہریں نہ کیں اور دو تین اور بھی شخصوں نے مہریں نہ کیں"۔ (اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۲۷)

ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی پا لیتا، نواب (غلام محمد خاں)، اور دوسرے آزمودہ کار لوگوں کی یہ رائے تھی کہ غلہ سامان اور پیادہ فوج کو مع عیال و اطفال دامنِ کوہ میں بھیجدیا جائے اور سواروں نیز سامانِ جنگ گھوڑے تپچی کے ساتھ شہر میں رہیں جس وقت حریف آجائے جو کچھ ہو سکے کریں اگر معذوری دیکھیں اسی محفوظ مقام میں پہونچ جائیں اور وہاں ایک عرصۂ دراز تک اس طرح رہیں کہ مخالف کا لشکر ان پر قابو نہ پا سکے اور حسبِ منشا مصالحت ہو جائے مگر ان نوجوانوں کے ہنگاموں نے جنہوں نے کبھی میدانِ کارزار نہ دیکھا تھا اور انگریزوں کے ساتھ جنگ کو آتش بازی کا کھیل سمجھ رہے تھے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ بڑے بوڑھوں کی رائے کے مطابق کوئی مناسب صورت اختیار کی جائے چنانچہ خورد و کلاں اور اکابرِ قوم بیگاری سواریوں کے ذریعے بریلی کی طرف روانہ ہو گئے ابھی تک آصف الدولہ کی آمد نہیں ہوئی تھی دوجوڑہ کے میدان میں انگریزی فوج سے مقابلہ ہو گیا[۱] حسن علی خاں اور نظام علی خاں حریف سے مقابلہ ہونے سے پہلے ہی انگریزی فوج میں شامل ہو گئے اور محمد شفاعت اور محمد دلیر خاں نے جو نواب محمد علی خاں کے خاص لوگوں میں تھے ہنگامۂ کارزار کے وقت اپنے گروہ کو لے کر گھر کا راستہ لیا البتہ محمد عمر خاں کے خاندان اور مصطفیٰ خاں عرف نجو اور نسیم خاں خلف ملا رحم داد نے بہادری کی داد دیتے ہوئے بہت سے گمنام بہادروں کے ساتھ ایک ہی حملہ میں اپنے آپ کو توپوں تک پہونچا دیا ہندوستانی فوج انگریزی لشکر کی ضربِ تیغ کی تاب نہ لا سکی اور پسپا ہو گئی اب صرف انگریزوں اور افغانوں میں آتشِ جنگ بھڑک اٹھی حتیٰ کہ بلند خاں پسر محمد عمر خاں، مصطفیٰ خاں[۲] نجو اور نسیم خاں اور دوسرے بہادر افغان اور ایک اور بڑا افسر[۳] اور انگریزی فوج کے بہت سے سوار اور پیادے قتل[۴] ہو گئے بقیہ افغانوں نے

---

[۱] یہ جنگ ۲۴ اکتوبر ۱۷۹۴ء مطابق ۲۰ ربیع الاول ۱۲۰۹ھ بروز جمعہ ہوئی [۲] شمبو ناتھ حاکم بریلی کے ملازم نجو خاں اور بلند خاں کا سر کاٹ کر آصف الدولہ کے پاس لے گئے جو کڑے سے بریلی کی طرف روانہ ہو چکا تھا ملانی کھیڑے کے پل کے پاس سواری پہونچی تھی کہ شتر سوار دونوں سر لیکر پہونچا۔ وہ سر نواب کو دکھائے گئے اور وہاں سے واپس لاکر فتح گنج کے کھیڑے میں دفن کئے گئے۔ عنبر شاہ خاں آشفتہ نے نجو خاں کے مارے جانے کی تاریخ یوں کہی ہے:۔

مصطفیٰ خاں آنکہ نجو خاں بود ناماش بعرف — شد شہادت یاب چوں بر فوجِ اعدا در زدہ

بہرِ تاریخِ شہادت وقتِ قتلِ دشمناں — رستم روز نبرد ما از زمانش سر زدہ

۱۲۰۹ھ

نجو خاں کو شعر خوانی سخن رسی اور زبان دانی کا شوق زیادہ تھا حکیم میر ضیاء الدین عبرت شاگرد نواب محبت خاں محبت، نجو خاں کے ملازم تھے اور عبرت نے ان کی فرمائش سے قصہ راجہ رتن سین و پدماوت کو زبان ریختہ میں نظم کرنا شروع کیا تھا چہارم حصہ نظم ہونے پایا تھا کہ عبرت نے انتقال کیا (اخبار الصنادید جلد اول ۲۵۲ و ۲۵۳) [۳] اس افسر کا نام کرنل جارج برگٹن تھا [۴] اس جنگ میں اول پٹھان فتحیاب تھے بعد کو انگریزی فوج کے ہاتھ میدان رہا۔

غارت گری میں ہاتھ بڑھایا اس وقت جنرل ابرکرمبی نے تھوڑی سی فوج کے ساتھ دھاوا بول کر توپوں پر قبضہ کرلیا اور توپ اور بندوقیں چلنے لگیں۔ نواب کا لشکر بھاگا اور شہر میں پہونچکر خزانہ اور اہل وعیال لے کر دامنِ کوہ کی طرف چلتا بنا اُس مقام کو ٹپہ کہتے تھے اور پہاڑ کا نام لگان بھجن ہے پرگنہ رہپر سے اس کا راستہ ہے [1]

نواب آصف الدولہ کا رامپور میں داخلہ

انگریزی فوج نے فتح کے بعد ان (افغانوں) کا تعاقب نہیں کیا بلکہ میدانِ جنگ میں جاکر دونوں جانب کے زخمیوں کو اُٹھایا ان کی مرہم پٹی کی اور مقتولین کو دفنایا تیسرے دن شہر میں پہونچکر عاجزوں غریبوں کی نگہبانی کی، احمد علی خاں خلف نواب مظلوم (محمد علی خاں)، جو ابھی بچہ[2] تھا خدا کے فضل سے امن و امان سے شہر ہی میں تھا پھر نواب آصف الدولہ آ پہونچے اور عام منادی کا حکم دے دیا کہ ہمارے ملک میں افغان جہاں کہیں بھی ہو احمد علی خاں کی خوشنودی اور ہمارے ذاتی مراحم خسروانہ کی بنا پر امان میں ہے کوئی شخص اس کے جان و مال کے درپے نہ ہو اور جو شخص چاہے رامپور آجائے خواہ وہ غلام محمد خاں کی جماعت کا ہو اور کوئی شخص اس پر دست درازی نہ کرے لوگ یہ خوشخبری سُنکر جہاں بھی تھے شہر میں آگئے اور خود نواب نے انگریزی فوج کے ساتھ غلام محمد خاں کا تعاقب کیا اور بلیار سنگھ کو ایک پلٹن کے ساتھ شہر کی حفاظت کے لئے چھوڑا یہ نامہ نگار (مولوی عبدالقادر) بھی جو مرادآباد میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ تھا والد (مرزا محمد اکرم) صاحب کے حکم سے جو نظام علی خاں کی ڈیوڑھی پر رہتے تھے رامپور پہنچ گیا (ادھر اس) کامیاب لشکر کو دامن کوہ کی گندی آب و ہوا سے اذیت پہونچی اور وہ تباہی خوردہ جماعت (نواب غلام محمد خاں کی جماعت) علاوہ اس اذیت کے، بے سروسامانی اور خانہ ویرانی کی تکلیف بھی برداشت کررہی تھی مجبور ہوکر غلام محمد خاں بھی امن کا پیام دے کر چیری صاحب کے ذریعہ سے نواب آصف الدولہ کے لشکر میں شامل ہوگیا۔ مصالحت اس صورت پر ہوئی کہ نواب فیض اللہ خاں کا مال ان کے لڑکے کو اور غلام محمد خاں کا اندوختہ ان کے قبضہ میں رہے اور شاہ آباد، بلاسپور اور ڈھکیا بدستور بحال باقی ضبط اور ریاست بنام احمد علی خاں رہے گی مصالحت شدہ ملک کے علاوہ تعلقہ اکبرآباد جو ضبطی میں شامل ہے صرف خاص کے لئے قرار پایا روشن چوکی

---

[1] اس لڑائی کے حالات میں کئی نظمیں لکھی گئی ہیں جن میں سے "جنگ دوجوڑہ" محمد معظم عباسی بریلوی کی تالیف خاصی مشہور ہے نیز ملاحظہ ہو۔ "روہیل کھنڈ کا ایک ساکھا مرتبہ محمود نیازی (ماہنامہ "نیا دور" اپریل ۱۹۵۵ء لکھنؤ محکمہ اطلاعات اُتر پردیش)

[2] نواب احمد علی خاں کی عمر اُس وقت ۹ سال تھی۔

کی بھی اجازت ہوگئی اور چوبیس ہزار سالانہ ہر ایک حسن علی خاں، فتح علی خاں اور نظام علی خاں کو اور اٹھارہ ہزار ہر ایک چاروں دوسرے بھائیوں کو اور خود سری و ہنگامہ آرائی کے جرم میں غلام محمد خاں کی تنخواہ کو بڑے بھائیوں کے زمرہ سے نکال کر چھوٹے بھائیوں میں شامل کر دیا[1] اور نواب احمد علی خاں کے بیست سالہ ہونے تک نصر اللہ خاں خلف نواب عبد اللہ خاں مختار ریاست قرار پایا[2] اور نواب غلام محمد خاں کو نظر بند کر کے بنارس بھیجدیا[3] البتہ اس کے اہل و عیال شہر ہی میں رہے۔

مؤلف کتاب کا مولانا شرف الدین سے تحصیل علم کرنا

۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء میں راقم الحروف نے مولانا شرف الدین کی خدمت میں تعلیم حاصل کی نحو، رسائل منطق، فلسفہ، معانی و بیان اور کچھ اصول فقہ کی تحصیل کی، فقہ، حدیث، تفسیر، ہیئت، ہندسہ، حساب اور فرائض کی کتابیں ابھی تک اُستاد کے سامنے نہ رکھی تھیں کہ ایک دوسرا حادثہ پیش آگیا یعنی کابل و پشاور کا بادشاہ زمان شاہ لاہور تک[4] آگیا اور انگریزی فوج نواب سعادت علی خاں کے لڑکے کے ساتھ آکر نواب فیض اللہ خاں کے سب لڑکوں اور نواب غلام محمد خاں کے بیوی بچوں نیز کفایت اللہ خاں فرزند نواب نصر اللہ خاں اور محمد عمر خاں و حضرت شاہ خاں عرف سنو برادر رنجو خاں کو لکھنؤ لے گئی[5]

---

[1] یعنی بجائے آٹھ ہزار سالانہ کے ساڑھے چار ہزار سالانہ رہ گئے۔

[2] عہد نامہ مابین نواب آصف الدولہ و نواب احمد علی خاں کے جملہ شرائط اخبار الصنادید جلد اول صہ ۶۸۴ تا ۶۹۱ پر درج ہیں۔

[3] نواب غلام محمد خاں بعض وجوہ کی بنا پر انگریزوں کے لشکر میں آگئے کچھ دنوں بنارس میں رہے پھر وہاں سے حج بیت اللہ کو چلے گئے حج سے واپس آنے کے بعد کابل پہونچے اور زمان شاہ نبیرہ احمد شاہ ابدالی سے ملے اور اس کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے ترغیب و تحریص کی مگر بعض اسباب کی بنا پر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا پھر غلام محمد خاں نے نادوں (ریاست کشمیر) میں سکونت اختیار کر لی نادوں ہی میں ۲۹ جمادی الاخر ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۳ء کو نواب غلام محمد خاں کا انتقال ہوا۔ مرزا محمود عرف کرم خاں نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا ہے:۔

ز دنیا سوئے خلد رحلت نمود	چو نواب حاجیٔ بیت الحرام
سیاہش جنازہ گشت آرام گاہ	بسالش خرد گفت رضوان مقام

(اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۹۱ - ۶۹۰)

[4] اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۷۰

[5] اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۷۰

تحصیل علم کے زمانہ میں لوگوں سے تعارف ہو گیا تھا اسی سلسلے میں حافظ احمد کبیر[1] سے بھی شناسائی ہو گئی تھی اور اب تک یہ تعلق قائم ہے یہ بزرگوار شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی اولاد سے ہیں ہندوستان میں خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانِ جاناں، شاہ ولی اللہ کا خاندان اور رائے بریلی کے مشائخ سب کے سب اسی سلسلے کے مرید ہیں اور شیخ سے لیکر اب تک پشت بہ پشت ان کے جانشین، ارشاد و تلقین میں مشغول ہیں نوکر پیشہ نہیں مگر خاندان کی ایسی برگزیدہ ذات نے اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی روزی اپنے ہی قوتِ بازو سے حاصل کرنی چاہیئے "تاکہ" دل بیار و دست بکار" کا مصداق بن جائے چنانچہ اب عرب کی سیر و سفر کے بعد کلکتہ میں ایک مدرسہ[2] کی امینی فراہی چندہ پر زندگی بسر کر رہے ہیں جو کوئی ان کے گزشتہ حالات سے واقف نہیں اس جگہ کو جو درحقیقت معیوب ہے ان کی ترقی سمجھتا ہے محبت انکے ضمیر میں ہے لیکن ہم لوگوں کی لومڑیانہ چالیں دیکھ کر "با دوستاں تلطف با دشمنان مدارا" پر عمل کرتے ہیں اور ابنائے جنس کے شر سے اپنے آپ کو بچائے جاتے ہیں خداوند تعالیٰ کسی صورت سے ان کو وہاں سے نکالے۔

نواب فیض اللہ خاں کے دورِ حکومت پر تبصرہ

اب میں ابتدائے ہوش سے جو کچھ اس شہر (رامپور) میں دیکھا ہے بتائے دیتا ہوں۔ نواب فیض اللہ خاں کے عہد میں ملک آباد اور رعایا آسودہ حال تھی مگر نواب وزیر کے ملک سے ڈاکو آکر شبخون مار جاتے تھے بہت سی فوج نگرانی پر متعین تھی یہ اجازت ہرگز نہ تھی کہ فوجی دوڑ کے وقت بھی اپنی سرحد سے آگے قدم بڑھائیں شہر کی آبادی دن دونی تھی اب جس مقام پر زراعت ہوتی ہے ایک ایک بالشت پر خانہ جنگیاں ہو جاتی تھیں لوگ اتنے خود سر ہو گئے تھے کہ ہفتہ بھر نہیں گزرنے پاتا کہ آپس میں کشت و خون ہو جاتا رئیس نماز روزہ، اور تلاوت قرآن کا پابند ہنر اور علم کا خواہاں اسراف سے گریزاں۔ اس کے عہد میں شہر رنڈیوں اور شراب خانوں سے خالی[3] تھا نواب رعایا اور شہر کے بچہ بچہ کو پہچانتا تھا ہمیشہ صبح و شام سوار ہو کر مختلف راستوں سے گزرتا شب

---

[1] مولوی حافظ احمد کبیر ولد شاہ محمد بیر مجذوب نے اکثر علوم رامپور میں مفتی شرف الدین سے حاصل کئے حرمین شریفین اور ممالک شام میں علم حدیث کی تحصیل کی بڑے جید عالم تھے ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء میں رامپور میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۱۲)

[2] مدرسہ عالیہ کلکتہ

[3] حکیم نجم الغنی خاں رامپوری لکھتے ہیں کہ "دریائے کوسی جو شہر رامپور کے تلے جانب غرب بہتا تھا اس زمانہ میں نہایت جوش زن تھا اور اس کی دھار بندھوانے میں بڑا اہتمام تھا یہاں تک کہ نواب صاحب (نواب فیض اللہ خاں) بنفس نفیس گئے" (باقی صفحہ ۶۲ پر)

کو ملازمین کی زبانی شہر کے حالات سنتا۔ لیکن خانہ جنگیوں کی روک تھام کی طرف چنداں متوجہ نہ تھا کہ آمد و یہاں کوئی ظالم و مظلوم پیدا ہی نہ ہو۔ البتہ اگر کسی دیہاتی یا زراعت پیشہ پر ذرا بھی ظلم ہو جاتا تو ظالم اپنی کرتوت کو بھگتتا۔ جس دن سے نواب شجاع الدولہ نے امن چین کا عہد و پیمان پختہ کر لیا۱؎ ایسی سلامت روی سے بسر ہونے لگی کہ کبھی جنگ کی نوبت ہی نہ آئی نہ کسی کی منت سماجت کی ذلت اٹھانی پڑی ایک بار دار انگر میں خون چڑھے دو لشکروں میں کشت و خون ہو گیا تو روپیہ دے کر آصف الدولہ کو رضا مند کر لیا اور گنگا گھاٹ پر فوج کے چلے جانے کی معافی حاصل کر لی ؎۲ اس کے دونوں لڑکے ایک ولیعہد (نواب محمد علی خاں) دوسرا فتح علی خاں وقتاً فوقتاً آصفی لشکر میں جاتے اور بصد احترام کے ساتھ رخصت ہوتے جب نواب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱ سے آگے) اور شاہ جمال اللہ صاحب قدس سرہٗ اور بحر العلوم مولانا عبد العلی صاحب وغیرہ اچھے اچھے ارباب کمال ہمراہ تھے نواب صاحب نے حکم دیا جو کبھی فعلِ حرام کا مرتکب نہ ہوا ہو وہ پہلے دھار باندھنے میں دست انداز ہو یہ سن کر بہت سے آدمیوں نے ارادہ کیا نواب صاحب نے کہا کہ میرا مقصود یہ ہے کہ ارادہ بھی فعل بد کا نہ ہوا ہو یہ سنتے ہی سب کو سکوت رہا اور کوئی متصف اس صفت کے ساتھ نہ نکلا جب دیر ہوئی تو اس وقت آپ رونے اور سمت قبلہ ہاتھ اٹھا کر بحلف مذہب کہا کہ میرے دل میں کبھی خطرہ بھی کسی فعل زشت و حرام کا نہیں آیا، یہ کہکر نواب صاحب نے ہدایت کی صلوٰۃ تنجینا درود ماثورہ کے عامل تھے معقول میر قطبی میر تک عبور تھا منقول میں اچھی استعداد رکھتے تھے"

(اخبار الصنادید جلد اول ص ۹۰ - ۵۹۶)

۱؎ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد نواب فیض اللہ خاں کچھ دنوں لال ڈانگ میں مقیم رہے اور یہ معاہدہ رجب ۱۱۸۸ھ م ۱۷۷۴ء میں نواب فیض اللہ خاں اور نواب شجاع الدولہ کے درمیان ہوا۔

۲؎ جب کہ سکھوں کی شورش اور تاخت و تاراج کا اثر دریائے گنگا کے کنارے تک ظاہر ہونے لگا تو نواب آصف الدولہ نے کچھ سپاہ انگریزی اور اپنے فوجدار انگریز گنگا کے متصل متعین کر دی اور نواب فیض اللہ خاں کو لکھا کہ رام پور سے بھی کچھ فوج وہاں بھیجدی جائے تاکہ یہ دونوں فوجیں مل کر سکھوں کے ادھر آنے میں مزاحمت کریں ماہ رمضان ۱۲۰۹ھ م ۱۷۹۴ء میں نواب آصف الدولہ کی فوج اور انگریزی سپاہ کے ساتھ نواب فیض اللہ خاں کے آدمیوں کی لڑائی ہوئی انگریزی اور آصفی سپاہ کو ہزیمت ہوئی اور نواب فیض اللہ خاں کا رسالہ غالب ہوا آصف الدولہ کی نیت خراب تھی نواب فیض اللہ خاں نے پندرہ لاکھ اور بقولے تیئس لاکھ روپیہ دے کر معاملہ رفع دفع کر لیا۔

(اخبار الصنادید جلد اوّل ص ۵۸۳ و ۵۸۴)

کے ہمشیر زادے غلام قادر خاں نے بادشاہ (شاہ عالم) سے بے ادبی کی اور اس کے ساتھیوں نے شہر میں پناہ لینی چاہی تو اُن کو شہر میں نہیں گھسنے دیا اور اگر اتفاقاً کوئی انگریز شہر میں آجاتا بیحد احتیاط سے کام لیتا کہ اس کے ساتھیوں کو کوئی تکلیف نہ پہونچے ایک مرتبہ ایک معزز پٹھان نے ایک انگریز کے کہار پر کچھ زیادتی کی تھی اطلاع پاتے ہی اس کو شاہ جہاں پور اُسی انگریز کے پاس بھیجدیا اور سرداران فوج کی سفارش پر مرزا جواں بخت اور مرزا سلیمان شکوہ شاہزادگان کے آداب کا لحاظ رکھتا تھا نقد و جنس سے جو کچھ ہو سکتا مہیا کر دیتا تھا۔

نواب فیض اللہ خاں کی اولاد اس کے دونوں فرزندوں ایک ولی عہد (نواب محمد علی خاں) دوسرے غلام محمد خاں کا حال واقعی، بطور اختصار سُناتا ہوں

راست گویم کہ بود در دو امیر　　　فرق دارا شکوہ و عالمگیر
بس کہ تھا درمیان ہر دو امیر　　　فرق دارا شکوہ و عالمگیر

حسن علی خاں:۔

سب سے جُدا، کام کے آدمیوں کی رعایت اور ان سے بہت زیادہ رغبت رکھتے تھے خرچ آمدنی کے لحاظ سے کرتے تھے ان کا لڑکا نیاز علی خاں ان کے نقش قدم ہے۔

---

[1] معصوم بیگم نواب علی محمد خاں والی روہیل کھنڈ کی صاحبزادی، نواب ضابطہ خاں بن نواب نجیب الدولہ کو منسوب تھیں جن سے نواب غلام قادر خاں پیدا ہوا۔ نواب غلام قادر خاں اور شاہ عالم بادشاہ کے معاملات پر ملاحظہ ہو "غلام قادر روہیلا شہید" از سید الطاف علی بریلوی مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ اور نجیب التواریخ از مرزا نصیر الدین محمد (قلمی) ص ۶۵ — ۱۷۴ مملوکہ سید الطاف علی بریلوی)

[2] مولف کتاب مولوی عبد القادر، انگریزوں کے ملازم اور خیر خواہ تھے اس لئے اس قسم کے واقعات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔

[3] مرزا جواں بخت ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء میں لکھنؤ جاتے ہوئے رامپور میں ٹھیرے نواب فیض اللہ خاں نے ایک گرانقدر نذر پیش کی اور بڑی دھوم دھام سے مہمانی کی رسم ادا کی شہزادہ جواں بخت ایک ہفتے رامپور میں مقیم رہے مرزا سلیمان شکوہ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء میں لکھنؤ جاتے ہوئے مراد آباد پہنچے جب رامپور کی طرف روانہ ہوئے تو نواب فیض اللہ خاں نے شہر سے چار کوس کے فاصلہ پر استقبال کیا نذر گذرانی اور بڑے اعزاز کے ساتھ رامپور میں لاکر قلعہ میں اُتارا۔ نقد و جنس ہاتھی گھوڑے ہتھیار اور خیمے وغیرہ پیش کئے چار روز تک مرزا سلیمان شکوہ رامپور میں مقیم رہے۔

(اخبار الصنادید جلد اوّل ص ۵۹۲ و ۵۹۳)

فتح علی خاں :۔

صوم وصلوٰۃ کا پابند اور تفسیر وحدیث سُننے کا بیحد مشتاق ہے چشم مروت کی بنا پر انہیں آمدنی کے توخرچ ہیں کا۔ ان کا بڑا لڑکا عنایت اللہ خاں حدیث، تفسیر اور تاریخ سے واقفیت کی بنا پر اپنے خاندان بھر میں ممتاز، ذہین، حاضر جواب اور بڑی ہمت ومروت والا ہے ملک کی تحصیل وتشخیص میں فوج پر حاکم اور دلجوئی میں اس کی فکر رسا اور درست ہے اس کے باوجود رعب دار بھی ہے اس کا چھوٹا بھائی عباد اللہ خاں جنگی ہنر مثل سواری اسپ وتیر اندازی اور علم مجلسی مثل شعر وسخن اور فن موسیقی کو عمدہ جانتا ہے اور آزادانہ زندگی بسر کرتا ہے

نظام علی خاں :۔

اقربا پرور، مصاحب نواز، سادات پرور اور مرشد کا خادم تھا جعفر علی خاں اس کا لڑکا اب بھی اس کی یادگار ہے۔

یعقوب علی خاں :۔

بظاہر پرہیزگار تھا اپنی ساری عمر میں تین کام نمایاں کئے ہیں دو نیکی کے ایک بدی کا حفظ قرآن شریف اور حج بیت اللہ۔ اور ایک بے گناہ خاتون کا اپنے ہاتھ سے خون۔ نواب علی محمد خاں مرحوم کی اولاد میں کسی کے ہاتھ سے ایسی حرکت نہیں ہوئی۔

قاسم علی خاں :۔

فن طب میں کمال حاصل تھا لڑکے بہت سے چھوڑے ہیں نامہ نگار (مولوی عبدالقادر) کو ان ہر ایک کے کمالات پر چنداں واقفیت نہیں البتہ بڑے لڑکے غلام حیدر رتے علوم درسیہ حاصل کرلئے ہیں اور امداد علی خاں شعر وشاعری میں مشہور ہے۔

کریم اللہ خاں :۔

خوش تقریر، سخن فہم، ہنر دوست اور نواب فیض اللہ کے لڑکوں میں اب جو کچھ ہے وہی ہے جو کچھ چاہیئے سب رکھتا ہے۔

نواب غلام محمد خاں :۔

ان کی اولاد میں اوّل محمد سعید خاں[1] ہے۔ جو بیحد چست وچالاک ہے اور ہر اس ہنر کے حاصل کرنے میں

---

[1] نواب محمد سعید خاں ۱۹ مئی ۱۷۸۶ء روز جمعہ کو پیدا ہوئے نواب احمد علی خاں نے اولاد ذکور سے کوئی وارث ریاست نہ چھوڑا (باقی صفحہ ۶۵ پر)

جو امیروں کے لئے موزوں ہو کوئی عار نہیں کرتا ۔ اور دوسرا عبد العلی خاں ہے جو ہر کام بہت غور سے کرتا ہے صاحب تدبیر اور صاحب الرائے ہے تیسرا حفیظ اللہ خاں ہے اس کو جو کچھ بھی مل جائے اس پر قانع ہے علم و عمل کا شوق جو ذریعہ نجات ہے بے انتہا رکھتا ہے ۔ چوتھا عبد اللہ خاں ، طرز میانہ روی رکھتا ہے اور اپنی سلامت روی سے سب کے ساتھ میل سے رہتا ہے ۔ پانچواں عبد الرحمٰن خاں سپاہیانہ مزاج رکھتا ہے اور اپنے افسر کے سوا دوسرے کو کسی شمار میں نہیں لاتا ۔

نواب احمد علی خاں فرزند نواب محمد علی خاں :۔

جو اس خاندان کا چشم و چراغ ہے انصاف پسندی میں اپنے پرائے کو یکساں سمجھتا ہے ہر شخص سے ملاقات کے وقت اس کے مرتبہ کا لحاظ رکھنے میں کوئی فروگذاشت نہیں کرتا اور چشم مروت کی بنا پر بے جا سوال کا بھی دنداں شکن جواب نہیں دیتا مجرم سے معذرت کرنے پر بدلہ نہیں لیتا ۔ گزشتہ شکوہ کبھی زبان پر نہیں لاتا ۔ محمد یوسف خاں کے باپ (محمد عمر خاں) اس (نواب احمد علی خاں) کے باپ (نواب محمد علی خاں) کے اسباب قتل میں ایک ذریعہ تھے اس (محمد یوسف خاں) کے سامنے مددگاری کا دم بھرتا اور کبھی اس برے کام کا جو اس کے خاندان نے اس کے باپ کے ساتھ کیا تھا اس کا اشارہ و ایماء تک زیر لب نہ لایا ۔ ان تمام باتوں کے باوجود افسوس یہ ہے کہ عوام الناس کے معاملات کو دوسروں پر چھوڑ رکھا ہے چچا کے لڑکوں پر سے جو نصر اللہ خاں کے وقت میں اس کے غلبہ کی امید پر جی رہے تھے شفقت کا ہاتھ اٹھا لیا[2]

نواب نصر اللہ خاں :۔

ایک ہنرمند امیر ، آزمودہ کار ، گرم سرد کو دیکھے ہوئے تلخ و ترش کو چکھے ہوئے ، خوشنویس ، مصوّر ، نقاش ،

(بقیہ حاشیہ ۶۴ سے آگے) اس لئے احمد علی خاں کے انتقال کے بعد محمد سعید خاں مسند نشین ریاست رامپور ہوئے ۔ نثر فارسی میں مرزا قتیل سے مشورہ تھا طب حکیم مرزا علی لکھنوی سے حاصل کی درسیہ کتابیں قطبی میر تک پڑھی تھیں نواب محمد سعید خاں نے ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۵۵ء کو انتقال کیا ۔ (اخبار الصنادید جلد دوم ص ۲۱ و ۲۰)

[2] نواب احمد علی خاں ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے ۱۷۹۴ء میں ریاست رامپور کے حقدار قرار پائے اور بوجہ صغر سنی نواب نصر اللہ خاں نے نیابت کے فرائض انجام دیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نواب نصر اللہ خاں کے انتقال کے بعد ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۱ء میں مکمل اختیارات حکمرانی تفویض ہوئے ۔ ۲۵ جمادی الاول ۱۲۵۶ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۴۰ء کو فوت ہوئے (اخبار الصنادید جلد اول ص ۴۵)

شاعر، ادیب، طبیب اور میدانِ جنگ و جشن کے انداز سے واقف تھا جو چاہتا تھا کر گزرتا تھا جیسا کوئی ہوتا اس کو پہچان لیتا تھا مگر اپنے والی (نواب احمد علی خاں) کے حفظ مراتب اور اپنے سے اس کے عالی مرتبت ہوتے میں اُسے یہ انداز نہ تھا[1] اس کا لڑکا کفایت اللہ خاں باپ کے بعد ہی چل بسا[2] البتہ احمد اللہ خاں فصیح اللہ خاں اور کرامت اللہ خاں یادگار چھوڑے ہیں سخاوت ان لوگوں کا بڑا کارنامہ ہے ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء میں رئیسان شہر لکھنؤ کی رونق افروزی پر وہاں (رامپور) کے لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی[3]

---

[1] نواب نصر اللہ خاں ابن نواب عبد اللہ خاں ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں آنولہ میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت بہت اعلیٰ طریقہ پر ہوئی نہایت عقیل اور بہادر تھے اپنے والد نواب عبد اللہ خاں کے انتقال کے بعد رئیس اوجیانی رہے جنگ میرانپور کٹرہ میں نواب فیض اللہ خاں کے ساتھ آخر وقت تک داد شجاعت دی اسی طرح جنگ دوجوڑہ میں نواب غلام محمد خاں کے ساتھ دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کیا پندرہ برس پانچ مہینے اکیس دن نیابت کا کام انجام دے کر ۲۶ شوال ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء کو شنبہ کے دن انتقال کیا طبیعت موزوں پائی تھی سلطان تخلص تھا رامپور میں بازار نصر اللہ خاں ان کی یادگار ہے عنبر شاہ خاں عنبر نے تاریخ انتقال یوں نظم کی ہے۔

یک ہزار و دو صد و بست و پنج بود از ہجرت رسول گواہ
ماہ شوال بود بست و ششم کہ بہ جنت رسید نصر اللہ

(اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۰۹، ۷۰۰، انتخاب یادگار ص ۳۱۷، تذکرہ طبقات الشعراء ص ۴۶۸)

[2] کفایت اللہ خاں ۱۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے حسین، ذکی، ذہین، صاحب استعداد اور بہت فیاض تھے کفایت تخلص تھا اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۲۵ صفر ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۲ء کو انتقال کیا عنبر شاہ خاں عنبر نے یوں تاریخ انتقال نظم کی ہے۔

چو زیب صدر ریاست کفایت اللہ خاں وداع کرد جہاں دل بہوش فکرت رفت
بیک ہزار و دو صد سال ہجر بست و ہشت بہ بست و پنجم ماہ صفر بجنت رفت

(اخبار الصنادید جلد اول ص ۷۰۹، انتخاب یادگار ص ۳۱۷)

[3] ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء میں رئیسان شہر لکھنؤ سے رامپور میں کوئی شخص نہیں آیا غرہ جمادی الآخر ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء کو نواب سعادت علی خاں والی اودھ کا لڑکا مرزا محمد علی خاں اور اسٹور انگریز ایک جمعیت کے ساتھ رامپور پہنچے اور نواب فیض اللہ خاں کے بیٹوں اور بھتیجوں وغیرہ کو لکھنؤ لے گئے اسی زمانہ میں زمان شاہ بادشاہ کابل لاہور تک آ گیا تھا اسی لئے نواب سعادت علی خاں نے یہ کارروائی کی تھی (اخبار الصنادید ص ۷۰۱، ۷۰۰ و ۷۰۱ تاریخ اودھ جلد چہارم از حکیم نجم الغنی خاں رامپوری مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۱۹ء ص ۱۳ و ۱۲)

اس وقت شہر میں حسب ذیل علما موجود تھے۔

علمائے رامپور (افغانی)

ملا مغل محدث[1] :۔ بندہ نے ان بزرگوار کو نہیں دیکھا اب ان کے نواسے مولوی محمد سعید[2] ہیں جو حافظ بھی ہیں اور تمام فنون درسیہ سے مناسبت رکھتے ہیں فتحپور میں صدر امین کے قائم مقام ہیں طبیعت موزوں ہے نثر نویسی پر بھی قادر ہیں۔

ملا عبد الرزاق[3] :۔ فقیہ تھے میں نے ان کو شیخ فانی کی عمر میں دیکھا ان کا لڑکا محمد علی پرگنہ کی تحصیل و تشخیص میں مشہور ہے۔

مولوی عبد العزیز معقولی[4] :۔ میں نے ان کو اس وقت دیکھا جب مشغلۂ تعلیم کو ترک کر کے زہد کی جانب متوجہ تھے مگر ان کی گفتگو سے جودت ذہن کا اظہار ہوتا تھا۔

ملا جہانگیر[5] :۔ مولوی باب اللہ کے شاگرد ہیں ان کے علم و فضل کا سب کو اعتراف ہے مگر بندے نے ان بزرگوار کو نہیں دیکھا۔

ملا سراج الدین[6] :۔ ملا جہانگیر مرحوم مذکورہ بالا کے داماد بے حد خوش بیان تھے ان کے صاحبزادے ملا صدر الدین[7] ہیں جو ان کے حسن تقریر و ذکاوت آثار کی یادگار ہیں۔

---

[1] رامپور میں رہتے تھے دس برس عارضہ درد ریحی، سوداوی اور مراقی رہا سید محمد قاسم شاہ اور مولوی محمد بادشاہ کے ایما سے حکیم بایزید آخوند زادے نے علاج کیا اور اچھے ہو گئے ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء سے قبل انتقال ہوا (تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۹۷)

[2] اخون خیلوں کے محلہ (واقع رامپور) میں پیدا ہوئے اور رامپور ہی میں علوم منقول و معقول حاصل کئے عربی کے بڑے فاضل اور حافظ قرآن تھے کلکتہ جا کر انگریزی کی تحصیل کی مفتی شرف الدین رامپوری کے داماد تھے فتح پور ہسوہ میں بحالت ملازمت برٹش گورنمنٹ انتقال ہوا۔ مولوی رحمان علی مولف تذکرہ علمائے ہند کے بھائی مولوی امان علی ان کے شاگرد تھے۔

(تذکرہ کاملان رامپور ص ۲۵۵ و تذکرہ علمائے ہند (مولوی رحمٰن علی) مترجمہ و مرتبہ محمد ایوب قادری (کراچی ۱۹۶۱ء) ص ۱۲۱

[3] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۱۹

[4] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۲۷

[5] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۹۹

[6] تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۵۰

[7] تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۴۳

ملا عرفان:- ایک حاشیہ[۱] معروف ان کی یادگار ہے ان کے کلام سے مطالب علمیہ سوائے عالم متبحّر کے کوئی نہیں سمجھ سکتا ان کے جانشین مولوی خلیل الرحمٰن ہیں۔

مولوی خلیل الرحمٰن[۲]:- نواب امیر خاں کے لشکر میں اپنے والد کے نعم البدل ہیں فضائل موروثی کے علاوہ فنون ریاضی تاریخ، علوم ادبیہ، تحریر فارسی اور طب سے مناسبت رکھتے ہیں۔

مولوی غلام[۳] جیلانی:- فاضل، عارف اور نظم و نثر کے ماہر تھے خود بھی اُردو فارسی میں شعر کہتے تھے جنگ نامہ افاغنہ و انگریز جو ١٢١٠ھ/١٧٩٥ء میں تمام ہوا ان کی یادگار ہے ایک عربی غزل جسکو مفتی امیر اللہ

---

[۱] حاشیہ الہ عارعلی الدائر (تذکرہ کاملانِ رامپور ص ٢٥٣، ابجد العلوم از نواب صدیق حسن خاں مطبوعہ مطبع صدیقی بھوپال ١٢٩٦ھ/١٨٧٨ء ص ٩٢٨)

[۲] مولوی خلیل الرحمن نے کتبِ درسیہ مولوی غلام جیلانی رفعت سے پڑھیں۔ آخر عہد امیر الدولہ نواب امیر خاں میں ٹونک گئے نواب وزیر الدولہ کے زمانہ میں مولوی حیدر علی سے شکر رنجی ہونے کی وجہ سے ٹونک سے رامپور واپس آگئے اور پھر ریاست جاورہ میں ملازم ہوگئے اور وہیں انتقال ہوا ان کی ایک تصنیف فن منطق میں تحقیق جواب الاشکال المسمی بجذر الاصم ہے جو ١٢٦٨ھ/١٨٥١ء میں طبع ہوچکی ہے (تذکرہ کاملان رامپور ص ١٢٢-١٢٣)

[۳] بنگش پٹھان تھے۔ مولانا بحر العلوم لکھنوئی اور شاہ عبد العزیز دہلوئی کے تلامذہ سے تھے فارسی میں نہایت اعلیٰ لیاقت تھی۔ جنگ دو جوڑہ کے حالات "در منظوم" کے نام سے نظم کئے ہیں یہ کتاب ١٢١٠ھ/١٧٩٥ء میں مکمل ہوئی مولوی خلیل احمد شاہ جہانپوری سے بیعت تھے مولوی حیدر علی، مولوی خلیل الرحمن، مفتی شرف الدین، مولوی غیاث الدین جیسے نامور فضلا ان کے شاگرد تھے ١٢٣٤ھ/١٨١٨ء میں رامپور میں انتقال ہوا۔ رفعت تخلص ہے مجموعہ رفعت (فارسی دیوان) ہشت خلد فارسی (انتخاب کلام مختلف شعراء) اردو منظوم (جنگ نامہ دو جوڑہ) ان کی تصانیف ہیں۔

مولوی غلام جیلانی رفعت کا ایک عربی غیر منقولہ قصیدہ (مخطوطہ) ہمارے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

قطعہ تاریخ وفات

چو از دُنیا جناب پاک رفعت ۔۔۔ گزشت از غم دلم امروز غمگیں شد
نہ تنہا جانم از مرگش طپاں است ۔۔۔ کہ جانِ عالم از فوتش حزیں شد
زباں در سوگ او پیوست باہم ۔۔۔ جہاں در ماتمش با غم قریں شد
وجود پاک او از نیک ذاتے ۔۔۔ جناں را بسکہ ہر دم دل نشیں شد
از بہر حساب سال فوتش ۔۔۔ بگفتم "دل بخلد بریں شد"

١٢٣٤ھ/١٨١٨ء

(تذکرہ کاملانِ رامپور ص ٢٠٠ و ٢٨ و انتخاب یادگار ص ١٥٣، ١٥١)

نے اپنی طرف منسوب کرلیا ہے اور شیخ احمد یمنی[۱] نے بھی اسی کے نام سے لکھ دیا ہے ان کے زور طبع کی دلیل ہے مولوی حیدر علی[۲] ان کے داماد اور جانشین ہیں اور فن طبابت میں مہارت رکھتے ہیں۔

مولوی عبدالرحیم:۔ کتب درسیہ کے حافظ ہیں۔ فنونِ ریاضی سے ہمت[۳] ہار گئے۔

ملّا خواص[۴]:۔ بندے نے نہیں دیکھا لیکن ان کے صاحبزادے مولوی محمد علی[۵] کو مالیعلم الاجسام اور امورعامہ کے مسائل ازبر ہیں میر زاہد کا حاشیہ اور شرح مسلم بھی نوک زبان ہے۔

---

[۱] عربی زبان کا مشہور و معروف ادیب احمد شروانی یمنی مؤلف نفحۃ الیمن فیما یزول بذکرہ الشجن (ف ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۵)

[۲] مولوی غلام جیلانی رفعت اور مولوی عبدالرحمٰن دکنی سے تحصیل کی حدیث کی سند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے حاصل کی تمام علوم میں دستگاہ کامل رکھتے تھے علم طب میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ نواب صدیق حسن ابجدالعلوم میں لکھتے ہیں "کان فاضلا جلیلا جمیع علم الطب الی سائرعلومہ" رات دن درس و تدریس اور طبابت سے کام تھا نواب وزیرالدولہ نے ربیع الاول ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں ٹونک میں انھیں عہدہ دیوانی پر مامور فرمایا حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ تھے ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۰ اگست ۱۸۵۷ء کو ٹونک میں انتقال ہوا۔ ان کی تصانیف سے صیانۃ الاناس عن وسوسۃ الخناس (اردو) اور رسالہ رفع الیدین (فارسی) مشہور ہیں۔

(تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۱۱۱، ۱۱۸ تذکرہ علمائے ہند ص ۴۲، ۱۷۵ جماعت مجاہدین از مولوی غلام رسول مہر مطبوعہ علی پرنٹنگ لاہور ۱۹۵۵ء ص ۲۹۲ ابجدالعلوم صفحہ ۲۸، ۹۲۰ و ۹۱۷)

[۳] مؤلف تذکرہ کاملانِ رامپور اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ لکھتے ہیں "فنونِ ریاضی خوب جانتے ہیں نواب احمد علی خاں کے عہد میں کوئی انگریز چند مسائل ریاضی کے حل کرنے کے لئے یہاں آیا اور نواب صاحب سے کہا کہ کوئی ریاضی داں ہو تو اس سے حل کرا دیجئے چنانچہ انہوں نے وہ مسائل حل کر دیئے اور وہ ان کو اپنے ساتھ معقول تنخواہ پر باہر لے جانا چاہتا تھا مگر نہ گئے"۔ مولوی عبدالرحیم بن حاجی محمد سعید خاں سے رامپور کے اکابر علماء کو تلمذ تھا۔ مولوی عبداللہ بھوپالی، مولوی عبدالعلی خاں، حکیم محمد اعظم خاں، مفتی سعداللہ، مولوی عالم علی مراد آبادی مولوی فیض الحسن سہارن پوری مشہور ہیں۔ ریاست رامپور سے وظیفہ مقرر تھا مجمع الصنیع، شرح غایۃ البیان ان کی تصنیفات سے ہیں ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں انتقال ہوا۔

(تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۲۱۳)

[۴] تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۱۲۳

[۵] تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۳۶۲

حافظ عبدالرشید[1]: طبیعت دشوار پسند ہے۔ جملہ فنون کی چند بار تحقیق کر چکے ہیں مگر ان کے تسکی دل کو اطمینان نہیں حتی کہ علم ہندسہ میں ان کو شکوک ہیں اور لزومیات کو اتفاقیات ثابت کرنا ان کو آسان ہے

ملا عبدالرحمٰن[2]: ہر مجمع میں مباحثہ کرتے تھے نکتہ بعد الوقوع بہت فرماتے تھے مدراس میں مفتی بھی ہو گئے تھے۔

ملا غفران[3]: فقیہ بہت بحث کرنے والے اور مذہب حنفیہ کے اختلاف روایات سے خوب واقف تھے۔

قاری نسیم[4]: حافظ قرآن، ساتوں قرأت کی تحقیق، مخارج سے حروف کی ادائی، مدات، اوقاف اور رسم خط میں خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں بندہ نے ان سے پہلے، نہ ان کے بعد، ان جیسا کوئی دوسرا شخص اس فن کا ماہر دیکھا

ملا نسیم[5]: اپنے وقت میں طلباء سوات کا مرجع تھے طلب حق میں ذرا عار نہ تھی اخیر عمر میں مولوی کمال سے شمس بازغہ کی تحقیقات کی جس کو بارہا پڑھا چکے تھے۔

---

[1] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۲۱

[2] مولوی عبدالرحمٰن خاں بن مولوی حاجی عبداللہ خاں فاضل بے بدل اور اہل باطن سے تھے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ان کو "فضیلت پناہ اور فضیلت مآب" لکھتے تھے سنہ ۱۲۲۱ھ مطابق سنہ ۱۸۰۶ء میں انتقال ہوا۔
(تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۰۳)

[3] بڑے صاحب علم و فضل تھے ان کی صدارت میں علمائے شہر نے پیرزادہ اعظم الدین کے خاندانی نزاع کا فیصلہ ۲۴ ربیع الاول سنہ ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں کیا اس فیصلہ کی پیشانی پر نواب احمد علی خاں بہادر والی رامپور کا یہ حکم ہے "رکن شریعت ملا غفران صاحب را معلوم باد کہ آنچہ فیصلہ شما کردہ اند منظور شد" ان کے نامور فرزند ملا عمران تھے جن کی اردو میں ایک کتاب "رسالہ تجہیز و تکفین" مشہور ہے۔ "فتاویٰ فقہ" سو جزو میں لکھا جو کتب خانہ رامپور میں قلمی موجود ہے سنہ ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں انتقال ہوا
(تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۳۰۰، تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۵۵ نمبر ۲۵۶ - ابجد العلوم صفحہ ۹۲۰)

[4] ولایت سے آئے تھے قاری عبیداللہ کے شاگرد تھے علم قرأت و خوش الحانی میں دور دور مشہور تھے و دیگر علوم و فنون میں بھی ماہر تھے آپ کے داماد حافظ فخر اللہ ولد شیخ اسلم بھی مشہور قاری تھے جن کی تصنیف سے علم قرأت میں "رسالہ فخر المتعلمین" ہے۔ مولوی احمد علی عباسی چریا کوٹی (المتوفی سنہ ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء) نے علم تجوید قاری نسیم سے حاصل کیا۔ (تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۱۴ و ۲۱۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۶)

[5] تذکرہ کاملان رامپور ص ۲۱۱

مُلّا لطیف[۱]: کتب فقہ کو جس طرح اُستادوں سے حاصل کیا اپنے مملوکہ نسخوں کے حاشیہ پر لکھ لیا۔

مُلّا اسلم[۲]: فقہی نادرہ بہت جانتے تھے اور زیادہ تر امیروں کے مصاحب رہے۔

مُلّا بدرالدین[۳]: فقہ اور اصول میں کافی دخل تھا حسن تقریر کی بنا پر افغانوں میں امتیاز رکھتے تھے اکثر اُمراء کی مصاحبت اور وکالت کرتے تھے زمانہ ان کے موافق تھا ان کے بڑے صاحبزادے محمد انور خاں[۴] نے بزمانہ معتمد الدولہ لکھنؤ میں شہرت حاصل کر لی تھی۔

مُلّا نیک محمد[۵]: علم الفرائض میں مشہور تھے ہندوستانی ان کو افغان اور افاغنہ ہندوستانی سمجھتے تھے لیکن افغانی فضلا کے مشیر تھے۔

مُلّا زبیر[۶]: برسوں تک فتوے کا کام کیا درس بھی دیا۔ بے حد ذہین تھے فقہ میں پوری مہارت حاصل کر لی تھی۔ جب چاہتے مدعی دعویٰ کو اس کے بیان ہی سے شرعی احکام میں ناقابلِ قبول ثابت کر دیتے اور

۱؎ تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۳۴۰
۲؎ تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۳۷
۳؎ تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۷۹
۴؎ تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۶۸
۵؎ تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۴۳۸
۶؎ تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۱۴۷
۷؎ تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۱۵۴

۸؎ اصل نام شاہ عبدالکریم اور باپ کا نام رحمت اللہ ہے علم ظاہری میں دستگاہ کامل تھی تصوف و فقر میں شاہ منور علی الہ آبادی سے خلافت پائی، حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی زندگی تک پیلی بھیت میں قیام رہا ان کے تقدس اور بزرگی نے تمام روہیل کھنڈ کو مسخر کر لیا تھا حافظ الملک کی شہادت کے بعد رامپور چلے آئے اشاعت علم ظاہری و باطنی کے ساتھ تبلیغ اسلام بھی جاری تھی دسترخوان وسیع تھا ۲ شعبان ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۱ء کو وفات پائی اور رامپور میں حلقہ والی مسجد میں ملا فقیر کا مزار ہے (تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۳۲۲ و ۳۲۱)

مگر سید الطاف علی بریلوی صاحب لکھتے ہیں "آخون فقیر صاحب کا پورا نام آخون محمد زیارت خاں تھا ۱۲۰۶ھ میں بریلی میں انتقال ہوا اور محلہ جسولی میں دفن ہوئے ان کا مقبرہ ان کی مسجد میں جو آخون زادے کی مسجد کے نام سے مشہور ہے آج تک موجود ہے مشہور ہے کہ ان کو جنات نے دفن کیا تھا۔ ان کے دو لڑکے تھے ایک آخون زادے ارادت خاں جو لاولد فوت ہوئے دوسرے آخون زادے عباس علی خاں اعتقاد الدولہ صمصام جنگ بہادر جن کے ایک لڑکا اور چند لڑکیاں ہوئیں" (حیات حافظ رحمت خاں حاشیہ ص ۲۸۵)۔ سید الطاف علی بریلوی صاحب کو فقیر آخون صاحب کے حالات میں تسامح ہوا ہے

مدعا علیہ کی خلاصی کی صورت نکال دیتے۔

مولوی ہدایتؒ[1]:۔ انھوں نے تحصیل علوم کر کے شریعت پر استقامت اور کمالات نامزد حاصل کرنے پر کمر ہمت باندھ لی۔ اور ہندوستان کو چھوڑ کر مکہ معظمہ کی سکونت اختیار کرلی۔

مُلا فقیرؒ[2]:۔ بندہ نے ان کی زیارت نہیں کی لیکن بے غرض لوگوں کی زبانی سُنا ہے کہ ظاہری و باطنی محامد سے آراستہ اور پیراستہ تھے۔

مولوی عبداللہؒ[3]، خلف ملا کبیر:۔ طریق تصوف ان پر غالب تھا۔

مُلا محمدؒ[4]:۔ اپنی صغیر سنی میں میں نے ان کو دیکھا تھا ان کے دو خاص شاگردوں نے ان کا اچھا مطالعہ کیا ہے ایک حیدر علی خاں پسر انور خاں جو کٹھیر (روہیل کھنڈ) کے ناموروں میں سے تھے دل بیار و دست بکار" کا طریقہ اور تہذیب نفس حاصل کرنے کی بہت زیادہ کوشش تھی دوسرے جلال الدین جنہوں نے اپنی ہمت کو دوسروں کے وعظ و نصیحت پر محدود کر دیا تھا اور جو کچھ کرنا چاہتے پہلے اس بات کے درپے ہوتے کہ سب کا اس پر اتفاق ہو جائے اسی خواہش کی وجہ سے رنجشوں کی نوبت بھی آجاتی تھی بالآخر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی سنت ان پر غالب آگئی اور شہر سے باہر رہ کر نہایت عسرت سے زندگی بسر کر دی۔

علمائے رامپور (ہندوستانی)

مولوی عبدالعلی لکھنوی[5]:۔ جنہوں نے ارکاٹ میں وفات پائی

---

[1] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۴۴

[2] ملا محمد کی ایک کتاب علم فقہ میں کتب خانہ رامپور میں موجود ہے مولانا عالم علی مراد آبادی ان کے شاگرد تھے (تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۴۰۰)

[3] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۱۲۰　　[4] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۸۹

[5] ملا نظام الدین سہالوی کے فرزند تھے ۱۱۴۴ھ ۱۷۲۹ء میں پیدا ہوئے کتب درسیہ کی تحصیل اپنے والد سے کی اور والد کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد ملا کمال الدین سہالوی کی علمی صحبت میں رہے، اودھ کی حکومت کے تشدد کی وجہ سے لکھنؤ چھوڑنا پڑا ایک مدت تک شاہ جہانپور میں درس دیا حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد نواب فیض اللہ خاں کے حسب طلب رامپور پہونچے اس کے بعد منشی صدر الدین میر منشی گورنر جنرل کی درخواست پر مدرسہ بوہار میں صدر مدرس ہوئے وہاں بھی کچھ اختلاف رائے ہوگیا۔ نواب والا جاہ والی ارکاٹ کی (باقی صفحہ ۷۳ پر)

مولوی محمد حسن لکھنوی؎ :- بندہ ان دونوں بزرگوں کی زیارت سے محروم رہا ان دونوں کی شرح و حواشی ان کے تبحر کے شاہد عادل ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۲ سے آگے) درخواست پر ارکاٹ پہونچے نواب نے مولانا کا بڑا اعزاز فرمایا مدراس ہی میں ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کو انتقال ہوا مدراس کی جامع مسجد میں دفن ہوئے "فاضل قطب زمانہ" سے سال وفات نکلتی ہے۔

مولانا بحرالعلوم نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے بہت معتقد اور مسئلہ وحدت الوجود کے قائل تھے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔

(۱) تذکرہ علمائے فرنگی محل از مولوی عنایت اللہ (لکھنؤ ۱۹۳۰ء) ص ۱۴۰ و ۱۳۷ (۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۳۰۴ - ۳۰۶ (۳) ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں ۵۹، ابجد العلوم ص ۹۲۰ - (۴) حدائق حنفیہ از فقیر محمد جہلمی مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۰۶ء ص ۴۶۷ (۵) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد اول ص ۸۴۸ (۶) اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۰۰ - (۷) عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ از مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مرتبہ محمد ایوب قادری (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۵ء) ص ۳۲۳ و ۳۳۰ (آئندہ اس کا حوالہ "عہد بنگش" سے دیا جائے گا۔

(۸) حدیقۃ المرام از محمد مہدی واصف (مطبع مظہر العجائب۔ مدراس ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء) ص ۳۵ - (۹) آثار الاول من علمائے فرنگی محل از قیام الدین عبد الباری مطبوعہ مطبع مجتبائی لکھنؤ ص ۱۶، ۱۷،

۱.۵ ملا حسن کے نام سے مشہور تھے باپ کا نام قاضی غلام مصطفےٰ بن اسعد ہے اپنے ماموں ملا کمال الدین اور ملا نظام الدین سے تحصیل علم کی علوم معقول میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے حافظہ قوی تھا ایک مدت تک مدرسہ فرنگی محل میں درس دیا ملا بحر العلوم کی طرح اودھ کی حکومت کے تشدد کی وجہ سے اول شاہجہانپور پہنچے اور پھر نواب ضابطہ خاں کی درخواست پر نجیب آباد گئے نواب ضابطہ خاں نے اُن کے اُستاد ملا کمال الدین کی جگہ ان کو مدرسہ دارانگر میں مدرس مقرر کر دیا۔ مولوی برکت اللہ الہ آبادی بھی اس زمانے میں اسی مدرسہ میں تھے۔ مرہٹوں کی وجہ سے جب وہاں گڑبڑ ہوگئی تو نواب فیض اللہ خاں کی درخواست پر رامپور آ گئے رامپور میں ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں انتقال ہوا اگرچہ اکثر تصانیف ان سے یادگار ہیں مگر شرح سلم العلوم بہت مشہور رہے (ملاحظہ ہو)

(۱) تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۴۹ (۲) اخبار الصنادید جلد اول ص ۶۰۰

(۳) ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں ص ۳۳ (۴) تذکرہ علمائے ہند ص ۴۲۶

(۵) تراجم الفضلاء از مولانا فضل امام خیرآبادی مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی (شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۵۶ء) ص ،

(۶) تذکرہ طبقات الشعراء ص ۲۶

مدعا علیہ کی خلاصی کی صورت نکال دیتے۔

مولوی ہدایت[1]:۔ انہوں نے تحصیل علوم کر کے شریعت پر استقامت اور کمالات نامہ حاصل کرنے پر کمر ہمت باندھ لی۔ اور ہندوستان کو چھوڑ کر مکہ معظمہ کی سکونت اختیار کر لی۔

مُلا فقیر[2]:۔ بندہ نے ان کی زیارت نہیں کی لیکن بے غرض لوگوں کی زبانی سُنا ہے کہ ظاہری و باطنی محامد سے آراستہ اور پیراستہ تھے۔

مولوی عبداللہ[3]، خلف ملا کبیر:۔ طریق تصوف ان پر غالب تھا۔

مُلا محمد[4]:۔ اپنی صغر سنی میں میں نے ان کو دیکھا تھا ان کے دو خاص شاگردوں نے ان کا اچھا مطالعہ کیا ہے ایک حیدر علی خاں پسر انور خاں جو کٹھیر (روہیل کھنڈ) کے ناموروں میں سے تھے دل بیار و دست بکار کا طریقہ اور تہذیب نفس حاصل کرنے کی بہت زیادہ کوشش تھی دوسرے جلال الدین (جنہوں نے اپنی ہمت کو دوسروں کے وعظ و نصیحت پر محدود کر دیا تھا اور جو کچھ کرنا چاہتے پہلے اس بات کے درپے ہوتے کہ سب کا اس پر اتفاق ہو جائے اسی خواہش کی وجہ سے رنجشوں کی نوبت بھی آ جاتی تھی بالآخر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی سنت ان پر غالب آگئی اور شہر سے باہر رہ کر نہایت عسرت سے زندگی بسر کر دی۔

علمائے رامپور (ہندوستانی)

مولوی عبدالعلی لکھنوی[5]:۔ جنہوں نے ارکاٹ میں وفات پائی

---

[1] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۴۴

[2] ملا محمد کی ایک کتاب علم فقہ میں کتب خانہ رامپور میں موجود ہے مولانا عالم علی مرادآبادی ان کے شاگرد تھے (تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۴۰۰)

[3] تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۱۲۰ [4] تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۴۰۹

[5] ملا نظام الدین سہالوی کے فرزند تھے ۱۱۴۴ھ/۱۷۲۹ء میں پیدا ہوئے کتب درسیہ کی تحصیل اپنے والد سے کی اور والد کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد ملا کمال الدین سہالوی کی علمی صحبت میں رہے، اودھ کی حکومت کے تشدد کی وجہ سے لکھنؤ چھوڑنا پڑا ایک مدت تک شاہجہانپور میں درس دیا حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد نواب فیض اللہ خاں کے حسب طلب رامپور پہونچے اس کے بعد منشی صدرالدین میر منشی گورنر جنرل کی درخواست پر مدرسہ بوہار میں صدر مدرس ہوئے وہاں بھی کچھ اختلاف رائے ہوگیا۔ نواب والا جاہ والی ارکاٹ کی (باقی صفحہ ۷۴ پر)

مولوی محمد حسن لکھنوی ؒ[۵]:۔ بندہ ان دونوں بزرگوں کی زیارت سے محروم رہا ان دونوں کی شرح و حواشی ان کے تبحّر کے شاہد عادل ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۲ سے آگے) درخواست پر ارکاٹ پہونچے نواب نے مولانا کا بڑا اعزاز فرمایا مدراس ہی میں ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کو انتقال ہوا مدراس کی جامع مسجد میں دفن ہوئے "فاضل قطب زمانہ" سے سال وفات نکلتی ہے۔

مولانا بحر العلوم نے بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی کے بہت معتقد اور مسئلہ وحدت الوجود کے قائل تھے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔

(۱) تذکرہ علمائے فرنگی محل از مولوی عنایت اللہ (لکھنؤ ۱۹۳۰ء) ص ۱۴۱ و ۱۳۷، (۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۳۰۴ – ۳۰۶ (۳) ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں ۵۹، ابجد العلوم ص ۹۲۰ – (۴) حدائق حنفیہ از فقیر محمد جہلمی مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۰۶ء ص ۴۶۷ (۵) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد اول ص ۵۸۴ (۶) اخبار الصنادید جلد اول ص ۹۰۰۔ (۷) عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ از مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مرتبہ محمد ایوب قادری (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۶۵ء) ص ۳۲۳ و ۳۳۰ (آئندہ اس کا حوالہ "عہد بنگش" سے دیا جائے گا۔

(۸) حدیقۃ المرام از محمد مہدی واصف (مطبع مظہر العجائب۔ مدراس ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) ص ۳۵ – (۹) آثار الاول من علمائے فرنگی محل از قیام الدین عبد الباری مطبوعہ مطبع مجتبائی لکھنؤ ص ۱۶، ۱۷،

[۵] ملا حسن کے نام سے مشہور تھے باپ کا نام قاضی غلام مصطفےٰ بن اسعد ہے اپنے ماموں ملا کمال الدین اور ملا نظام الدین سے تحصیل علم کی علوم معقول میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے حافظہ قوی تھا ایک مدت تک مدرسہ فرنگی محل میں درس دیا ملا بحر العلوم کی طرح اودھ کی حکومت کے تشدد کی وجہ سے اول شاہ جہانپور پہنچے اور پھر نواب ضابطہ خاں کی درخواست پر نجیب آباد گئے نواب ضابطہ خاں نے اُن کے اُستاد مُلا کمال الدین کی جگہ ان کو مدرسہ دارانگر میں مدرس مقرر کر دیا۔ مولوی برکت اللہ الہ آبادی بھی اس زمانے میں اسی مدرسہ میں تھے۔ مرہٹوں کی وجہ سے جب وہاں گڑبڑ ہوگئی تو نواب فیض اللہ خاں کی درخواست پر رامپور آ گئے رامپور میں ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء میں انتقال ہوا اگرچہ اکثر تصانیف ان سے یادگار ہیں مگر شرح سلم العلوم بہت مشہور رہے (ملاحظہ ہو)

(۱) تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۴۶ (۲) اخبار الصنادید جلد اوّل ص ۹۰۰

(۳) ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں ص ۳۳ (۴) تذکرہ علمائے ہند ص ۴۲۶

(۵) تراجم الفضلاء از مولانا فضل امام خیر آبادی مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی (شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۵۶ء) ص ۰

(۶) تذکرہ طبقات الشعراء ص ۲۶

مولوی یوسفؒ[۱]: بندہ نے دیکھا تو نہیں مگر ان کے اوصاف سُنے ہیں۔

مولوی امام بخشؒ[۲]: معقولی کتابوں کی اچھی مہارت تھی مولانا رستم علی کی زبانی ان کی تعریف سُنی ہے۔

مولوی نور عالمؒ[۳]: بندہ نے بھی ان کی خدمت میں حاضر ہو کر میبذی کے چند جز کے استفادہ کی برکت حاصل کی ہے میبذی کا حاشیہ ان کے کمالِ علمی کی تشریح کر رہا ہے ان کے صاحبزادے مولوی محب اللہ مراد آباد میں ہیں اور وہاں ان ہی کا صدقۂ جاریہ ہے۔

مولوی رستم علیؒ[۴]: میرے اور میرے مخدوموں کے مخدوم تھے۔ مروّجہ کتب درسیہ حروف ابجد کی طرح نوک زبان تھیں ان کے صاحبزادے مولوی محبوبؒ[۵] علی ان کی فیض رسان مسند کے زیب و زینت ہیں۔

حافظ محمد زبیرؒ[۶]: اُستادوں سے جو کچھ حاصل کیا ہے بے کم و بیش شاگردوں کو عطا کر رہے ہیں۔

مولوی لطف اللہؒ[۷]: حافظ کلام اللہ۔ عید گاہ کے خطیب اور در حقیقت صلوٰۃ استسقاء میں امام العلماء تھے مجالس مناظرہ میں ماہرین کے ساتھ ہر فن میں گفتگو کر سکتے تھے ان کی یادگار حافظ عبد اللہ ہیں۔

۱؎ تذکرہ کاملان رامپور ص ۲۵۰ ۲؎ تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۴۵ ۳؎ تذکرہ کاملان رامپور ص ۲۳۶

۴؎ والد کا نام محمد اسمٰعیل ولد محمد اسحٰق ہے مولانا رستم علی کوڑا جہاں آباد میں پیدا ہوئے علوم و فنون ظاہری کے بعد علوم باطنی کا شوق ہوا۔ فرخ آباد اور رامپور میں جملہ علوم کی تحصیل سے بیس سال کی عمر میں فارغ ہوئے ان کے تلامذہ میں مفتی شرف الدین اور مولوی بزرگ علی جیسے نامور علماء تھے۔ مولانا رستم علی نے ایک رسالہ مولوی اسمٰعیل لندنی کے جواب میں تقاریر سبع لکھا ہے اس کے علاوہ میر زاہد اور صدرا پر حاشیے لکھے ہیں نہایت متقی اور پرہیزگار تھے ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء کو انتقال ہوا۔ مسجد عثمان والی (رامپور) میں دفن ہوئے (تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۴۱ و ۱۳۹) و سوانح عمری حضرت شاہ بلاقی مراد آبادی از احمد حسین مطبوعہ مطبع سعیدی رامپور ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۱ء ص ۳۴، ۳۶۔

۵؎ رامپور میں ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم کی تکمیل اپنے والد سے کی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے ان کے وعظ میں بڑا اثر تھا نواب احمد علی خاں کے عہد میں مفتی عدالت رہے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں مراد آباد میں انتقال ہوا مولوی شاہ علی ان کے فرزند تھے منتخب النفائس لغت اُردو مولوی محبوب علی کی یادگار ہے جو ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپ چکی ہے۔ (تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۳۴۳ - ۱۴۴)

۶؎ تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۱۴۷

۷؎ تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۳۴۰ - ۳۳۹

ملا کمال[1]:۔ ان کا نام ہی شرح مسمی ہے ان کے بیٹے مولوی جلال الدین[2] کی بے حد تعریف سنی ہے۔ ان کی ملاقات کا آرزو مند ہوں۔

مولوی شیر محمد[3]:۔ بندہ شرف دید سے محروم رہا مگر اکثر کتابوں پر ان کی تعلیقات نظر سے گزریں جو کچھ بھی ان کی زبان قلم سے نکلا ہے لوح دل پر نقش کرنے کے قابل ہے ان کے پوتے حافظ غلام حسین[4] بہت ہی زبردست فاضل ہیں۔

مولوی سلام اللہ[5]:۔ حضرت شیخ عبدالحق دہلوی جہانگیری کی اولاد سے ہیں جملہ علوم سے پوری مناسبت رکھتے ہیں مطالب کتب غیر درسیہ سے ان کو کتب درسیہ کے مطالب جیسی واقفیت تھی علوم منقول مثل حدیث، رجال، تاریخ، لغت اور ادب سب میں کامل تھے اور عربی زبان میں مطالب علمیہ

---

[1] حافظ شاہ جمال اللہ کے مرید تھے۔ ایک عرصہ تک دکن میں رہے (تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۳۸، ۳۳۷)

[2] بڑے صاحب علم وفضل تھے۔ عہد طفلی میں آنکھیں جاتی رہی تھیں ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء تک حیات تھے رامپور میں انتقال ہوا، مفتی اسد اللہ خاں جونپوری کے شاگرد تھے (تذکرہ کاملان رامپور ص ۹۰)

[3] اپنے زمانے کے نامور فاضل تھے مولوی عبدالرحمٰن موحد لکھنوی نے ان سے رامپور میں شرح چغمنی پڑھی تھی تذکرہ کاملان رام پور ص ۱۷۲، انوار الحق لمتنویر الجنان از مولوی نور اللہ بچھرایونی (مطبوعہ مطبع کالی پرشاد لکھنؤ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء) ص ۲۷

[4] مفتی غلام حسین ابن مولوی نصیر الدین ابن مولوی شیر محمد، رامپور میں پیدا ہوئے سیکڑوں طلبہ فیضیاب ہوئے رامپور میں مفتی عدالت رہے کئی کتابوں کے ترجمے فارسی زبان میں کئے نواب محمد سعید خاں کی فرمائش پر شروق فی حل الفروق، (فن طب) آیہ فما ستمتعتم بہ (تفسیر) مارب التحریر بر تحفۃ الامیر (فن ہیئت) اور رسالہ غریبہ (فن طب) کے عربی سے فارسی زبان میں تراجم کئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ رامپور میں موجود ہیں

[5] مولوی سلام اللہ ابن شیخ الاسلام اپنے زمانے کے مشہور فقیہ ومحدث ومفسر تھے تمام علوم کی تحصیل اپنے والد ماجد سے کی موطا کی شرح محلّی ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں لکھی نیز صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اصول حدیث پر عربی میں ایک رسالہ لکھا، کمالین بر جلالین کے نام سے تفسیر جلالین پر حاشیہ لکھا جو طبع ہو چکا ہے ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء تا ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں انتقال ہوا رامپور میں بغدادی صاحب کے مزار کے احاطے میں دفن ہوئے۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی از سید احمد قادری (مطبوعہ آزاد پریس پٹنہ ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء) ص ۲۳۱ - ۲۳۲، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۸ - ۲۱۹، تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۵۰، ۱۵۹، حدائق الحنفیہ ص ۴۶۸، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی از خلیق احمد نظامی (مطبوعہ خواجہ برقی پریس دہلی ۱۹۵۳ء) ص ۱۲۳ - ۱۲۵۔

کو لکھنے میں پوری دسترس رکھتے تھے۔ اب مولوی نورالاسلام[۵۱] ان کے جانشین بھی سلامت طبع، فکر کی رسائی اور اصابت رائے میں اس زمانہ کے مغتنمات میں سے ہیں۔

مولوی غلام طیب[۵۲]: میں نے دیکھا تو نہیں مگر ان کی ذہانت و ذکاوت بہت سُنی ہے ان کے لڑکے مولوی محمد حیات نے علوم رسمیہ تو حاصل کر لئے تھے مگر اب معلوم نہیں کہاں ہیں۔

مولوی محمد روشن[۵۳]: ان کے بزرگوں کا وطن علاقہ بھرت پور تھا پھر نارنول میں رہے، جواب نجابت خاں کے فرزند فیض محمد خاں کی مدد معاش کے لئے دیا گیا ہے مولوی محمد روشن علم حاصل کرنے کے لئے غوث گڑھ میں آئے۔ رامپور میں مولوی احمد خاں اور مولوی سلام اللہ سے چند کتابیں بطور تبرک پڑھیں ایسے ذہن و حافظ کا انسان میں نے ابھی تک نہیں دیکھا اکثر اشیاء کو بے اُستاد سے سیکھے، کماحقہٗ جانتے تھے ہر کسی کے ساتھ برادرانہ اور بے تکلفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

مولوی احمد خاں[۵۴] دریائے راوی کے کنارے کے قدیم باشندے تھے احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد لاہور سے

---

۵۱ مولوی نورالاسلام ابن مولوی سلام اللہ خانوادۂ حقی کے نامور عالم تھے مولف تذکرہ رامپور نے غلطی سے ان کو شاہ رفیع الدین دہلویؒ کا پوتا لکھدیا ہے (ص ۴۳۶) ریاضی میں خاص مہارت تھی معقول میں متعدد تصانیف ہیں ان کی وجہ سے رامپور میں فن ریاضی کی اشاعت ہوئی طب میں ان کو درجہ کمال حاصل تھا مولوی نورالاسلام کی یادگار دو رسالے رسالۂ اصطرلاب اور رسالہ فی تحقیق ھیتہ مکان (عربی) کتاب خانۂ رامپور میں موجود ہیں تذکرہ کاملان رامپور ص ۴۳۶-۴۳۷، تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۲۳۳-۲۳۶ ابجد العلوم ص ۹۲۷

۵۲ مؤلف تذکرہ کاملان رامپور تاریخ جام جہاں نما (از قدرت اللہ شوق ساکن قاضی موئی) کے حوالے سے لکھتے ہیں "(مولوی غلام طیب) متوطن بہار مولوی وہاج الدین گوپا موی کے شاگردوں میں سے تھے اور بعض کتب مطولات ملا کمال الدین سے بھی پڑھی تھیں جودت ذہن اور جدت طبع بدرجہ اتم تھی علوم متداولہ میں کامل مہارت تھی باوجود اشغال ظاہری کے اکثر اوقات ریاضت اور مجاہدۂ باطن میں بھی کوشش کرتے تھے خدمت فقراء خصوصاً شاہ قدرت اللہ صفی پوری کی خدمت میں حاضر ہو کر فائدہ حاصل کرتے تھے۔ فقر میں کامل تھے اکثر طلبا ان کی خدمت سے فیضیاب ہو کر فاضل ہو گئے ان اوراق کے مؤلف (مولوی قدرت اللہ شوق) نے بھی ان سے فیض پایا اور کتب مطولات ان کی خدمت میں پڑھیں" تذکرہ کاملان رامپور ۲۹۸-۲۹۹

۵۳ تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۵۵-۳۵۴

۵۴ ملا احمد ولایتی کے نام سے مشہور تھے مولوی برکت اللہ الہ آبادی کے شاگرد تھے علوم درسیہ میں خصوصاً فلسفے کے بڑے ماہر تھے (باقی صفحہ ۷۷ پر)

سے اس طرف آ گئے مولوی عالم اور مولوی برکت اللہ سے کتب درسیہ پڑھیں غوث گڑھ اور امپور میں ممتاز و با اعزاز رہے اُمراء و علماء کی محفلوں میں بالاتر بیٹھتے جو چاہتے فرماتے سب غور سے سُنتے تھے۔

مولوی ضیاء النبی[1]:- اُمورِ ریاست، عدالت، بخشی گری۔ سرکار لکھنؤ اور انگریز کے اُمور مہمّہ کی وکالت میں مشغولیت کے باوجود علم و عمل میں ذرا بھی فروگذاشت نہ کرتے تھے علوم ریاضی، ہندسہ، ہیئت، اصطرلاب مناظر اور جرِ ثقیل کا اس شہر میں رواج ان ہی کا طفیل ہے جس قدر ان کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا اسی قدر ان کی انکساری ترقی پاتی تھی ان کے بیٹے حبیب النبی[2] نے جو والد ماجد کے زمانہ میں کم عمر تھے مولانا شرف الدین اور مولوی نور الاسلام سے کتب درسیہ حاصل کیں، مولوی حبیب النبی خوب ذہن رسا رکھتے ہیں اگر امیر کی توجہ ان کے حال پر ہو جائے تو اُمید ہے کہ اپنے والد کی طرح نام آور ہو جائیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶ سے آگے) داماد تھے اور مولوی رستم علی ان کے شاگرد تھے (تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۰۰-۱۰۱ تذکرہ علمائے ہند ص ۹۲-۹۳

[1] باپ کا نام شاہ عنایت النبی ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں تھے ولادت سرہند میں سنہ ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء و سنہ ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء کے درمیان ہوئی سکھوں کے تیسرے حملے کے وقت وہ اپنے خسر محمد مرشد کے ہمراہ رامپور آئے اور نہایت زہد و ورع کی زندگی گزارنے لگے نواب نصر اللہ خاں کو ان سے خاص عقیدت تھی عہدہ بخشی گری نواب نصر اللہ خاں نے دیا سنہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں رامپور میں انتقال ہوا۔

تاریخ وفات از عنبر شاہ خاں عنبر

آں ضیاء النبی کا شف اسرار الہ	چوں ازیں دار فنا کرد بہ جنت رحلت
جُستم از ہاتف غیبی سن فوتش گفتہ	بدعا "صدر نشین باد بہ بزم جنت" سنہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء

(تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۷۶، ۱۷۷)

[2] رامپور میں سنہ ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء میں پیدا ہوئے مولوی جمال اور مفتی شرف الدین سے کتب درسیہ پڑھیں تفسیر و حدیث کی سند مولوی نور الاسلام سے لی، مدرسہ عالیہ کلکتہ سے بھی سند حاصل کی اور اسی مدرسے میں ملازم بھی رہے مولوی غلام جیلانی رفعت سے بھی استفادہ کیا رفعت تخلص تھا، قصیدہ طحاویہ کی بزبان اردو شرح لکھی ترپن سال کی عمر میں سنہ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں کلکتہ میں انتقال ہوا۔

(تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۰۱، انتخاب یادگار ص ۱۵۹، ۱۶۰)

مولوی نوازش علی[سلہ] :- علم فرائض میں شہرۂ آفاق تھے اس فن میں ایک رسالہ منظوم بزبان فارسی ان کی یادگار ہے

مولوی محمد مُرشد سرہندی[سلہ] :- دہلی میں پیدا ہوئے نجیب آباد کو وطن بنایا۔ رامپور میں دفن ہوئے بندے نے ان کو نہیں دیکھا مگر متواتر سُنا ہے کہ عقیدہ عارفانہ اور اعمال زاہدانہ تھے مخدومی سراج احمد[سلہ] ان کے نیک بخت صاحبزادے تھے ان کے اوقات شبانہ روز حدیث، عبادت اور امور ضروریہ میں بسر ہوتے تھے اکثر کتب حدیث مثل شرح الصدور، امام سیوطی کی بدور السافرہ، مُسلم شریف، ترمذی شریف اور ابن ماجہ وغیرہ کا ترجمہ لکھا بڑا لڑکا ابو محمد عرف غلام حسین ہے اور دوسرا لڑکا سراج الرحمٰن ہے جو غلام حسن کے نام سے مشہور ہے

مولانا شرف الدین[سلہ] :- بندے نے جو کچھ پڑھا ہے ان سے پڑھا ہے اگر میں ان کی قرار واقعی تعریف لکھوں تو مرتبہ

سه تذکرہ کاملان رامپور ص ۴۲۴

سله مؤلف تذکرہ کاملان رامپور سیر المرشدین کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ مولانا محمد مُرشد ابن محمد ارشد حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں تھے ۱۷ صفر ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء کو سرہند میں پیدا ہوئے علوم عقلیہ و نقلیہ میں فضیلت تامہ رکھتے تھے اعلیٰ درجہ کے مفسر و محدث تھے ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء میں رامپور آئے مولانا محمد مُرشد تقویٰ، طہارت اور اتباع سنت میں نہایت مستعد تھے صاحب درس تھے ۱۹ رجب ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء کو رامپور میں انتقال فرمایا۔

(تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۹۱ و ۳۸۹)

سلہ مولوی سراج احمد ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء میں سرہند میں پیدا ہوئے ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۲ء لکھنؤ میں انتقال ہوا رامپور میں دفن ہوئے (تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۴۸ و ۱۴۷)

سلہ پنجاب کے رہنے والے تھے رامپور میں آکر علم و فضل میں وہ شہرت حاصل کی کہ علمائے رامپور کا سلسلہ علم اکثر مفتی صاحب پر منتہی ہوتا ہے نواب احمد علی خاں کے عہد میں عہدہ قضا ان کے سپرد تھا نواب صاحب بہت عزت کرتے تھے موضع بگرہ کا اور پائندہ نگر واقع حضور تحصیل ان کو بطور معافی دئے تھے جب کلکتہ سے مفتی صاحب ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں رامپور آئے تھے تو فتح پور میں حکیم احسان علی برادر مولوی رحمان علی مؤلف تذکرہ علمائے ہند کے مکان پر ٹھیرے تھے مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ "میانہ قد، سیاہ رنگ، سفید ریش نحیف الجثہ اور ضعیف القویٰ تھے" مفتی شرف الدین کی ایک واقعے سے سخت تشہیر و تذلیل ہوئی وہ یہ کہ نواب احمد علی خاں والی رامپور نے بعض وجوہ کی بنا پر اپنے خلل دماغ اور بیماری کا بہانہ کر دیا۔ اہلکاران ریاست نے ان کی معزولی کے منصوبے تیار کئے مفتی شرف الدین اس سازش میں شریک تھے تمام حالات معلوم کر کے نواب صاحب نے اصلی حالت اختیار کر لی سازشیوں کو سخت ترین سزائیں دیں مفتی شرف الدین بھی معتوب ہوئے اور ان کے ہاتھ گدھے کی دُم سے بندھوا کے تمام شہر میں پھروایا ان کے آگے آگے (باقی صفحہ ۷۹ پر)

فنا فی الشیخ پر محمول ہوگا لیکن "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کا مصداق ہے اکثر علوم میں فہم عالی کی قوت
سے پوری قدرت رکھتے ہیں افتاد میں قاضی القضاۃ ابو یوسف کی یادگار ہیں اس وقت اس شہر
میں ہر فن کی کتابیں پڑھانا اور ہر بات کا جواب دینا ان ہی کا کام ہے طلبہ کی تعلیم وتربیت کیجانب
جب کبھی متوجہ ہوجاتے تو اپنی نظیر نہ رکھتے اس بات کا یہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جس کسی نے چند روز
ان کی خدمت میں علم کی چاشنی چکھ لی پھر جس آفت میں بھی مبتلا ہوا اس فن کے مشغلے کو کبھی ہاتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۸ سے آگے) لوگ شہنائی میں یہ شعر کہتے جاتے تھے۔

نکل کے وادی وحشت سے دیکھ اے مجنوں — کہ شور ودھوم سے آمہے ناقۂ لیلیٰ

مفتی صاحب کی خوب تشہیر کراکے حوالات میں رکھا حوالات سے ان کے چند شاگرد خفیہ نکال کرلے گئے پھر مفتی صاحب لکھنؤ اور کلکتہ چلے گئے بقول مؤلف اخبار الصنادید" نواب احمد علی خاں فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کانوں سے مفتی صاحب کی زبانی یہ لفظ سنے تھے "ہاں اب دیر کیا ہے" بعض صاحبوں کا بیان ہے کہ جب احمد علی خاں کی مصنوعی دیوانگی میں ان کے قید اور معزول کرنے کا مشورہ ہوا تو مفتی صاحب نے نواب صاحب کے قتل کرنے کے لئے ایما کیا تھا نواب صدیق حسن خاں نے ابجد العلوم میں مفتی شرف الدین کی دنیا طلبی کی شکایت کی ہے لیکن دراصل اس ریمارک میں نواب صاحب کا عدم تقلید کا جذبہ کارفرما ہے۔

"کان شرا فی الدین لاشرف الدین کما سماہ بذالک الوالد قدس
سرہ وکان ابعد خلق اللہ من السنۃ حفظ الحواشی والشروح
الکثیرات الکتب الدرسیۃ المتداولۃ منتصبا للبدعۃ
رادا علی اہل الحق بخرافاتہ محباً للدنیا عفی اللہ عنہ ماجناہ"

مفتی صاحب کے دو صاحبزادے مولوی ظہور الحق اور مظہر جمیل تھے مفتی صاحب کی تصنیفات سے بقول مؤلف تذکرہ علمائے ہند سراج المیزان (منطق) شرح مسلم (مالا یحد ولا یتصور) اور بعض فتاوی مشہور ہیں مفتی صاحب کا ایک رسالہ علم فرائض میں بزبان فارسی چوبیس صفحہ کا کتبخانہ رامپور میں موجود ہے یہ اس زمانہ کی تصنیف ہے جب مفتی صاحب معتوب تھے مفتی صاحب کی ایک دوسری تصنیف حل الاشکال (فارسی) کتب خانہ رامپور میں موجود ہے ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء میں انتقال ہوا۔

(۱) تذکرہ کاملان رامپور ص ۱۷۱ و ۱۷۰ (۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۸۵ و ۸۴

(۳) اخبار الصنادید جلد اول ص ۵۴۷ و ۵۴۸

سے نہ دیا چنانچہ مولوی عبداللہ[1] بریلی میں اپیلوں کے مشغلۂ وکالت کے باوجود جس قدر ممکن ہوتا کتب بینی میں مشغول رہتے ان کے چھوٹے بھائی مولوی نوراللہ[2] جو میرے ہم عمر ہیں عرصۂ دراز تک عدالتی کاموں میں رہے اور زود نولیس منشیوں میں ان کا شمار ہو گیا مگر اب مولوی عبدالرحمن عارف[3] کی خدمت میں سب کو چھوڑ چھاڑ حق گوئی پر کامیاب ہو گئے اور بذریعہ تقریر و تحریر علمی مناظرہ پر مستعد ہیں اُنھوں نے اپنے مرشد کے رسالے کلمۃ الحق کی شرح لکھی جس کا نام "نور مطلق" رکھا اور گانا سُننے کے جواز پر بھی ایک ضخیم کتاب لکھی ہے مولوی نعمت علی جو چھپرہ کی عدالت میں مولوی کے عہدے پر ہیں اسی زمرہ کے ہیں۔

شہر کے اکثر لوگ فن طب سے ناآشنا ہیں لیکن اس بارے میں اس شہر کے باشندوں میں ملا فقیر کا خاندان سب سے سبقت لے گیا ملا بایزید[4] نے عمل جراحی کو کہ عرصہ سے اطباء اس سے

---

[1] مولوی عبداللہ ولد محمد مقیم الدین قصبۂ بچھرایوں ضلع مرادآباد کے رہنے والے تھے۔

[2] مولوی نوراللہ ولد محمد مقیم الدین ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء میں بچھرایوں (ضلع مرادآباد) میں پیدا ہوئے تحصیل علم مرادآباد اور رامپور میں کی شاہ نورالہدیٰ منگلوری ولد مفتی محمد سلیم کے مرید ہوئے۔ قریب چھ سال لکھنؤ میں حکومت اودھ کے ملازم رہے ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۶ء میں لکھنؤ پہنچے صوفی عبدالرحمن لکھنوی سے ملے ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء میں وطن چلے گئے پانچ سال وہاں گزارے پھر واپس لکھنؤ آگئے اور ۹ ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء سے صوفی عبدالرحمن کی خدمت میں رہنے لگے اُنھوں نے صوفی عبدالرحمن کے حالات و ملفوظات میں "انوارالرحمن لتنویرالجنان" نام کی کتاب لکھی

(انوارالرحمن ص ۳۰۲)

[3] صوفی عبدالرحمن لکھنوی المتوفی ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء مفصل حالات صفحہ ۱۲۴ پر درج ہیں۔

[4] ملا بایزید ولد شاہ رحمت اللہ عربی کے عالم متبحر اور طب میں ارسطوئے وقت تھے ملا صاحب نے حکیم عزیزالدین میرٹھی حکیم قاضی ثناء اللہ بریلوی (شاگرد نواب علوی خاں) اور حکیم علی کبیر سنبھلی سے علم طب حاصل کیا نواب فیض اللہ خاں کے ہمراہ سرہند میں رہے کچھ دنوں حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی بھی رفاقت میں رہے آخر میں رامپور میں قیام کیا مگر علاج کے لئے الموڑہ اور بریلی میں بلائے جاتے تھے ان کے تصنیفات یہ ہیں (۱) فصول فیض اللہ خانی معروف بہ اقتباس العلاج۔ یہ کتاب فارسی زبان میں اپنے بیٹے میاں سعید احمد کے لئے ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء میں لکھی اور نواب فیض اللہ خاں کے نام پر معنون کی یہ کتاب کتب خانۂ رامپور میں موجود ہے فصول فیض اللہ خانی کے دیباچہ میں مصنف نے اپنی درج ذیل کتابوں کا اور ذکر کیا ہے (۱) جرائب النعمت در فن جراحت برائے تعلیم میاں نعمت اللہ برادر خورد مصنف سن تصنیف ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء (۲) فوائد النعمت در بیان علاج آتشک سن تصنیف ۱۱۷۵ھ / ۱۷۶۱ء

(باقی صفحہ ۸۱)

عاجز تھے اور سابلہ فریبی سے اس کام کو ذلیل بتاتے تھے باوجود طبیب ہونے کے از سرِ نو علم حاصل کیا ان کا بھائی نعمت اللہ[1] اس نواح میں اس کام میں یکتائے زمانہ مشہور ہے اب بھی اس گھرانے میں تیمارداری جاری ہے ملا مرحوم کے جانشین اس کے لڑکے ملا احمد[2] ہیں۔

حکیم غلام حسین[3] خاندانی طبیب تھے ایک عرصہ تک نواب کے نائب رہے ۹ ذی الحجہ کو کلکتہ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۰ سے آگے) (۳) رسالہ در معالجات حاملہ سن تصنیف ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء (۴) قرابادین نافع الامراض سن تصنیف ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء (۵) مقالات طب (خزانۃ العلاج) سن تصنیف ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء (۶) ریاض العمل ۱۲۵۲ھ (تذکرہ کاملان رامپور ص ۷۸، ۷۶)

[1] حکیم نعمت اللہ ولد شاہ رحمت اللہ حکیم بایزید کے چھوٹے بھائی تھے گجرات میں پیدا ہوئے نہایت ذہین و ذکی تھے حکیم بایزید نے ان کو فن جراحی سکھایا اور جرائب النعمت اور فوائد النعمت کتابیں ان کی تعلیم کے واسطے ۱۱۸۴ھ/۱۷۷۱ء میں لکھیں ۱۷ صفر ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء کو رامپور میں انتقال ہوا (تذکرہ کاملان رامپور ص ۲۱۷) [2] تذکرہ کاملان رامپور ص ۸۰۷)

[3] نواب احمد علی خاں کے زمانے میں نیابت پر سرفراز رہے۔ انکی سخت گیری و درشت خوئی سے ایک زمانہ نالاں رہا حکیم نجم الغنی خاں لکھتے ہیں "کہ حکیم غلام حسین خاں ولد غلام رسول خاں کشمیری کی فتنہ پردازی کی عباس علی خاں ابن زیارت خاں اپنے وقائع میں بڑی شکایت کرتا ہے اور نہایت فریبی و متفنّی بتاتا ہے۔ حکیم صاحب کو ریاست میں اتنا اقتدار حاصل تھا کہ ہر شخص کا عدم و وجود برابر جانتے تھے نواب صاحب کی طرف سے عباس علی خاں کی نسبت یہ تجویز کی کہ ہادی یار خاں کی جگہ ایجنٹ گورنر کول برک صاحب کے پاس فرخ آباد کو جائیں اور اس سے ایک راز کے مخفی رکھنے کی بابت سخت قسم لیکر اپنا ایسا منشاء ظاہر کیا کہ اس مضمون کے سننے سے عباس علی خاں کو بہت تردد ہوا و دین پشت کی نمک خواری نے ایسا جوش مارا کہ پسینے کے دریا میں غرق ہوگیا اور اسی تحیر کے عالم میں ان کے مدعا کی بجاآوری سے انکار کردیا اب حکیم صاحب افشائے راز کے خیال سے عباس علی خاں سے دشمنی رکھنے لگے اور ان کی طرف سے نواب احمد علی خاں کو برہم و مکدر کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عباس علی خاں نے دوری کو بہتر سمجھا اور ریاست رامپور سے قطع تعلق کرکے اپنے عیال و اطفال کو لیکر بریلی چلا گیا جہاں اس کے والد کے عہد سے حویلی و مکانات و بازار و باغات اور دیہات تھے" عباس علی خاں کا قول ہے کہ "میری طرح ایک مخلوق حکیم صاحب کی نیش زنی اور ایذا رسانی سے مصیبت میں ہے، عباس علی خاں کی یہ نظم حکیم غلام حسین خاں کے اخلاق کے بیان میں ہے۔

ظہور خلقت او بود زور و مکر و فریب	چو زہر افعی و عقرب خمیر طینت آں	ہر آنکہ دید رخش را بگفت از سر صدق	برحم مادر این است نطفۂ شیطاں
اگر بگفتۂ آں بدسیر عمل کردم	نمی شدم ہمہ آماج ناوک حرماں	فغان و نالہ و فریاد و حسرتا دردا	نمک حلالی من شد وبال گردن جاں

(باقی صفحہ ۸۲ پر)

پہونچکر ختم ہو گئے لیکن اس فن میں اپنا جانشین کوئی نہیں چھوڑا۔

رامپور کی عام معاشرتی حالت :۔

وہاں (رامپور) کے افغان تھوڑے سے سرمائے سے تجارت کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں اور باوجود ناواقفیت کے اگر کچھ زمین ہاتھ لگ جائے تو یکتائے زمانہ ہیں ایسے لوگوں میں سے اکثر خام تحصیل کے ذریعہ لاکھ روپے کے تعلقہ دار کا سا حوصلہ رکھتے ہیں چوری اور ڈاکہ زنی کا بندوست بھی خوب کرتے ہیں اودھا میواتی کو جو عہد آصفی سے آزول صاحب کے زمانہ تک مفسد مشہور تھا نعیم خاں اور تراب کے حملوں نے وہ ناک چنے چبوائے کہ وہ قدموں پر آپڑا۔ اگرچہ ان لوگوں میں خانہ جنگی بہت ہے لیکن لکھنؤ اور دہلی سے کم ہے سردار زادے اور صاحبِ اعتبار لوگ کبھی ایسا نہیں کرتے سوائے محمد عظیم خاں پسر بہادر خاں (جو نواب فیض اللہ خاں کا سالا ہے) اور اکبر شاہ پسر سید حسین شاہ کے کہ صغر سنی کے زمانہ سے یہ دونوں نامودانِ قوم آپس میں شہر میں لڑے ہوں گے اور وہ بھی زیادہ تر اپنی ہی قوم سے (لڑے ہوں گے) اور اپنی قوم کے سوا رئیس کی فرماں برداری تمام اقوام سے زیادہ کرتے ہیں البتہ اپنے قومی رئیس سے کہ اس کو اپنا ناز بردار سمجھتے ہیں بہت گستاخیاں کرتے ہیں مگر اس کے بدخواہ نہیں ہوتے جیسا کہ اکثر قوموں کی عادت ہے ان لوگوں کی بربادی ان سرداروں کی نااتفاقی سے رونما ہوئی جو ہنگامہ خیزی اور جنگ سے روگردانی میں خودمختار تھے نہ کہ عوام کے بلووں سے (ان لوگوں کی بربادی رونما ہوئی) البتہ پیش آئند امور کی تعلیم جلد قبول کر لیتے ہیں چند ماہ میں بہت کام کر لیتے ہیں مولوی کا بے حد پاس اور ادب رکھتے ہیں سادات کی سختیوں کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں اگر کسی کو درویش سمجھ لیں تو اس کے غلام ہو جاتے ہیں اعتقاد کے لئے اس فرقہ کا سا لباس یا ترکِ معیشت کافی ہے مولویت کی تصدیق بھی اتنے سے کر لیتے ہیں کہ کوئی کتاب بغل میں ہو اور چند مسائل زبان پر ہوں۔

مولوی ضیاء النبی کی صحبتِ علمی :۔

اب میں پھر اپنی سرگزشت کی طرف آتا ہوں ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء میں مولوی ضیاء النبی نے اپنے رسالہ کے سواروں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۱ سے آگے) نواب احمد علی خاں نے جب حکیم غلام حسین خاں کو کارنیابت سے علیحدہ کیا تو یہ زیارت حرمین شریفین کو چلے گئے اور راستے میں کلکتہ میں انتقال ہو گیا حکیم صاحب شعر بھی کہتے تھے آزاد تخلص تھا۔ اخبار الصنادید جلد اول ص ۲۴۰ و ۲۴۱)

انتخاب یادگار ص۱

اس کم سواد کا نام بھی لکھ لیا اور اپنی شفقت بزرگانہ کی بنا پر مجھ بے سواد دیہانہ دار کو آزمودہ کار جوانوں اور ہوشیار بوڑھوں کے مرتبے میں رکھ لیا اور بغیر ادائی خدمت حق الخدمت مجھکو مرحمت فرما دیتے اور ہمیشہ اپنے بچوں سے زیادہ میری تربیت فرماتے تھے اگرچہ اس رتبے کے سب حضرات میرے متعلق استحقاق سے زیادہ رعاتییں کرتے ہیں مگر بقول "الفضل للمتقدم" ان کا احسان اپنے اوپر زیادہ سمجھتا ہوں ان کی مجلسوں میں اکثر کتب حدیث، تفسیر اور فقہ کی تصحیح اور مقابلہ ہوتا تھا کبھی مناظر اصطرلاب اور ہندسہ کا تذکرہ آجاتا تھا اور کبھی علم ہیئت سے بحث ہونے لگتی تھی ان فنون سے بھی میں نے واقفیت حاصل کرلی لیکن ان علوم میں میرا کوئی استاد نہیں البتہ بزرگوں کے فیض صحبت کا انکار نہیں کرتا۔

ایک دن سوال ہوا کہ دو خط مستقیم سطح کا پورا احاطہ کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا کہ خط مستقیم دو نقطوں سے ملنے والے خطوں میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے اور ان دونوں میں سے ایک بھی بڑا نہیں ہوتا اور نہ ایکدوسرے سے چھوٹا ہوتا اور دو خطوں سے سطح کا پورا احاطہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ معیّنہ دو نقطوں کو دو خطوں سے ملایا جائے۔ ایک دن اسی بات کا تذکرہ تھا کہ اصطرلاب کے شمالی صفحہ پر تین دائرے ہوتے ہیں مدار راس الجدی سب سے بڑا مدار راس الحمل، اس سے چھوٹا اور مدار راس السرطان اس سے بھی چھوٹا ہوتا ہے اگر اپس میں مدار راس الجدی اور مدار راس السرطان دونوں ایک دوسرے کے برابر ہیں اور مدار راس الحمل جو کرہ کا منطقہ ہے دونوں سے بڑا ہے کیا سبب ہے؟ میں نے کہا کرہ کی تسطیح دو قطبوں میں سے ایک پر کی جاتی ہے دوسرا قطب صفحہ کا مرکز ہو جاتا ہے اور کرہ کا محور صفحے کے قطر پر منطبق ہو جاتا ہے اور جو دائرہ قطب سے قریب ہے اس کا قطر چھوٹے سے ٹکڑے پر محور سے منطبق ہوتا ہے اور جو دائرہ بعید ہے محور کا بڑا ٹکڑا اس کے قطر پر قبضہ کرلیتا ہے لہٰذا مدار راس سرطان جو قطب سے بحد قریب ہے اس کا قطر بہت چھوٹا ہوگا اور سب سے زیادہ دور مدار راس جدی ہے اس کا قطر بہت بڑا ہونا چاہیئے اور حمل کا مدار راس درمیانی قطر کے اعتبار سے متوسط رہے گا۔

صاحبزادہ عنایت اللہ خاں کے رسالہ میں ملازمت:- کچھ عرصے کے بعد والد صاحب کی ملازمت کا سلسلہ نظام علی خاں کی سرکار سے منقطع ہو گیا چند روز قاسم علی خاں کے ساتھ گزارے اس کے بعد فتح علی خاں کے ساتھ، پھر نواب نصر اللہ خاں کے ساتھ رہے۔ نواب نصر اللہ خاں کی ملازمت کے وقت والد صاحب نے فرمایا کہ میرا اور تمہارا ایکجا رہنا مناسب نہیں ایسا نہ ہو کہ ایک کے کام کی

خرابی دوسرے کی خرابی کا سبب بن جائے مرّبی (مولوی ضیاء النبی) کے مشورے سے عنایت اللہ خاں کے رسالے میں میں نے اپنا نام لکھا لیا۔ وہاں تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگیا اس کے علاوہ جبۂ اول، گرما ول اور شادی غمی میں اعانت کی مراعات تھیں کھانا دسترخوان پر ساتھ ہوتا تھا اور مشغلہ کبھی شعر وشاعری کبھی تاریخ کبھی حدیث کبھی پر گنے کی تحصیل وتشخیص کے متعلق مشورہ تھا......... جس وقت بخشی گری کفایت[1] اللہ خاں سے متعلق ہوئی اور نواب فیض اللہ خاں کے پیشکار (حکیم) غلام حسین[2] نائب ہوگئے تو موجودات (حاضری) دکھانے کے لئے جانا ضروری ہوگیا پہلی مرتبہ مجھے کفایت اللہ خاں کے پاس جانے کا اتفاق ہوا از راہِ مروت میرے سلام کرتے ہی منظوری لکھ کر رخصت کر دیا۔ دوبارہ غلام حسین خاں حاضری لے رہے تھے مجھے ان کے سامنے جانا ناگوار معلوم ہوا کیونکہ مولوی ضیاء النبی کی بخشی گیری کے زمانے میں باوجود قلتِ تنخواہ کے اِس درجہ امتیاز رکھا تھا کہ دفتر میں صرف میرا نام درج تھا اب عام لوگوں کی طرح اپنا حلیہ باپ دادا کا نام لکھوانے کے لئے شکم بندگی کے خیال سے میں نہ گیا اور چوبدار کو یہ جواب دے دیا کہ سال بھر میں تین چار مہینے کی تنخواہ ہاتھ لگتی ہے مجھے نوکری منظور نہیں۔ پھر وہاں سے مستعفی ہونے کے لئے طلبی ہوئی میں نے لکھ بھیجا اور زبانی بھی کہدیا کہ اگر تنخواہ بھی ضبط ہوجائے تب بھی نہیں جاؤں گا کچھ دنوں تک عنایت اللہ خاں نے چھوڑا بھی نہیں کہ مبادا مرادآباد چلا جاؤں کیونکہ کفایت اللہ خاں نے اپنی سیر چشمی کی بنا پر استعفیٰ منظور نہ فرمایا اور فرمایا کہ اس کی خدمت شروع ہی سے معاف ہے اور اس کا آنا نہ آنا ضروری نہیں۔ لیکن مجھے یہ خیال آیا کہ مرادآباد چلا جانا چاہئے اور والد صاحب سے ظاہر کر دیا کہ میں اپنے خسر کی ملاقات کے بہانے سے وہاں جاتا ہوں اگر کوئی صورت میسر آگئی تو بہتر ورنہ پھر جو مصلحت وقت ہوگی اس پر کاربند ہوجاؤں گا انھوں نے اجازت دے دی۔

مولوی عبدالقادر کا مرادآباد پہونچنا مرادآباد پہونچکر میں نے دیکھا کہ تال صاحب کے عملے کی خوشامد کے بغیر لسٹر صاحب جج اور لانڈ صاحب کلکٹر اور کارٹن صاحب رجسٹرار تک پہونچنا دشوار ہے عہدہ حاصل ہونا تو درکنار بات ہے۔ اور اپنے آقا کے سوا دوسرے کا احسان مند ہونا اس حقیر کے خمیر میں نہیں ہے۔

---

[1] کفایت اللہ خاں پسر نواب نصر اللہ خاں المتوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء

[2] حکیم غلام حسین خاں پسر غلام رسول خاں کشمیری نائب نواب احمد علی خاں بہادر

چند روز شاہی مسجد[1] (مراد آباد) میں جاتا رہا کیونکہ وہاں ہر قسم کے لوگوں کا مجمع تھا جو لوگ کتاب لے آتے پڑھا دیتا تھا کبھی کبھی مولوی منیر علی[2] کے گھر جن سے پرانی شناسائی تھی اور قاضی شہر (محمد بخش) جن سے مادرانہ رشتہ داری ہے چلا جاتا تھا مولوی صاحب موصوف اس وقت وکیل سرکار تھے اور قاضی صاحب کمشنری[3] کا کام بھی کرتے تھے ان دونوں کی ملاقات کے سبب بہت سے لوگوں سے واقفیت ہو گئی اور مولوی محب اللہ کے پاس بھی جو میرے مخدوم زادے ہیں آمد و رفت جاری رہی ان کے ذریعے سے بھی لوگ مجھے پہچان گئے۔ لالہ منسا رام نے جو سررشتہ کا وکیل عظیم آباد (بدایونی محلہ) کا باشندہ اور مہاراجہ شتاب رائے کے عزیزوں میں سے ہے ایک مکان اپنے مکان کے پہلو میں ..... میرے لئے کرایہ پر لے لیا اور مجھ کو وہاں لے گیا اور ضروریات میں بھی مدد کی مولوی منیر صاحب کا طرز مطلب نویسی میں دیکھ چکا تھا کہ اصحاب معاملہ کو بہت پسند ہے اور واقعی خوب ہے میں اسی کی پیروی کرنے لگا اکثر لوگ عرضی اور جواب دعویٰ کا مسودہ مجھ سے لکھواتے تھے بلکہ وکلا بھی میری اصلاح کو مان لیتے تھے اور "حساب دوستاں در دل" کے طریقے پر میری مراعات بھی پیش نظر رکھتے تھے۔

ایک دن نواب فتح اللہ خاں ولد دوندے خاں کے صاحبزادے نثار اللہ خاں، قاضی محمد بخش اور قاسم علی خاں بسرسی محمود پور کے رئیس کو اپنے ہمراہ لیکر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کے لئے گئے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ صاحب ممدوح میرے لباس کو دیکھکر اور نو وارد ہندوستانی خیال کر کے میرے حال کی طرف متوجہ ہوئے چونکہ دوسرے بزرگوار صاحب ممدوح سے کسی کام کا واسطہ نہ رکھتے تھے اس لئے دوبارہ نہ گئے البتہ میں بے سر و سامان ایک مرتبہ پھر گیا۔ صاحب

---

[1] مراد آباد کی سب سے قدیم مسجد ہے جو درمیان شہر میں واقع ہے اس مسجد میں درس و تدریس کا انتظام آج تک موجود ہے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مراد آباد کی اسی شاہی مسجد میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے دست مبارک سے ایک اسلامی مدرسہ کا آغاز ہوا جو ابھی تک جاری ہے۔

[2] مولوی منیر علی ابن مولوی رستم علی رامپور میں پیدا ہوئے وہیں علوم متداولہ حاصل کئے ان کی شادی مراد آباد میں محمد علی شاہ سجادہ نشین شاہ بلاقی کی صاحبزادی دولت النساء کے ساتھ ہوئی تھی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں باشندگان مراد آباد اور اہل رامپور کے درمیان جو جھگڑا "واقعہ گدر خانی" کے نام سے مشہور ہے اس میں مصالحت مولوی منیر علی ہی نے کرائی تھی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں فوت ہوئے بڑے عابد، زاہد اور شرع کے پابند تھے تاریخ وصال یہ ہے:۔ شد فوت آں سراج منیر و فروغ دیں ❊ سالش نثار گفت کہ مخدوم متقیں

تذکرہ کاملان رامپور ص ۴۰۰، ۴۰۲ و (سوانح حضرت شاہ بلاقی مراد آبادی ص ۳۴، ۳۵)

[3] کمشنر بندوبست کا دفتر مراد آباد ہے۔

کے کہار نے جاکر اطلاع دی کہ ایک مولوی صاحب ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ صاحب نے بُلا لیا اور مہربانی سے پیش آیا چونکہ میں نے کسی بات کی ان کو تکلیف نہیں دی فرمایا کہ جب چاہو آجایا کرو چنانچہ ہفتہ عشرہ بعد میں جاتا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آتا۔ کبھی کبھی صاحب کو فارسی لکھوانے کی ضرورت پڑتی تو فرمادیتے میں اس کو پورا کردیتا۔ میری غربت اور بے زبانی پر صاحب کی نظر التفات روز مرہ بڑھتی گئی اور وہاں (مرادآباد) کے صاحبوں کے سامنے میرا تذکرہ بہت عمدگی کے ساتھ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ میں مولوی مشہور ہوگیا یہ وہی خطاب ہے جو کہار کا عنایت کردہ ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کی اشاعت کردی اب میں اس بے موقع لفظ سے تنگ ہوں مگر دُنیا کی زبان بند نہیں کرسکتا۔ اسی اثناء میں قاضی صاحب نے فرمایا کہ صاحب جج کو فتاویٰ عالمگیری کے کتاب النکاح کے ترجمہ کا شوق ہے اگر نمونہ کے طور پر ایک جُز لکھدو تو میں صاحب کو دکھاؤں میں نے تعمیل کردی نہیں معلوم قاضی صاحب نے وہاں تک پہنچایا یا نہیں اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مسٹر صاحب سے میرے بارے میں کچھ کہدیا۔

مرادآباد کے جج سے ملاقات:۔ حسب معمول جب میں گیا تو (قاضی صاحب نے) فرمایا کہ میں کئی روز سے تیرے انتظار میں ہوں اگر آجاتا تو یہیں جج سے تیری ملاقات ہوجاتی اب سنیچر کو جو عام باریابی کا دن ہے اگر تو جائے اور اطلاع کرے تو ضرور بُلالیں گے میں گیا، اطلاع کی بُلایا، بٹھایا پوچھ گچھ ہوئی اسی جلسہ میں مرزا جیون کوتوال کی ایک عرضی صاحب ممدوح کے احاطہ مکان کی پیمائش کے متعلق پیش ہوئی اس میں ایک لفظ ان کے پڑھنے میں نہ آیا قاضی (محمد بخش) کو دیا قاضی صاحب نے لفظ "بجدو" کو جو ہندی لفظ ہے "بجدو" پڑھا صاحب نے کہا کہ حساب میں لفظ "بجدو" کچھ معنی نہیں رکھتا اور بعد واؤ کے دال بھی نہیں ہے بندہ نے عرض کی کہ غالباً "بجدو" ہوگا فرمایا اس کے کیا معنی ہیں؟ میں نے کہا ہندی، مساحت میں جب کسی گول جگہ کی پیمائش کرتے ہیں تو جریب ڈال کر سب کے پانچ حصے کرلیتے ہیں ان میں دو حصوں کو تین حصوں پر ضرب دیتے ہیں اور حاصل ضرب کو گول سطح کی پیمائش سمجھتے ہیں فرمایا خلاصۃ الحساب میں مدور کی پیمائش کا کیا طریقہ لکھا ہے میں نے کہا نصف قطر کو نصف محیط سے ضرب کرو! فرمایا مگر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں میں نے کہا چونکہ دائرہ کی آراضی حقیقی نہیں ہوتی عمل بھی اس میں تخمینی ہی ہوتا ہے رخصت کے وقت فرمایا کہ شنبے کے دن جس وقت چاہو آجانا اور اگر ہمارے قبضے کا کوئی کام اپنے مناسب سمجھو تو اس کی درخواست بھی اسی روز یہیں دے دینا۔ میں جاتا تو تھا لیکن کوئی کام اپنے مناسب نہ دیکھا جو عرض کرتا کیونکہ میں اس خیال پر جما ہوا تھا کہ اگر اپنی رائے سے کوئی کام تجویز فرمادیں گے تو اپنی صوابدید کے لحاظ سے اس کی خرابی کی جانب سے چشم پوشی فرمائیں گے اور اگر کسی کام کا خود مدعی بنا جانے تو دیکھئے امتحان میں کامیابی کیونکر ہو۔

مزن ہیچ گہ لاف انجام کار — چہ دانی چہ پیش آیدت روزگار
چہ خوش گفت دانشور تیز ویر — کہ نامد چو رو بعد دہقاں پیر
کساں را فشندناوک اندر حریر — کہ گفتے بدوزند سنداں بتیر

اسی ڈھنگ پر میں نے کئی برس گزار دیئے
صاحبزادہ عنایت اللہ خاں کے مقدمے کی پیروی کرنا۔ اتفاقاً کمشنری بورڈ کے حسب ذیل صاحبان تشریف لے آئے سروفر کولبرک صاحب دوسرے ڈین صاحب اور فارتسکو صاحب اور . . . . صاحب اور . . . . صاحب۔ پہلے صاحب قائم مقام ایجنٹ بھی تھے عنایت اللہ خاں نے املاک متفرقہ واقع پرگنہ سرکدہ جس کے متعلق صاحب کلکٹر نے قرقی کا حکم دے دیا تھا گفت و شنید کرنے کے لئے مجھے لشکر کے ساتھ کر دیا۔ لبیک کہتا ہوا میں بھی چل دیا۔ لشکر جہاں بھی جاتا باوجودیکہ صاحبوں کی توجہ رعایا کی آسائش پر انتہائی تھی علاوہ بے قیمت گھاس اور سوختہ کے جو کہ ظلم عام ہے کبھی کبھی پرچون کی چیزیں بھی لشکری لے آتے تھے اور جو کھیتی سر راہ یا خیمہ گاہ کے قریب ہوتی کوچ کے وقت ایسی نظر آتی گویا ٹڈیوں نے کھالی ہے بڑے صاحب کے منشی کا نام ولی داد خاں تھا جو اپنے آپ کو مالوہ کا باشندہ بتاتا تھا دوسرے صاحب کا رفیق بینی رام اور صاحب کا منشی مشرف علی خاں پسر عطا حسین خاں، اٹاوہ کا باشندہ تھا قصہ چہار درویش اسی زمانے کی عطا حسین خاں کی تصنیف ہے مگر ولی داد خاں کے خیمے پر لوگوں کا بہت ہجوم رہتا تھا اور سب سے زیادہ داؤد خاں کے پاس جو خود کو بڑے صاحب کی بیوی کا بھائی[1] ظاہر کرتا تھا ان لوگوں سے ذرہ برابر بھی کوئی کام نہیں نکلتا تھا کیونکہ ہر شخص بڑے صاحب کے پاس پہونچکر اپنا حال کہہ سکتا تھا اگر کوئی شخص اپنے ساتھ کرسی لے جاتا تو بیٹھتا ورنہ کھڑا رہتا بیٹھو یا جاؤ کسی کو کچھ نہیں کہتے تھے اور صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ درخواست دیکھتے اور زبانی عرض بھی سنتے لیکن جواب یہی ہوتا تھا کہ تھوڑا صبر کرو وقت پر مناسب حکم صدور میں آئے گا جوانی کے غرور یا اپنی جہل و نادانی کے سبب عملے کے سامنے التجا کی ذلت سے محفوظ رہا۔ ایک روز عنایت اللہ خاں کا خط دے کر درخواست پیش کر دی ارشاد ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد کلکٹر سے کیفیت طلب کی جائے گی میں پھر گیا کچھ دیر بیٹھا اور واپس آ گیا اس کے بعد پھر باریاب ہوا میں نے دیکھا اور خیال کیا کہ صاحب کو دن بھر سوائے لکھنے کے اور کوئی کام نہیں، آنے جانے

---

[1] بیوی کا بھائی یعنی سالا بطور تعریض کہا ہے۔

والوں کی کوئی پُرسش نہیں، میں نے عرض کی کیا ابھی تک کوئی کیفیت نہیں آئی؟ ارشاد ہوا ابھی طلب بھی نہیں ہوئی کام بہت زیادہ ہے میں نے کہا کہ اُس بہت میں یہ تھوڑا سا بھی شامل ہو جائے تو رئیسوں کے حال پر حضور والا کی نوازشوں سے بعید نہ ہوگا۔ چنانچہ اُسی روز طلب کیفیت کا حکم جاری ہوگیا۔ اس کے بعد سیلی بھیت کی جانب روانگی ہوگئی اور لہری منڈی جا پہونچے۔

راستہ برہم دیو کی سیر:۔ دوسرے دن تمام لشکر وہیں چھوڑ کر برہم دیو کے راستہ کی سیر کرنے .... جو پہاڑی لوگوں کے زیر حکومت تھا چند ہمراہیوں کو لیکر چل دیئے وہاں پر سوائے اپنے ساتھیوں کے کسی آدمی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ سورج ڈھلے، ایک دو سوار اور چند دیہی پیدلوں کی ایک جماعت، پہاڑ کے اوپر نو سار چوٹی جو خیمے کی جانب آرہے تھے اور خیمہ گاہ میں سوائے شاگرد پیشہ دو تین پہرہ دار سپاہی، نواب احمد علی خاں کے پھوپی زاد بھائی عظیم اللہ خاں اور بابو رام نرائن سنگھ (راجہ بنارس کے خاندان کا تھا) کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا عظیم اللہ خاں اور صاحبان عالیشان خیموں سے نکل آئے اور دوربینیں ہاتھ میں لیکر دیکھنے لگے عظیم اللہ خاں نے بندے سے فرمایا کہ اگر میرے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے جاؤ اور معلوم کرو کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیوں آرہے ہیں تو بہتر ہے چنانچہ میں سوار ہو کر چل دیا ایک دو شخص جو آگے آرہے تھے ان سے میں نے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ کہا کہ اس پہاڑ کے سردار ہیں۔ جو تشی قوم کے ہیں سرِ لشکر کی ملاقات کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے کہا پہلے جو تشی صاحب نواب عظیم اللہ خاں کے خیمے میں آرام کریں وہ صاحب سے عرض کر دیں گے اُس وقت ملاقات ہو سکے گی میں یہ کہہ کر واپس آگیا عصر کے قریب جو تشی آیا اور ملاقات کر کے چلا گیا، غروب کے وقت بہت ٹھنڈی ہوا چلی اور اس دریا کے پانی میں، جس کو وہاں پر سارجو، سرجی اور شاردا اور پہاڑ پر کالی اور بہرائچ کے راستے میں گھاگرا اور چھپرہ کے قریب دیوہا کہتے ہیں ایک شور برپا ہوگیا سردی دم بدم بڑھنے لگی لوگ موسم بہار کے باعث جاڑوں کے کپڑے ساتھ نہ لائے تھے پریشان ہوگئے مجبوراً لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی اور پارسیوں کی طرح اس کو بجھنے نہ دیا بہر صورت رات گزاری، آفتاب نکلا اب رنگ برنگ کے کپڑے پہن کر سورج پرستوں کی طرح ادھر کو منہ کر کے بیٹھ گئے پھر کچھ دیر گرما گرا کٹھ چلے اور لشکر میں آپہونچے پھر وہاں سے لگاتار کوچ کر کے فتح گڑھ پہنچ گئے

فقیر گوشائیں سے ملاقات:۔ (فتح گڑھ میں) ہر ایک نے دریا کنارے ایک ایک مکان کرایہ پر لے لیا چند روز کے بعد میں پھر گیا اور دریافت کیا کہ کیا صاحب کلکٹر کا جواب آگیا؟ فرمایا نہیں۔ اس کے بعد یہاں سے بھی روانگی ہوگئی علی گنج کے پڑاؤ پر لشکر کے قریب ایک فقیر گوشائیں رہتا تھا میں اس کے پاس چلا گیا خوش مزاج تھا درویشانہ

اخلاق سے پیش آیا تھوڑی دیر تک میں بیٹھا رہا اس کے سارے مرید ابھی بیس برس کے بھی نہ ہوں گے خاکستر منہ پر ملے ہوئے تھے جس سے ان کے چہرے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے دہکتا ہوا انگارہ راکھ میں چمکتا ہے جو کوئی ایک بار دیکھ لیتا پھر نظر ہٹا ہی نہیں سکتا۔ دل چاہتا تھا کہ بس یہیں بیٹھا رہوں اور خداوند تعالیٰ کی اس عجوبۂ روزگار صنعت کو دیکھتا رہوں گروجی سے میں نے پوچھا کہ کیا مجھکو بھی چیلوں کے سلسلے میں داخل کر سکتے ہو؟ کہا کہ "نہیں مسلمان قوم کی ہمارے مذہبی طریقے میں گنجائش نہیں، اپنے حال پر چار آنسو بہاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا:

اگر نیک بودے مرا رسم و راہ		بہ اسلامیاں داشتم پائے گاہ
کنوں ننگ دارد زمن پیر دیر		کہ در من نہ بیند نشانے ز خیر

خانقاہِ مارہرہ کی زیارت: وہاں سے منزل بمنزل چل کر ہم کاسگنج آ گئے اور کاسگنج سے مارہرہ، جہاں شاہ برکت[1]

---

[1] شاہ برکت اللہ ابن شاہ اویس ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء میں پیدا ہوئے تاریخی نام عظیم الہدیٰ ہے اول شاہ مربی ولد عبد النبی بلگرامی کے مرید ہوئے اس کے بعد شاہ فضل اللہ کالپوی کی خدمت میں فیض حاصل کیا اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۱۱۷ھ مطابق ۱۷۰۵ء میں مارہرہ میں آکر مستقل سکونت اختیار کی اور وہیں مسجد و خانقاہ تعمیر کرائی اور نئی آبادی کا نام پیم نگر یا برکات نگری رکھا جو اب "بستی پیرزادگان" کے نام سے مشہور ہے بھاکا اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے بھاکا میں پیمی اور فارسی میں عشقی تخلص فرماتے تھے میر غلام علی آزاد نے سرو آزاد میں بھاکا کا نمونۂ کلام درج کیا ہے ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۲۹ء میں انتقال ہوا صاحب تصانیف تھے میر غلام علی آزاد نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ انتقال لکھا ہے:

بیدار دلی رفت سوئے محفل قدس		بر بست ز صحرائے جہاں محمل قدس
تاریخ وصال او خرد کرد رقم		صاحب برکات وصل منزل قدس ۱۱۴۲ھ / ۱۷۲۹ء

(۱) مآثر الکرام (دفتر اول) از میر غلام علی آزاد بلگرامی مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۱۰ء ص ۱۲۱، ۱۲۳)
(۲) سرو آزاد از میر غلام علی آزاد بلگرامی مطبوعہ دخانی رفاہ عام پریس لاہور ۱۹۱۳ء ص ۳۹۴، ۳۹۶
(۳) خاندان برکات از محمد میاں مارہروی مطبوعہ حسنی پریس بریلی ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۷ء ص ۷، ۱۰
(۴) آثار احمدی (قلمی) از شیخ عنایت حسین کمبوہ مارہروی (مملوکہ محمد ایوب قادری) ورق ۱۳، ۱۵
(۵) مختصر تاریخ خاندانِ برکاتیہ از محمد میاں مارہروی مطبوعہ ادبی پریس لکھنؤ (سال طباعت نامعلوم) ص ۵
(۶) برکات مارہرہ از طفیل احمد بدایونی مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ (سال طباعت نامعلوم) ص ۱۸، ۳۸
(۷) نور مدائح حضور حصہ اول از غلام شبر بدایونی مطبوعہ امیر الاقبال پریس بدایوں ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء ص ۲۷-۳۱

کا مقام ہے پہنچ گئے میں نے اسی روز چاہا کہ وہاں کے بزرگوں کے دیدار سے مشرف ہو جاؤں کیونکہ بہت سے لوگوں کی زبانی وہاں کے بزرگوں کی تعریف سُن چکا تھا کہ وہاں دو بزرگوار ہیں[1] ایک کو بڑی سرکار اور دوسری کو چھوٹی سرکار کہتے ہیں اور ان دونوں کا اختلاف ہندو مسلم اختلاف سے زیادہ ہے[2] چنانچہ میں گیا اور دونوں کی زیارت کی اور اس قدر برکتیں حاصل کیں کہ دوبارہ وہاں جانے کی حاجت نہ رہی۔

مشتاق شدم تا بہ در شیخ رسیدم
آں یافتم آنجا کہ بہ می خانہ ندیدم

خانقاہ میں بہت سی کتابیں اور عمدہ نسخے ہیں دوسری نادر چیزیں جو علماء اور مشائخ کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہیں بڑی سرکار میں موجود ہیں منجملہ ان کے ہمانے مردہ بھی ہے لیکن میں نے اس کو دیکھا نہیں

---

[1] شاہ برکت اللہ کے بڑے صاحبزادے شاہ آل احمد المتوفی ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۲۰ء کی گدی سرکار کلاں کے نام سے اور چھوٹے صاحبزادے شاہ نجات اللہ کی گدی سرکار خورد کے نام سے موسوم ہوئی جس وقت مولف کتاب مارہرہ گئے اس وقت سرکار کلاں میں شاہ آل احمد عرف اچھے میاں سجادہ نشین تھے شاہ آل احمد اپنے زمانے کے مشہور صاحب باطن اور ولی کامل تھے۔ ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۵ھ ۱۸۱۹ء میں انتقال ہوا۔ اور اس وقت سرکار خورد میں شاہ برکات بخش بھکاری سجادہ نشین تھے۔ شاہ برکات بخش کی ولادت ۱۱۷۰ھ ۱۷۵۶ء میں ہوئی اور وفات ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں ہوئی۔ ان بزرگوں کے تفصیلی کے لئے ملاحظہ ہو:-

۱۔ خاندان برکات صفحہ ۱۲-۱۶ و ۶۹-۷۱
۲۔ مختصر تاریخ خاندان برکاتیہ صفحہ ۶-۹
۳۔ برکات مارہرہ صفحہ ۳۹-۴۷
۴۔ آثار احمد (قلمی) صفحہ ۱۶-۳۶
۵۔ نور مدائح حضور صفحہ ۳۳-۴۲

[2] یہ اختلافات تقسیم جائداد اور سجادہ نشینی کے سلسلے میں ظہور پذیر ہوئے اور ان اختلافات کا سلسلہ دونوں سرکاروں میں آج تک موجود ہے۔

لوگوں کی زبانی سنا ہے اس کا دیکھنا اس لئے ممکن نہ ہو سکا کہ سال بھر میں مقررہ[1] دنوں میں اس کو دکھاتے ہیں اور مردہ پرستوں کی آنکھوں میں روشنی بڑھاتے ہیں[2]

مگس راں کساں راخس و مو ہما	خدیواں گزیدند پرِ ہما!
نشاں داد دانا یکے راچناں	کہ بر ہر کہ افتد بیانِ کساں
جہاں را اگر یک زماں شائیہ	ہماں را امر شاہ پر ہما
چناں زیں سخن بردناداں گماں	کزاں سایہ یا بند شاہی شہاں
بگفتا بناداں تری ایں سخن	کہ ہر گز ندارد سرو پاؤ بن
ہمارا فتد سایہ گر بر گدا	بسے نگذرد کاں شود بادشاہ

دوسرے دن صاحب کو تنہا دیکھ کر اس کے پاس گیا اور کہا کہ اب تو ایک عرصہ گزر گیا مگر کوئی جواب نہیں ملا فرمایا کہ کلکٹر کے پاس سے جواب ہی نہیں آیا میں نے کہا حضور والا میرا مُدعا کلکٹر ہے؟ اگر جواب دینا اس کے اختیار میں ہے تو میری دادرسی معلوم۔ فرمایا آج کمز رحکم ہو جائے گا اور فتح گڑھ میں جواب دے دیا جائے گا مجبوراً منظور کرنا پڑا اور لشکر کے ساتھ فتح گڑھ پہنچ گیا۔

کمشنر بورڈ سے گفتگو:۔ ایک ہفتے کے بعد شام کے وقت جب سب رخصت ہو کر چلے گئے تو میں نے عرض کی کہ جواب کا اُمیدوار ہوں فرمایا کل کو (جواب ملے گا) اسی روز ناپنی جائے قیام پر آ کر میں نے سنا کہ (صاحب نے) منشی سے فرمایا ہے کہ ایک خط عنایت اللہ خاں کے نام لکھدیا جائے کہ ابھی املاک کے متعلق کوئی روبکار نہیں ہے اور کلکٹر کا بھی ابھی کوئی جواب نہیں آیا لہٰذا آپ کے فرستادہ کو رخصت کیا جاتا ہے وقت پر روبکار جاری کرنے کا حکم دیا جائے گا، اس خبر سے میں بہت پریشان ہوا کہ میری تین ماہ کی پریشانی سے کیا فائدہ ہوا اور وہاں پر خط کے سوا کیا لے جاؤں گا سب لوگ یہی کہیں گے کہ ناتجربہ کار سے کیا کام انجام پا سکتا تھا، میں نے ایک درخواست لکھی کہ "دادرا داد گرا" کے قانون کے مطابق صاحب کلکٹر

---

[1] سالانہ عرس کے دن مراد ہیں۔　[2] مولوی محمد میاں مارہروی نے ایک رسالہ "ذکر میلاد مبارک" مؤلفہ شاہ اولاد رسول مارہروی ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں ادبی پریس لکھنؤ سے طبع کرایا ہے اس کے آخر میں جملہ تبرکات کی تفصیل بعنوان "تفصیل تبرکات خاندانی" شامل کی ہے اس میں اسس ہمائے مردہ کا کہیں ذکر نہیں ہے غالباً مصنف نے یہ بات بطور طنز لکھی ہے۔

کو ہماری املاک میں کوئی شبہ تھا تو محکمہ کمشنر بورڈ کے قانون کے مطابق سرکار کمپنی انگریز بہادر کی جانب سے عدالت دیوانی میں ہمارے نام نالش کی جاتی اور حقیقت میں فیصلہ کے بعد سرکار اس پر قابض ہو سکتی تھی چونکہ خلاف قانون ترقی کی گئی اس لئے التماس ہے کہ یہاں سے یا صاحب کلکٹر کے یہاں سے حکم ہو جائے کہ املاک چھوڑ دی جائے یا مجھکو اجازت مرحمت ہو کہ سرسری میں رجوع کر کے صاحب کے (بیجا) تصرف کو روکوں۔ حضور والا! تین ماہ کے بعد جب سرسری کی میعاد گزر گئی جواب ملتا ہے کہ "کلکٹر سے کیفیت اور املاک کے روبکار کا وقت نہیں آیا لہٰذا اب یہاں سے چلا جا" سرکار کی انصاف پسندی کی بنا پر عرض ہے کہ "اگر یہ جواب پہلے ہی دن مل جاتا تو بڑی خوبی کا باعث ہوتا کہ میں سرسری کی تدبیر کر سکتا۔ نیز صاحب کلکٹر سے کیفیت طلب کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی کیونکہ صاحب ممدوح نے نہ تو اس محکمے سے اجازت حاصل کی نہ بحق سرکار فیصلہ پایا۔ اب بھی اس عرضی پر صورت مندرجہ کا جواب تحریر فرما کر دستخط فرما دیئے جائیں اور بندہ کو مرحمت ہو۔"

دوسرے دن حسب الحکم میں گیا خط کا جواب عنایت ہوا اور فرمایا کہ اسے پڑھ لو تا کہ بند کر کے تم کو دے دیا جائے اس میں وہی تھا جو میں سن چکا تھا اتنا اور زیادہ تھا کہ تمہارے وکیل نے حاضر باشی اور عرض حالات میں کوتاہی نہیں کی۔ میں نے درخواست پیش کی کہ یہ بھی دستخط سے مزیّن ہو جائے فرمایا کہ "تم صاحب کلکٹر کو جانتے ہو کہ خلافِ قانون کام کرتے نہیں" میں نے کہا کہ کمشنر بورڈ کے تقرر کے وقت اکثر کو یہ احساس تھا کہ صاحبانِ صدر اس بات سے واقف ہیں فرمایا کہ حکم کے بعد وکیل کی یہ تکرار بیجا ہے، میں نے کہا کہ مقصد تو یہ ہے کہ درخواست ہی پر دستخطی حکم ہو جائے تا کہ آئندہ بندگان حضور کو پریشان نہ کروں فرمایا درخواست قابل جواب نہیں کیونکہ حکم کے بعد ہے میں نے عرض کی بس اتنا ہی کافی ہے (تحریر فرما دیجئے) آخر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اب تو شام ہو گئی خط لو اور چلے جاؤ پھر آنے کی ضرورت نہیں میں نے عرض کی کہ اس وقت تو میں جاتا ہوں کل کو خط اور عرضی پر حضور والا کی انصاف پسندی سے حکم کا امیدوار ہوں اور خداوند نعمت کو میرے آنے کی کیا ضرورت البتہ مجھے آنا ضروری ہے۔

گھر آتے ہی مجھے لوگوں نے ڈرایا کہ اتنی مدت میں صاحب کسی پر اتنے خفا نہیں ہوئے جتنے تجھ پر، تو نے حلیم الطبع کو غضب آلود کر دیا کل کو خود نہ جانا بلکہ پہلے منشی سے ملنا۔ میں نے کہا جرمانہ موکل ادا کریگا اور اگر قید ہے تو اپنے لئے (باعث ذلت) نہیں آقا کے کام میں مصیبت برداشت کرنی نوکری پیشہ کے لئے عزت و ترقی معیشت کا سبب ہے چنانچہ دوسرے روز میں گیا سلام کرتے ہی پہلے ایک انگریزی

خط حکمی بنام صاحب کلکٹر حوالے فرمایا اس کے بعد وہی خط (بنام عنایت اللہ خاں) مجھے دیا میں نے عرض کی کہ خط کا مضمون دوسرا ہے فرمایا اس کے آخر میں لکھو کہ: "آپ کے وکیل کے زور زبان آوری کے باعث قبل از وقت حکم صادر ہوا" میں نے لکھدیا۔ اس پر دستخط کر دیئے۔

مقدمہ کی پیروی سے واپسی:- میں (صاحب کا) بے حد شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا اور دوسرے ہی دن گھر (رامپور) کی جانب عظیم اللہ خاں کی ہمراہی میں چل دیا اور منزلیں طے کرتا ہوا بریلی پہنچا، عظیم اللہ خاں کی فرمائش پر دو روز وہاں توقف کیا اور پھر خان کا تعارف مولوی منیر الدین[1] آسیونی سے کرا دیا جو ٹامس بروک صاحب ایجنٹ بریلی کے منشی تھے اور ماتحتوں کی نظروں میں اصلی ایجنٹ معلوم ہوتے تھے اسی ضمن میں میر نصیر سے بھی ملاقات ہو گئی جو صاحب ذہن رسا اور خاندان خواجہ میر درد دہلوی کے متوسلین میں سے تھے اور بروک صاحب کے تربیت کردہ تھے میں نے ان سے کہا کہ میرے موکل عنایت اللہ خاں کے بھائی، اسد اللہ خاں کو، والدہ اور بڑے بھائی سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور بڑے بھائی کے مشاہرے میں ترقی کی شکایت نصر اللہ خاں تک پہنچ گئی ہے جن کے ہاتھ میں مہمات ریاست کا حل و عقد تھا اور اُنھوں نے اسد اللہ خاں کے حامی ہو کر دوسرے طریقے سے تقسیم کر دی ہے اور جناب بیگم صاحبہ (والدۂ عنایت اللہ خاں) اور عنایت اللہ خاں صاحب ایجنٹ کی پیشی میں فیصلے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بخیر میں حواس باختہ بہت جلد شہر (رامپور) میں پہونچا ایک دن ٹھیر کر کاشی پور گیا اور کمشنر بورڈ کا حکم صاحب کلکٹر کے پاس پہونچا دیا وہاں پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مراد آباد چلے جاؤ اور میرا انگریزی خط کارٹن صاحب رجسٹرار کو جو اس وقت جج کے قائم مقام ہے پہنچا دو۔ میں بہت اچھا کہکر پہلے رامپور آیا اور موکل (صاحبزادہ عنایت اللہ خاں) کی خدمت میں عرض کی کہ میرا جناب والا کی ملازمت میں رہنا اسد اللہ خاں کے دل میں ترقی اوہام کا باعث ہوگا اور یہ مشہور کر دیں گے کہ یہ شخص مصالحت میں روڑے اٹکا رہا ہے۔

---

[1] مولوی منیر الدین قصبہ آسیون مضافات لکھنؤ کے رہنے والے تھے کتب درسیہ مولوی حیدر علی پسر مولانا حمد اللہ سندیلوی سے پڑھیں نظم و نثر فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے کچھ دنوں فرخ آباد میں رہے۔ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی نے ان کا نام منیر علی لکھ دیا ہے ملاحظہ ہو عہد بنگش ص ۳۴۶ تذکرہ روز روشن از محمد مظفر حسین ص ۱۶۸ مطبوعہ شاہ جہانی بھوپال ۱۲۹۷ھ)

مولوی عبدالقادر کا داروغۂ پولیس مقرر ہونا۔ اب میں مرادآباد گیا اور کارنٹ صاحب کے درِ دولت پر جا کر ڈاکٹر صاحب کا خط صاحب کے ملازم خاص دینی نامی کے ہاتھ بھجوایا وہ چونکہ مرادآباد میں ہمارے ہی محلہ میں رہتا تھا بہت جلد صاحب کے پاس لے گیا چونکہ صاحب ممدوح نہایت بُردبار ہے اور نہایت آہستہ آواز سے بات کرتا ہے وہ بیچارہ بیحد خوف زدہ میرے پاس آیا اور کہا کہ اس وقت گھر چلے جاؤ نہ معلوم اس خط میں کیا لکھا تھا کہ اس کی پیشانی دیکھتے ہی صاحب غضب آلود ہوگیا۔ میں گھر چلا آیا جس وقت صاحب دفتر میں آیا دریافت کیا کہ اس نام کا کوئی شخص شہر (مرادآباد) میں ہے مولوی منیر علی نے جو اس وقت دیوانی سررشتہ دار تھے عرض کی کہ موجود ہے ارشاد ہوا کہ اس سے کہہ دیا جائے کہ کل ہمارے مکان پر آئے مولوی صاحب نے یہ پیام مجھے پہنچا دیا میں نے یہی کیا صاحب بہادر اس انداز مہربانی سے میرے ساتھ پیش آیا جو میرے رتبہ سے بالاتر اور اس کے بلند مرتبہ کے شایانِ شان تھا اور فرمایا کہ اس وقت میرے قبضہ میں جو کچھ ہے ٹھاکردوارہ کی ایک پولیس (چوکی) ہے تنخواہ تیس روپے ہے اگر مناسب ہو تو منظور کر لو میری ترقی کے ساتھ تمہاری ترقی شامل ہے میں نے منظور کر لی یہیں سے ایک پرچے پر میرا نام لکھ کر سررشتہ فوجداری میں بھیجدیا کہ قائم مقامی کا پروانہ اس شخص کے نام لکھ کر اور نقل کر کے بھیجدیں وہ پروانہ مجھے عنایت کر کے فرمایا کہ تین روز یہیں رہو، سامان درست کر لو روزانہ ہمارے پاس آتے رہو اور اس کے بعد تھانے چلے جانا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ بشن سنگھ نامی سررشتہ دار فوجداری کو اس بنا پر کہ اس کی وساطت کے بغیر مجھے عہدہ مل گیا اپنی سرد بازاری کا خیال ہوگیا چنانچہ اس نے اسی عرصہ میں وہاں کے جمعدار کو رقعہ بھیجکر مرادآباد بُلا لیا جس دن میں صاحب سے رخصت ہوا اور اگلے دن تھانے کو روانگی کا ارادہ کیا کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ میں ٹھاکردوارہ کا جمعدار ہوں میں نے کہا کہ کیا عدالت سے تمہاری طلبی کا کوئی حکم پہونچا ہے اس نے کہا نہیں بلکہ پولس کے مالک اور عملے کے سررشتہ دار نے مجھکو بلایا ہے اس لئے آیا ہوں میں نے اس شخص کی شوخ چشمی اور خودسری کو دیکھتے ہوئے دل میں خیال کیا کہ "گربہ کشتن روزِ اول باید وِالّا مشت بعد جنگ است" پر عمل کرنا چاہئے چنانچہ میں نے اس کو اطلاع دی کہ میں کل وہاں پہونچکر فردِ حاضر و غیر حاضر مجسٹریٹ بہادر کے حضور روانہ کروں گا تمہاری غیر حاضری کا سبب جو کچھ تم نے بیان کیا وہی لکھدوں یا اور کچھ لکھوں یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور کہنے لگا کہ اب تک کوئی افسر میرے سر پر نہ تھا اب تابع فرمان ہوں رات ہی میں یہاں سے روانہ ہو کر آپ کے تشریف لانے سے پہلے پہنچ جاؤں گا میں نے

کہا بہتر ہے۔

تھانہ ٹھاکردوارہ کے واقعات:۔ صبح کو میں (مرادآباد سے) چل دیا اور تھانہ (ٹھاکردوارہ) پہنچ گیا۔ جمعدار نے کہا کہ گھوڑے کے لئے گھاس، سوختہ اور مٹی کے برتن وغیرہ جس قدر ضرورت ہو تھانے میں موجود ہیں۔ میں نے کہا اب تک جو کچھ کر لیا مجھکو اعتراض نہیں لیکن یہ چیزیں میرا مقصد نہیں ہیں کیونکہ میرا مقصد تو لوگوں کو لوٹ کھسوٹ سے بچانا ہے نہ کہ محافظت کے پردے میں ڈاکہ زنی، کہنے لگا یہ تو پرانا دستور چلا آتا ہے میں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں صرف اتنا لکھکر اپنے اور محرر کے دستخط کر کے مجھے دے دو کہ کب سے کب تک یہ صورت جاری رہی تاکہ میں اس کو اپنی عرضی کے ساتھ صاحب مجسٹریٹ بہادر کے پاس بھیجدوں پھر جو حکم آئے گا اس پر عملدرآمد ہوگا اس بات سے ان لوگوں نے گریز کیا دن گزرا اور رات آئی میں نے پوچھا کہ پہلے گشت میں کون جائے گا؟ کہنے لگا جمعدار اور دوسرے گشت میں محرر، میں نے کہا کہ محرر کو اب تکلیف دینی مناسب نہیں، میں خود جاؤں گا۔ دوسرے روز میں نے اپنے تھانے پہنچنے کی عرضی نقل کے لئے محرر کے پاس بھیجی اس نے کہا کہ لکھنا پڑھنا میرے ذمے ہے آپ صرف دستخط اور حکم دہی کے مالک ہیں میں نے کہا کہ اگر کوئی بیجا حرف ہو تو مجھے مطلع کر دو تاکہ اچھا لکھنا پڑھنا میں بھی سیکھ لوں اور یہ بات تمہاری یادگار رہے گی، چنانچہ ایک ہفتے میں سب ٹھیک ہو گئے اور ان خود سروں کو چھوڑ دیا۔

ایک چوری جو ایک بنئے کے گھر میں مجھ سے پہلے ہوئی تھی اور تین چار ماہ سے برابر اس کی تفتیش کی تاکید ہو رہی تھی۔ ایک چوکیدار، وزیر نامی میواتی چور اور مال مسروقہ کو لے آیا چور جو پرگنہ نگینہ کا باشندہ تھا، کہنے لگا کہ میں سید خاں افغان کے مکان پر رہتا تھا اور جہاں کا وہ پتہ دیتے وہیں جا کر چوری کرتا تھا میں نے اسی وقت خود وہاں جا کر سید خاں کے گھر کی تلاشی لی ایک دو چیزیں مسروقہ بھی نکلیں جس کو مدعی نے شناخت کر لیا میں نے سب کو مرادآباد چلتا کر دیا تھانے کے ملازمین کی واپسی پر میں نے سنا کہ شہامت بیگ ناظر فوجداری نے چور پکڑنے والے چوکیدار کو چور کے ہمراہ حوالات میں بھیجدیا اور سید خاں ضمانت پر شہر میں سیر کر رہا ہے مجھے ناگوار گزرا۔

اتفاق وقت ان ہی دنوں میں ایک سرکش اہر میلا نامی نے نواح سہسوان[1] میں ہنگامہ کر ڈالا ریاض الدین،

---

[1] سنہ۱۸۰۱ء میں روہیل کھنڈ نواب وزیر سعادت علی خاں نے حکومت کمپنی کو تفویض کر دیا اس وقت روہیل کھنڈ کا کل رقبہ صرف (باقی صفحہ ۹۶ پر)

تھانیدار اور ایک فوجی صاحب اس میں قتل ہو گئے صاحب مجسٹریٹ نے اپنا دستخطی پروانہ محکمے کی اطلاع کے بغیر بندہ کو لکھکر یاد فرمایا شام کے وقت میں مرادآباد پہونچا دوسرے روز باریابی ہوئی ارشاد ہوا کہ سہسوان جاکر کوئی مناسب تدبیر کپتان مکاآئی صاحب افسر فوج کو بتاؤ اور جس وقت مفسد کسی ایسے موقع پر ہو کہ سپاہی اسے گھیر سکیں تو کافی جمعیت وہاں پہونچا دو میں نے کہا کہ جو کچھ ممکن ہو سکا، کرونگا اگر اجازت ہو تو رامپور ہو آؤں دوسرے ہی دن واپس آجاؤں گا۔ اجازت مل گئی (رامپور) گیا اور واپس آگیا صاحب مجسٹریٹ کی خدمت میں حاضر ہوا ارشاد ہوا کہ تحقیق ہو گئی کہ میلا۱ پر دریائے گنگا کی طرف چلا گیا اب یہیں رہنا چاہئے اور جو کچھ مناسب ہو عرض کرو۔

روزانہ میں (مجسٹریٹ صاحب کے پاس) جاتا تھا آخر ایک دن اس چوکیدار کے حوالات میں ہونے اور اس وزیر پناہ (سید خاں) کے رہا ہونے کا واقعہ میں نے عرض کر دیا ارشاد ہوا کہ آج ہی تدارک ہو جائے گا لیکن ناظر (شہامت بیگ) ریٹ صاحب کے زمانہ سے ہے اور اسی طرح سررشتہ دار (بشن سنگھ) آزول صاحب کے وقت سے چلا آرہا ہے لیکن جو کچھ ہوا ہے ضرور کاٹیں گے چنانچہ محکمے میں مقدمے کو پیش کر کے چوکیدار کو شاباشی اور انعام دے کر رخصت کیا اور مجرموں کو سزا دی گئی یہ کل واردات ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء؁ تک کی ہے۔

تھانہ امروہہ کے واقعات:۔ اسی زمانہ میں میری دادی عالم جا دواں کو سدھاریں مجھکو یہیں (مرادآباد) رکھ لیا یہاں تک کہ آزول صاحب جج آگئے اور کارٹن صاحب کے مکان پر قیام کیا صاحب نے بندے کو یاد فرمایا اور صاحب جج کے سامنے پیش کر دیا صاحب جج نے علٰحدہ مکان میں لیجا کر فرمایا کہ تم کو امروہہ بھیجا جاتا ہے وہاں پر چالیس روپے کی تنخواہ ہے چوری اور غارت گری کے ہنگامے بھی بہت ہیں۔ نجف علی کو کہ اس سے کچھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵ سے آگے) دو اضلاع بریلی و مرادآباد پر مشتمل تھا اور بدایوں کے کل پرگنے بشمول سہسوان ضلع مرادآباد سے متعلق رہے ۱۸۲۴ء؁ میں تغیر و تبدل اس طور پر ہوا کہ پرگنہ سہسوان، بدایوں، کوٹ، اوجھیانی۔ اودھت اور سلیم پور مرادآباد سے خارج ہو کر ضلع بریلی میں شامل کئے گئے اور باقی پرگنے رجپورہ، اسد پور، ستاسی، لبسولی اور اسلام نگر ضلع مرادآباد ہی میں شامل رہے۔ (کنز التاریخ از مولوی رضی الدین بدایونی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۰۷ء؁ ص ۱۱۵، District Gazetteer of The United Provinces of Agra and Oudh vol XV By H. R. Nevill PP 100 (Allahbad) (1907)

۲ محرم ۱۲۲۵ھ ۳ فروری ۱۸۱۰ء کے مطابق ہوتے ہیں (تقویم ہجری و عیسوی از ابوالنصر محمد خالدی مطبوعہ انجمن ترقی اردو پریس کراچی ۱۹۵۲ء) ص ۶۲

تدارک نہ ہو سکا تھا کر دوبارہ بھیجتا ہوں، کب جا سکو گے؟ میں نے عرض کی کہ اگر اس وقت ارشاد ہو، تو
اسی وقت۔ فرمایا۔ بہتر اور اشتہاری (مجرموں) کی ایک فہرست میرے سپرد کی جو اس نواح میں سرکار کے
انتظام میں خرابی کرتے ہیں میں نے عرض کی کہ اگر ان لوگوں کی جائے سکونت، قومیت اور حلیہ بھی اس میں درج
ہو جائے تو یقیناً کامیابی ہو جائے گی، ارشاد ہوا بجا ہے، اور دفتر میں پہونچکر فرمایا کہ میں ابھی کچہری کا معائنہ
کرنے جاتا ہوں شام کو آنا تاکہ میں تمہیں رخصت کر دوں جسب الحکم میں چلا آیا صاحب نے سررشتہ دار کو دیکھ
کر پوچھا کہ وہ فہرست کب تک درست ہو جائے گی؟ اس نے کہا اس کو تو بہت زمانہ چاہیئے زبانِ مبارک پر
گزرا شاید تمہاری سررشتہ داری میں انجام پا جائے دری خانہ سے اُٹھ کر جب میں دولت خانہ پر پہنچا فرمایا
کہ اسی وقت امروہہ کا راستہ لو کیونکہ اس فہرست کے لئے تو ایک عمر درکار ہے میں نے ایسا ہی کیا (اور
امروہہ پہونچ گیا۔)

صبح کے وقت میں نے تھانے کے محرّروں سے کہا کہ گاؤں کے چوکیداروں کی فہرست اور ان کی ماہانہ حاضری
لائیں دونوں (فہرست و حاضری) کو دیکھ کر میں نے کہا کہ جو چوکیدار اطلاع نہیں دیتے ہیں ان کو لکھ بھیجو کہ
یہاں آئیں ہفتے بھر میں سب چوکیدار آگئے غیر حاضر چوکیداروں سے میں نے پوچھا کہ کیوں حاضر نہیں ہوئے
کہنے لگے کہ گاؤں کے مکھیا ہمارا حق پاسبانی نہیں دیتے یہ بلا اجرت کی مزدوری ہم کیوں کریں میں نے خیال کیا
کہ اس تحقیقات میں تو طوالت ہے مختصر یہ کہ تحصیلدار کے ذریعے ہر مکھیا کے پاس اپنی یہ تحریر بھجوا دی کہ چوکیدار
سے اس کی اُجرت کی رسید لے لیا کریں اور تازہ واقعے کی اطلاع کے لئے چوکیدار برابر بھیجا کریں اور بلا ضرورت
بھی پندرھویں دن خیریت پہنچا دیں اگر چوکیدار نہیں آئیں گے تو تم سے جواب طلب ہوگا اور رسید بھیجدینے
کی صورت میں چوکیدار کو صاحب مجسٹریٹ کے سامنے بھیجدیا جائے گا چوکیدار خوش ہو گئے

میں نے کہا کہ اب جا کر گاؤں کے مویشی چرانے والوں سے مویشیوں کی فہرست لکھوا لیں اور اس کے بعد
ایک مچلکا (لیں)، کہ جب کبھی ایک راس کم یا زیادہ ہو تو چوکیدار کو خبر دیں اور چوکیدار تھانے میں اطلاع دے
اسی طرح جو کچھ میرے دل میں آتا کرتا یہاں تک کہ رہزنی اور لوٹ سوائے ایک دفعہ کے جو گانگن ندی کے
کنارے، مراد آباد کے قریب تھانہ سے بارہ کوس کے فاصلے پر ہوئی تھی اور کہیں نہیں ہوئی اور چوری بھی
کم ہو گئی۔

صاحب کی توجہ بندے کے حال پر پڑنے لگی مہینے بھر میں ایک دو مرتبہ یاد فرما لیتے اور دوسرے تھانوں

مثل حسن پور، بچھرایوں اور سنگھ پور کے انتظام کے لئے بھیجدیتے اور پولیس کے عملے میں جو کوئی ملازم ہوتا میرے ذریعے سے ہوتا، جب کیمبری صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر ہونے تو مجھے معلوم ہوا کہ دونوں صاحبوں میں بے حد اختلاف رائے ہے اور دونوں جگہ جواب دہی کرنی پڑے گی لہذا میں مستعفی ہوگیا۔

اسسٹنٹ کلکٹر مرادآباد کی ملازمت:۔ کارٹن صاحب بہادر دیناج پور کے کلکٹر ہو گئے ویلدر صاحب جو لانڈ صاحب کے اسسٹنٹ کلکٹر تھے ایک ایسے شخص کی تلاش میں تھے جو یہاں کی زبان ان کو سکھا دے، چونکہ مجھے کارٹن صاحب کے بنگلے پر دیکھا تھا اس لئے یاد فرمایا، لوگوں نے کہا کہ صاحب کا مزاج بہت تیز اور سخت ہے کوئی ایک مہینے سے زیادہ نہیں رہ سکتا میں نے کہا اب تو چند روز ایسے صاحب کی نوکری ضروری ہے تاکہ سخت اور تیز مزاج افسر کے ساتھ بسر اوقات کا طریقہ بھی سیکھ لوں چنانچہ کرت پور[1] کے مقام پر خدمت فیض درجت میں حاضر ہوگیا آقا خود پانچسو روپیہ سے کم تنخواہ پاتے تھے تیس روپے میرے لئے مقرر کئے باربرداری اور سفر میں خیمے کا صرفہ بھی خود اپنے ہی ذمے رکھا میں نے قبول کر لیا آخر نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ لوگوں نے لانڈ صاحب سے جاکر کہا کہ صاحب فلاں شخص (مولوی عبدالقادر) کو رات دن میں کسی وقت بھی نہیں چھوڑتے، لانڈ صاحب نے میرے آقا (ویلدر) کو لکھا کہ اس ملک کے لوگوں سے شروع میں زیادہ خلا ملا جیسا کہ وہ رکھتے ہیں اچھا نہیں ہے اور ان لوگوں کے نام معلوم کر لینا ان ہی (صاحب بہادر) کی رائے صائب پر موقوف ہے صاحب نے لکھا کہ میرے پاس زیادہ تر دو ہندوستانی آمد و رفت رکھتے ہیں ایک عبدالقادر جس کی تعریف صاحب کی زبانی جبکہ وہ آزول صاحب کا ملازم تھا بہت سنی ہے دوسرے لی کرانی کہ اس کی برائی بھلائی میں نے کچھ نہیں سنی میرے خیال میں یہی (لی کرانی کی آمد) گراں گزری لہذا میں نے اپنے آدمی سے کہدیا ہے کہ اس کو نہ آنے دے

اس کے بعد قصبۂ سنبھل میں صاحب کلکٹر کے ہمرازوں سے میں نے متواتر سنا کہ صاحب کہتا ہے کہ چھوٹا صاحب اب سمجھنے لگا ہے کہ وہ کلکٹری کے تمام کام سے واقف ہوگیا حالانکہ ابھی تک کچھ واقفیت نہیں ہے، ایک شخص نے جو اس کا معتمد ہے اس کو غلطی میں ڈال رکھا ہے مجھے نہیں معلوم کہ یہ صاحب ہی کا فرمودہ ہے یا خود غرضوں نے اس خیال سے پیش بندی کر رکھی ہے کہ اگر کہیں یہ صاحب (ویلدر) کلکٹری پر پہونچ گئے تو اس (عبدالقادر) کا وجود ہماری خرابی کا باعث ہو جائے گا۔ ادھر ویلدر صاحب کے التفات کی نوبت اس درجہ ہوگئی تھی کہ کسی

---

[1] آج کل کرت پور ضلع بجنور سے متعلق ہے۔

حیلے سے میں رخصت بھی نہیں لے سکتا تھا۔

اسی عرصے میں میرے خسر کا انتقال ہو گیا میں سنبھل سے ایک دن کی اجازت لیکر مراد آباد آیا اور ایک عرضی لکھی کہ جب تک حضور والا کسی دوسرے عہدے پر ممتاز نہ ہوں مجھکو رخصت عنایت ہو تفصیلی وجوہ بیان کرنا نہیں چاہتا مختصر یہ کہ وہاں رہنا میرے آقا کے لئے فائدہ مند نہیں، دوسرے روز آقا بھی مراد آباد تشریف لے آئے اور اپنے خانساماں شیر علی کے ذریعے بندہ کو طلب کیا میں نے کہا کہ آقا لامحالہ مجھ کو اپنے ہمراہ لے جائیں گے اور ان کے اصرار پر میں انکار نہ کرسکوں گا نیز اسی طرح چلا جانا نہ اپنے لئے مناسب ہے نہ آقا کے لئے اور آج میرا ارادہ گھر جانے کا ہے، یہ کہکر میں وطن چلا آیا۔

یہاں (رامپور) ایک عجیب ہی انقلاب دیکھا کہ نواب نصر اللہ خاں کی وفات ہو گئی۔ نواب کفایت اللہ خاں نیابت کی اُمیدواری میں ٹامسن صاحب کے پاس اکبر آباد پہونچے اور میجر مراد صاحب اور انعام اللہ خاں برادر تفضل حسین خاں، نواب احمد علی خاں کے لئے خلعت مبارکباد لائے نیز کفایت اللہ خاں خلعت تعزیت نواب سعادت علی خاں کے دربار سے لے آئے نواب علی محمد خاں کا سارا خاندان شہر کے باہر خیمہ زن ہو گیا نواب احمد علی خاں کے ہوا خواہ "الحمد للہ علی احسانہ قد رجع الحق الی مکانہ" کا مضمون ادا کر رہے تھے:

قد صار ما خفت ان یکونا　　اِنّا للّٰہِ و اِنّا الیہ راجعونا

خوف تھا جس کا وہی لبس ہو گیا،　　ہے بطرف حق ہمارا لوٹنا

اسی حالت میں ڈاکٹر صاحب کا خط بطلب بندہ، کاشی پور سے آیا چنانچہ میں گیا اُنھوں نے پوچھا ویلڈر صاحب کے پاس پھر کب جاؤ گے؟ میں نے کہا جب تک صاحب لائنہ صاحب کے ساتھ ہیں میں نہیں جاؤں گا۔ فرمایا کارٹن صاحب نے لکھا ہے کہ دیناج پور میں خوش سیرت آدمی کی نایابی سے میں پریشان ہوں اگر اس (مولوی عبد القادر) کا ارادہ ہو جائے تو بڑی خوشی ہو گی میں نے کہا کہ میں سرکار کمپنی میں اس (ڈاکٹر صاحب) کی فرمائش سے سرتابی نہیں کر سکتا کیونکہ اسی کا دست گرفتہ ہوں اُنھوں نے فرمایا کہ میں لکھدوں گا اور جیسا کچھ جواب آئے گا تم سے کہدوں گا اس گفت و شنید کے بعد میں اپنے گھر آگیا اور زمانہ کی نیرنگیاں دیکھتا رہا اب چونکہ اس نواح کے چھوٹ جانے کا وقت قریب ہے لہٰذا کچھ مراد آباد کی کیفیت لکھتا ہوں:-

---

ہ جب ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں نواب نصر اللہ خاں کا انتقال ہو گیا تو ان کی بجائے انکے صاحبزادے کفایت اللہ خاں نے نائب ریاست ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہے

کیفیت مراد آباد:- یہ شہر شاہجہاں بادشاہ کے زمانے میں شہزادہ مرادبخش کے نام پر رستم خاں دکھنی نے آباد کیا ہے[1]۔ مشرقی و شمالی جانب دریائے رام گنگا ہے اور غربی جانب گانگن ندی، گانگن کا پانی رام گنگا سے بہتر ہے کثرت بارش کے زمانے میں پار کرنے کے لئے کشتی کی ضرورت پڑتی ہے رام گنگا آدھی سردیوں سے گرمیوں کے آخر تک پایاب رہتی ہے ان دنوں کے علاوہ گہری اور چوڑی (رہتی ہے) اور وہ (رام گنگا) رستم خانی قلعے کے نیچے بہ رہی ہے جس کی نام کے سواب نمود بھی باقی نہیں رہا ہے اس کی آب و ہوا رام پور سے بہتر ہے انگریزوں کے مکانات شہر سے مغرب کی جانب ہیں۔

وہاں (مراد آباد) کے رئیس، حافظ رحمت خاں کے چچازاد بھائی دوندے خاں کی اولاد میں ہیں جو ایک عرصے

---

[1] رستم خاں کا نام مقرب خاں دکھنی ۱۰۴۳ھ میں شاہ جہاں بادشاہ کی ملازمت میں شش ہزاری منصب پر سرفراز ہوئے رستم خاں خطاب پایا۔ شاہ جہان کے زمانے میں کٹھیریوں کے سردار رام سنگھ نے سر اٹھایا تو اس کی سرکوبی کے لئے رستم خاں کو سرکار سنبھل میں تعینات کیا رستم خاں نے راجا کو شکست دی راجا قتل ہوا اور اس کا قلعہ فاتح کے ہاتھ آیا رستم خاں نے پرانے قلعہ کو مسمار کر کے نیا قلعہ اور مسجد تعمیر کی اور اپنے نام کی رعایت سے اس کا نام رستم نگر رکھا رستم خاں نے شاہی ہدایات سے تجاوز کیا تھا اس لئے جواب دہی کے لئے دربار کی حاضری کا حکم ہوا جب رستم خاں سے نوآباد مقام کے نام کی بابت سوال ہوا تو اس نے فوراً کہا کہ میں نے شہزادہ مراد کے نام پر اس کا نام مرادآباد رکھا ہے چنانچہ اسوقت سے مرادآباد نام مشہور ہوا تقریباً ۲۵ سال تک سنبھل رستم خاں کی جاگیر میں رہا رستم خاں شجاعت و بہادری میں لاثانی، علم دوست اور درویش دوست تھا۔ دارالشکوہ کا طرفدار تھا اورنگ زیب سے جو معرکہ ساموگڑھ میں ہوا اس میں رستم خاں، اپنے فرزند رفعت خاں اور برادر زادہ عظمت خاں کے ہمراہ مقتول ہوا۔ قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

چوں بہادر رستم فیروز جنگ — عالمے در مدحت او لب کشود
در شجاعت رستم دستان عصر — در سخاوت حاتم آفاق بود
ترکتازی کرد در میدان ہند — سرخرو گشت و بجنت رفت زود
سال تاریخ وفاتش عقل گفت — برد رستم گوئے ز میدان جود ۱۰۶۷ھ

(۱) تاریخ امروہہ جلد اول از محمود احمد عباسی مطبوعہ دہلی ۱۹۳۰ء ص ۲۰۷، ۲۰۴۔ (۲) اخبار الصنادید جلد اول ص ۱۵۳، ۵۴ (۳) ماثر الامراء از صمصام الدولہ شاہنواز خاں (کلکتہ ۱۸۹۱ء) جلد دوم ص ۲۷۰، ۲۶۹ (۴) District Gazetteer of the United Provinces of Agra and Oudh vol XVI By H.R. Nevill, Govt. Press Allahabad 1911, PP 152, 153

تک وہاں کے مالک رہے ہیں اس سلسلہ میں نثار اللہ خاں ان کے نواسے اور اسد علی خاں ان کے بڑے لڑکے نواب محب اللہ خاں کے نواسے[1] ہیں۔
نواب عظمت اللہ خاں محمد شاہی کا خاندان بھی ہے جو لکھنؤ کے شیخ زادوں میں سے تھا اس سلسلے میں محمد الدین[2] احمد خاں عرف محمد میاں خوش خلق باادب متحمل اور مشہور ہے اور اس کا چھوٹا بھائی علی محمد خاں خوش رو، شاعر، منشی، خوش نویس اور پرہیزگار ہے اور علی الدین خاں (مولوی) حاجی رفیع الدین[3] خاں کا بھتیجا ہے کہ عطا حسین کی چہار درویش میں منثور کلام سب اسی کا لکھا[4] ہوا ہے تاریخ سے باخبر ہے یہ گروہ سلاطین کے زمانہ

---

[1] اسد علی خاں نواب محب اللہ خاں کے پوتے تھے نواسے نہ تھے سلسلہ یہ ہے اسد خاں ابن سیف اللہ خاں ابن محب اللہ خاں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اسد علی خاں اور ان کے صاحبزادے عباس علی خاں نے حصہ لیا۔ عباس علی خاں کو بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی عباس علی خاں کے ایک صاحبزادے مصطفٰے علی تھے (اخبار الصنادید جلد دوم ص ۴۹ و شجرہ خاندان نواب دوندے خاں بہادر (قلمی) مملوکہ ظہور النبی خاں مراد آبادی مقیم ٹیونیشیا لائن کراچی۔

[2] محمد الدین احمد خاں، نواب مجد الدین خاں عرف مجو خاں مراد آبادی کے والد ہیں نواب مجو خاں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ناظم مراد آباد مقرر ہوئے انگریزوں کے حلیف نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور نے ہر موقع پر مشکلات پیدا کیں جب مراد آباد پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا اور چند سپاہی نواب مجو خاں کو گرفتار کرنے گئے تو بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا آخر کچھ مدد اور پہونچی اور نواب مجو خاں کو گولی سے اڑا دیا گیا

(اخبار الصنادید جلد دوم ص ۸۹)

[3] رفیع الدین خاں ولد فرید الدین فاروقی معتبر فضلائے ہند سے تھے حدیث کا علم مولوی خیر الدین سورتی اور شاہ ولی اللہ دہلوی سے حاصل کیا۔ شاہ عبد العزیز دہلوی سے اکثر صحبت رہی شیخ محمد غوث لاہوری سے بیعت کی ۱۲۱۹ھ / ۱۸۰۴ء میں مراد آباد میں انتقال ہوا۔ خورشید زماں تاریخ وفات ہے صاحب تصانیف تھے۔ (حدائق الحنفیہ ص ۴۶۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۷ - ۱۹۸)

[4] عطا حسین خاں تحسین ساکن اٹاوہ کے والد کا نام محمد باقر خاں شوق ہے قصہ چہار درویش کو رنگین اور دقیق اردو میں لکھا اور نو طرز مرصع کے نام سے موسوم کیا تحسین انگریزی فوج کے سپہ سالار جنرل اسمتھ کے میر منشی ہو کر ان کے ساتھ کلکتہ گئے جب جنرل صاحب ولایت گئے تو تحسین پٹنہ آ گئے پھر وہاں سے فیض آباد پہونچے اور نواب شجاع الدولہ کے دربار سے متعلق ہو گئے تحسین خوش نویس بھی تھے۔

(۱) داستان تاریخ اردو، از حامد حسن قادری (عزیزی پریس آگرہ ۱۹۵۷ء) ۵۸۴ - ۶۰

(۲) اردو مخطوطات مرتبہ حامد اللہ ندوی (انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱۹۵۶ء ص ۴۸ - ۵۰)

سے اب تک ناظمانِ ملک کی نظروں میں معزز و محترم رہا ہے۔

ایک خاندان قاضی عبدالفتاح کا ہے جن کے نواسے قاضی حمایت علی عالم با عمل موجود ہیں۔

ایک قاضی منّور کا خاندان ہے، ولی اللہ اس کی یادگار ہے مگر تنگدستی میں گرفتار ہے۔

(اسی طرح) مفتی زادے ہیں جن میں میاں قاضی محمد بخش مشہور و معروف شخص ہیں ان کے لڑکے محمد حسین ذکی الطبع اور ہنرمند ہیں مفتی بولن کی اولاد میں سب پریشان روزگار ہیں اور محمد عاشق خاں کا خاندان ہے ان کی اولاد راحت و تنگی کی درمیانی زندگی گزار رہی ہے۔

قوم بھٹیوں کی ہے کہ بھٹی محلہ ان سے آباد ہے اور اپنی گروہ بندی کے زور میں کسی کے سامنے کم سر جھکاتے ہیں آج کل ہر ایک بتلاشِ روزگار کہیں کہیں گیا ہوا ہے۔

ایک خاندان مغلیہ ہے جو چنداں دست قدرت نہیں رکھتا ان لوگوں میں گوہر بیگ نامی مختلف دستکاریوں کا ہنر رکھتا ہے۔

ہندوؤں کی پوربیہ قوم کا ایک گروہ ہے جس کا پیشہ سپہ گری ہے بلی کے سامنے شیر اور شیر کے سامنے روباہ بازی میں دلیر ہے۔

ایک کلالوں[1] کی قوم کسرول (میں) ہے کہ فراش، چوبدار اور خدمت گار زیادہ تر اس نواح میں اسی قوم کے ہوتے ہیں، اور ان کاموں کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں اور خوب انجام دیتے ہیں کچھ لوگ ان میں سے مولوی اور منشی بھی ہو گئے

اس شہر میں ایک شخص سادہ کار کریم الدین[2] ریختہ میں بھی شعر کہتا ہے اور تضمین میں تو بے حد مہارت حاصل کر لی ہے دستکاری سے عین مناسبت ہے یورپین لوگ بھی اس کی فکر رسا کو پسند کرتے ہیں۔

---

[1] قوم کلال کا نسبی تعلق جیسوارہ راجپوتوں کی ایک گوت سے ہے جو کلال کے نام سے موسوم ہے

تحقیق الانساب از محمود احمد عباسی مطبوعہ جید برقی پریس دہلی ۱۹۳۲ء ص ۳۵۱

[2] کریم الدین صنعت کا انتقال ۱۳ محرم ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۸ء کو ہوا۔ قدرت اللہ شوقؔ کے شاگرد تھے ملاحظہ ہو

(۱) ریاض الفصحاء از غلام ہمدانی مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق دہلی ۱۹۳۴ء ص ۱۶۹، ۱۷۰ (۲) تذکرہ طبقات الشعراء ص ۴۱، (۳) گلشن بے خار از نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۰ء) ص ۱۲۶ - ۱۲۷ (۴) انتخاب یادگار ص ۴۲

حالاتِ امروہہ[1] :-

اسی نواح میں امروہہ کا علاقہ ہے شہر میں سادات، کبوہ، کائستھ، کلال، ٹنڈن، کھتری، تگا اور شیخ زادے ہیں مگر سردار، افسر، جاگیردار اور زمیندار حقیقت میں سادات ہیں دوسروں نے جو کچھ حاصل کیا ہے ان ہی سے حاصل کیا ہے اور دیہات (امروہہ) میں میواتی چوری، لوٹ مار، رہزنی، اور پاسبانی خوب کرتے ہیں اور گوجر زیادہ تر رہزنی، مویشیوں کی چوری اور جاٹوں کے گاؤں کی بربادی کا کام کرتے ہیں اور جاٹ بھی رہزنی کرنے اور گوجروں سے مڈبھیڑ کے عادی ہیں نیز راجپوت بھی کبھی کبھی غارت گری اور شب خون کر ڈالتے ہیں یہ سب کے سب اس زور طلب اور بداطوار پرگنہ کی رعایا ہیں اس کا سبب جیسا کچھ مجھے معلوم ہے ایک یہ ہے کہ یہ تمام قومیں فوجی مردم زادے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ جاگیرداروں کی رعیت رہے ہیں اسی حالت پر چند پشتیں گزر گئی ہیں۔

بیانِ سنبھل :-

سنبھل ایک بہت پرانا شہر[2] ہے اس میں نواب امین الدولہ[3] کا خاندان اور دوسرے انصاری حضرات میاں سرائے

---

[1] امروہہ ایک تاریخی بستی ہے حضرت سالار مسعود غازی کے مفتوحہ مقامات میں سے ہے علاء الدین شاہ دہلی بدایوں جاتے ہوئے امروہہ میں کچھ مدت مقیم رہا مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اس قصبہ کو "بلدۃ صغیرۃ حسنۃ" لکھا ہے، عہد اکبری کے مشہور عالم سید محمد میر عدل امروہہ ہی کے باشندے تھے۔ علم و فضل کے اعتبار سے یہ قصبہ ہمیشہ مشہور رہا ہے دورِ آخر کے سیاسی زعما میں نواب مشتاق حسین وقار الملک خاص طور سے قابل ذکر ہیں امروہہ کی مفصل تاریخ مولوی محمود احمد عباسی نے تین جلدوں میں لکھی ہے جو مطبوعہ ہے اسی طرح جمال احمد نقوی نے ایک کتاب تاریخ سادات امروہہ "شیعی نقطہ نظر سے لکھی ہے یہ کتاب اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن میں ۱۹۳۲ء میں طبع ہوئی [2] سنبھل حضرت سالار مسعود غازی کے مفتوحہ مقامات سے ہے نہایت قدیم تاریخی مقام ہے سکندر لودی چار پانچ سال تک سنبھل میں مقیم رہا۔ بادشاہ کی قدردانی کی بنا پر علماء و فضلاء مختلف دیار و امصار سے جوق جوق یہاں آئے۔ اور متوطن ہو گئے شاہ حاتم سنبھلی و شیخ پنجو مشہور بزرگ تھے بابر بادشاہ کے عہد میں ایک خوبصورت وسیع جامع مسجد تعمیر ہوئی ۱۵۲۶ء میں اس مسجد کے متعلق مسلمانوں اور ہندوؤں میں مقدمہ چلا جس میں مسلمان کامیاب ہوئے رستم خاں دکھنی نے سنبھل میں ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں عیدگاہ تعمیر کرائی سنبھل کی ایک تاریخ "احسن التاریخ سنبھل" کے نام سے غلام احمد سنبھلی نے لکھی ہے جو اہل سنت برقی پریس مرادآباد میں ۱۹۳۵ء میں طبع ہوئی ہے یہ کتاب چند سنی سنائی روایات یا ایٹلسوں کے انتخابات پر مشتمل ہے [3] ۱۰۹۵ھ/۱۶۸۵ء امین الدولہ ناظم سنبھل مقرر ہوئے اور ۱۶۹۳ء میں انتقال ہوا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مآثر الامراء (جلد اول) از صمصام الدولہ شاہنواز خاں (مترجمہ مرتبہ محمد ایوب قادری) (مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۸ء) ص ۳۵۲، ۳۵۳

یں ممتاز ہیں اور ترین سرائے میں قوم ترین کے پٹھان رہتے ہیں جن میں نواب امیر خاں[۵۱] صاحب عزت لوگوں میں سے ہیں دوسرا ایک گروہ ہے جو اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتا ہے بسبع العالم خاں مفتی کورٹ اپیل مرشد آباد جن کی وفات ہو گئی اسی قوم کے تھے اس پرگنے میں راجپوت بہت شورش رکھتے ہیں سہسوان اور اسد پور کے علاقہ میں قوم اہیر رہتی ہے نگینہ کی جانب بشنوئی رہتے ہیں قرآن شریف اور نماز بھی پڑھتے ہیں اور بت پرستی بھی کرتے ہیں مردے کو آگ کا داغ دے کر دفن کرتے کھانا نہ ہندو کے ساتھ کھاتے ہیں نہ مسلمان کے۔ ایک رسم ان لوگوں میں یہ ہے کہ تیل اور زرد چوبہ آگ پر رکھ دیتے ہیں۔ چوری، رہزنی اور کبھی کبھی غارت گری بھی کر لیتے ہیں۔ پرگنہ ٹھاکردوارہ اور کاشی پور میں اہیر، بھٹیہ، ہیری اور میواتی سب فساد پیشہ ہیں لیکن بنسبت امروہہ کے کم۔ دامن کوہ کی پاسبانی اہیر خوب کرتے ہیں۔

علاقہ مراد آباد اور رامپور کے زرعی و صنعتی حالات:۔

اب میں اس ملک کی زرعی کیفیت ظاہر کرتا ہوں، ٹھاکردوارہ، کاشی پور، رُدر پور، ریہڑ میں دھان اور غلہ خوب ہوتا ہے سرکڑہ اور روندہ کھوندہ میں ہر قسم کی زراعت کے قابل زمینیں ہیں امروہہ، سنبھل، چاند پور[۵۲] کی اراضی بارش زیادہ چاہتی ہے کرت پور میں گنا مراد آباد کے تمام پرگنوں سے بہتر ہوتا ہے اسی بنا پر بیگہ بھر گنے کا لگان آٹھ روپے ہے۔ اسی کے قریب منڈاور ہے جس کے گنے کا لگان فی بیگہ آٹھ آنے ہے اور نجیب[۵۳] آباد زراعت میں کاشی پور جیسا ہے نگینہ اس سے کم ہے شیرکوٹ[۵۴] اور شیوہارہ[۵۵] اوسط درجہ میں ہیں سہسوان[۵۶]

---

۵۱ یہ نواب امیر خاں بانی ریاست ٹونک کے علاوہ دوسرے شخص ہیں اس زمانے میں سنبھل میں نہایت معزز و معتقد رئیس اور با اختیار شخص تھے۔

۵۲ اردو زبان کے مشہور شاعر قائم، چاند پوری کے رہنے والے تھے دورِ آخر کے ایک مشہور عالم مرتضیٰ حسن (ف ۱۹۵۱ء) بھی اسی قصبے کے باشندے تھے

۵۳ نجیب آباد نواب نجیب الدولہ نے آباد کیا مسلمانوں کی مشہور بستی ہے آخر زمانہ میں مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (المتوفی ۱۹۳۸ء) مشہور مورخ گزرے ہیں۔

۵۴ مولانا مظہر الدین ایڈیٹر الامان و وحدت دہلی (المتوفی ۱۹۳۹ء) کا وطن ہے۔

۵۵ مشہور سیاسی زعیم مولانا حفظ الرحمٰن کا (ف ۱۹۶۲ء) وطن ہے۔

۵۶ سہسوان آج کل ضلع بدایوں کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے مشہور مردم خیز قصبہ ہے یہاں کے علما کے حالات میں ایک کتاب "حیوۃ العلماء" مولوی عبد الباقی سہسوانی نے لکھی ہے جو نول کشور پریس لکھنؤ میں ۱۹۳۲ء میں طبع ہوئی ہے اور ابھی حال میں (باقی صفحہ ۱۰۵ پر)

اسد پور، کنڈ رکی، چندوسی آپس میں یکساں ہیں مرولی بجوئی کی جمعبندی لاٹڈ صاحب کے بندوبست میں سنگین ہوگئی اس وجہ نے خرابی ہوئی ورنہ پیداوار کے اعتبار سے ناقص نہیں ہے۔

اس ملک کی عمدہ چیزیں یہ ہیں نہایت باریک اور خوبصورت مٹی کے برتن جیسے امروہہ کے کلال بناتے ہیں میں نے کہیں نہیں دیکھے ایک فرشی حقہ بنایا جاتا ہے کہ جب دم لگاتے ہیں تو پانی اندر بولتا ہے اور چھوڑتے ہی سارا پانی حقے کے نیچے تسلے میں جمع ہو جاتا ہے اور حقے میں سے نکل آتا ہے ہر دفعہ تازہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، سنبھل میں سبز رنگ بہت اچھا ہوتا ہے وہاں کے رنگریز ایک کپڑے کو دو طرفہ رنگ دیتے ہیں مرادآباد سے ظروف گلی رام پور کو تحفۃً لے جاتے ہیں۔

ٹھاکردوارہ اور کاشی پور میں بھٹیہ قوم جیب کاٹنے اور اچکے پن میں یکتا ہے ماہ چیت کی آٹھ تاریخ کے میلے میں یہ کام دن دہاڑے کرتے ہیں اس کام میں میں نے ان لوگوں کی طرح کوئی نہیں دیکھا ایک مدت سے میں اس ملک سے دور ہوں اس بیان میں، اگر کچھ فرق نکل آئے تو وہ نسیان کا مقتضیٰ ہے جو انسان کی سرشت میں ہے۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۰۴ سے آگے) مولوی نظر احمد افسوں سہسوانی نے ایک اور کتاب خزینۃ الانساب کے نام سے سادات سہسوان کے انساب پر مرتب کی ہے جو ۱۹۵۹ء میں نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوئی ہے۔

۵ سر رضا علی صاحب اعمالنامہ، کندرکی کے رہنے والے تھے

بَابُ دوم

سفر بنگال :-

اسی زمانہ میں ہمارے شہر (مراد آباد) میں جاڑے بخار کی شدت بہت بڑھ گئی میرے گھر میں بھی چھوٹے بڑے اور بچے بوڑھے سب ہی بیمار ہو گئے سوائے میرے، والد صاحب اور ایک دو اور کے، سب ہی اس مرض میں گرفتار تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے یاد کر کے ارشاد فرمایا کہ سفر خرچ لو اور چلے جاؤ یہ گفتگو نواب احمد علیخاں کے سامنے ہو رہی تھی کیونکہ صاحب ممدوح بریلی سے مراد آباد جاتے وقت ایک رات کے لئے، نواب صاحب کی خاطر سے رامپور میں ٹھہر گئے تھے وہیں مجھے بُلا لیا تھا میں نے منظور کر لیا، بہت اچھا کہہ کر کچھ دیر بیٹھا اور اٹھ کھڑا ہوا اور رخصت ہو کر گھر پہونچا، والد صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا اُنھوں نے سنکر فرمایا کہ اتنی دور دراز مسافت پر تجھ کو تنہا چھوڑنا گوارا نہیں مگر تو وعدہ کر چکا ہے اس لئے اس کا پورا کرنا ضروری ہے اب کوئی دوسری صورت اختیار کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

میں مراد آباد جا کر آزول صاحب سے رخصت ہوا اُنھوں نے فرمایا کہ میں کچھ عرصہ دیناج پور[1] میں رہا ہوں وہاں کی آب و ہوا بہت خراب ہے جہاں تک ممکن ہو کھانے پینے میں احتیاط کرنا۔ ڈاکٹر صاحب نے سفر خرچ دیا اور بنگال جانے کے ارادے سے میں پھر اپنے گھر آیا اور والد صاحب (ان کی روح خوش رہے) اور دوسرے بزرگوں سے اجازت حاصل کر کے بریلی گیا اور چھپرہ[2] کے لئے ایک کشتی جس کے ملاح وہیں کے تھے کرایہ کر لی اور چران چھپرہ پہونچکر پھر اسی کشتی کو گرہ گولہ تک کے لئے کرایہ پر رکھ لیا اتفاقاً کشتی بان اس خیال سے کہ ہوا موافق ہے غفلت کر گئے اور کشتی غلط راستے پر چلکر بانکول موتی ہاری پہونچ گئی جو پورنیہ[3] کے ضلع میں ایک

---

[1] دیناج پور بنگال کا ایک ضلع ہے۔

[2] چھپرہ بہار کا ایک ضلع ہے چھپرہ میں قصبات علی گنج ہدایاں، حسین گنج کھجوہ بھیکہ پور وغیرہ ذی اقتدار مسلمانوں کی قدیم بستیاں ہیں۔ (تاریخ جدید صوبہ اڑیسہ و بہار ص ۴۰۵)

[3] پورنیہ بہار کا ایک ضلع ہے۔

قصبہ ہے۔ ملاحوں نے کہا کہ اگر کہو تو کشتی کو کھینچکر گرہ گولہ پر واپس لیجائیں لیکن پانچ چھ روز میں پہونچ سکیں گے اور پھر کک بہلی کے ذریعہ یہاں سے آٹھ روز میں دیناج پور پہونچ سکتے ہیں میں یہ سنکر کشتی سے اتر آیا۔

کارواں سرائے (بانکول موتی ہاری) میں قیام:۔

بانکول موتی ہاری میں ایک مقام پر جو خالی پڑا تھا میں نے اپنا سامان رکھدیا لوگوں نے بتا دیا تھا کہ یہ کارواں سرائے ہے اور تھانے میں اپنے ایک ساتھی کو بھیجا تاکہ یہ کہے کہ پورنیہ تک سواری اور بار برداری کرایہ کرکے ہمارے ساتھ کردیں۔ وہاں پر نہ جمعدار تھا، نہ تھانیدار۔ دونوں محکمے کی طلبی پر پورنیہ گئے ہوئے تھے مجبوراً دیر ہو گئی وہاں پر ایک شخص آیا جس کی تنگ دستی اور عاجزی نمایاں تھی اور کہنے لگا کہ یہ مکان ہمارے ہی بزرگوں کا ہے اور مہمانوں کے لئے بنایا تھا جو کچھ میسر ہوتا تھا اس سے ٹھیرنے والوں کی مہمانداری کرتے تھے۔ میں نے نام پوچھا کہا "عبدالکریم" پھر وہ چلا گیا شام کے وقت سامان خورد نوش لایا اور کہا کہ اس معمولی کھانے کو قبول فرماکر احسان کیجئے میں پہلے سے سن چکا تھا کہ بارہ روپیہ سالانہ آمدنی کی زمین ہے اور ڈیڑھ روپیہ معلمی کی تنخواہ پر گزر اوقات ہے میں نے اس کو قبول کرنے سے عذر کیا اور کہا کہ مہربان کے مکان میں ہم لوگوں نے آرام پایا آپ کی اتنی ہی مہربانی کافی ہے اس سے زیادہ آپ کو تکلیف دینی مجھے گوارا نہیں میرے انکار نے اس کے اصرار کو اور بڑھا دیا رنجیدہ خاطر ہونے لگا کہ بزرگوں سے میں یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ میری غربت کی بنا پر مجھے کم حیثیت سمجھنے لگیں گے اور میری روکھی سوکھی روٹی سے احتراز کریں گے بالآخر میں نے منظور کیا اور کوئی ایسی صورت نہ بن پڑی کہ جس کے ذریعہ میں "حساب دوستاں دردل" کا مضمون سمجھ لیتا کیونکہ اس کا کوئی بچہ نہ تھا کہ مٹھائی کے بہانے میں اسے کچھ دے دیتا، بہرحال جو کچھ میرے پاس تھا میں نے سب اس کے سامنے رکھدیا کہ جو چیز اس میں آپ کی پسند ہو لے لیجئے اس نے کہا میرے کام کی ایک بھی نہیں۔ میں نے کہا کہ دیناج پور میں عہدۂ قضا جاری ہونے والا ہے اگر منظور ہو تو اس بارے میں کوشش کردی جائے۔ جواب دیا کہ میری بوڑھی ماں ہیں اور میرے سوائے کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں وہ مجھے چھوڑتی بھی نہیں جو میں کہیں چلا جاؤں، بیوی بچے میں رکھتا نہیں جن کی وجہ سے فکر معاش میں مجھے کہیں جانا پڑے۔ پھر کیا پڑی ہے جو سفر کی تکالیف اپنے اوپر برداشت کروں۔ اور دردسری سے زر حاصل کروں

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

رُباعی

درسال بہم رسد گر یک جامہ	چوں کعبہ گرامی شوی ای خوکامہ
لُنگی جو ملے سال میں ہو گرچہ وہ موٹی	کعبہ کی طرح دیکھ میری شان نہ چھوٹی
یک نان بدو روز گر بیابی بیتی	نام خود با پیغمبراں در نامہ
دفتر میں میرا نام پیمبر کے ہو ہمراہ	دو روز میں پاؤں اگر ایک ہی روٹی

القصہ عمر بھر میں اس جیسا تنگ دست اور دریا دل میں نے نہیں دیکھا اسی روز شام کو تھانے کا جمعدار پہونچا اور میرے پاس آکر کہا کہ گاڑی اور کہاروں کا ملنا دشوار ہے اگر کہو تو ماتھر بہت ہیں جو سواری اور بار برداری دونوں کا کام دیتی ہیں اور وہ باہم بندھی ہوئی موٹی، مضبوط اور لمبی دو لکڑیاں ہوتی ہیں ایک لکڑی ہو تو اس کو ڈونگی کہتے ہیں۔ کوئی بے سائبان کی ہوتی ہے اور کسی پر چھپر یا سی پڑی ہوتی ہے۔ وہ جمعدار اگرچہ تمبولی زادہ تھا اور کسی سپہ سالار کی سفارش سے اس مرتبہ پر پہونچ گیا تھا لیکن کلکتہ کے نئے مالداروں کی طرح اپنے آپ کو فراموش نہیں کیا تھا ناچار اس کے قول پر عمل کرنا پڑا اور پھر دریا میں کشتی ڈال دی اور تین روز میں پورنیہ پہونچ گئے۔

حالات پورنیہ :-

پورنیہ میں اینٹ اور مٹی کے مکانات بہت کم ہیں ٹین کے گھر کثرت سے ہیں جو دریا اس کے نیچے بہہ رہا ہے بدرنگ اور بدبودار ہے ہوا سربسر وبائی، بازار کے ہجوم میں جو شخص فیل پا، گلے پھولا اور کلاں خصیہ نہ ہو اگرچہ زرد رنگ اور بخار میں مبتلا ہو وہ تندرستوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

میں پورنیہ میں اُترا اور شاہ حسین رضا کے امام باڑے میں ٹھہرا اس مکان کا مہتمم میر کلن نامی خوش خلق، اور زندہ دل آدمی تھا میرے پاس آیا، کھانا لایا اور کہنے لگا کہ یہاں پر تین دن مہمانداری کا دستور ہے، میں نے کہا اس وقت تو بیشک منظور ہے دوسرے دن ضرورت نہیں۔

امام باڑہ ہندوستانی شیعوں کی ایجاد ہے کہ ایک جگہ ایسی بنا لیتے ہیں جہاں پر عشرہ محرم میں لوگ جمع ہو کر کتاب اور مرثیہ پڑھتے ہیں شربت اور کھانا تقسیم کرتے ہیں ماتم اور ہائے ہائے کرتے ہیں اور ایک مقام پر جھنڈے اور قبر کی شکل بنا کر رکھتے ہیں علمائے دین کے نزدیک بعض باتیں اس میں بدعت ہیں مثلاً اندھیری کوٹھری، سینہ کوبی، ڈھول بجانا اور قبر کی تصویر اور بعض باتیں گمراہی ہیں

یعنی قبر کے احکام اس پر جاری کرنا اور کچھ کفر کی رسمیں ہیں جیسے سجدہ کرنا اور حاجتیں مانگنا[1] اور کچھ اچھی باتیں بھی ہیں جیسے بزرگانِ دین کا ذکر کہ وہ باوجود اس قدر مصائب کے اپنے رویے پر ثابت قدم رہے، اور مساکین کو کھانا کھلانا اور مسافروں کی راحت رسانی۔

الغرض میں نے اپنے ایک ساتھی کو تھانے بھیجا جو وہاں کے افسر کا یہ جواب لایا کہ دو روز توقف کریں فوج کی روانگی کے بعد کہار اور گاڑی بھیجدوں گا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور چوتھے روز روانہ ہوگیا اور نینگر گاؤں میں پہنچکر ایک بنئے کی دکان میں رات گزاری اگلے دن سویرے ہی تاج پور بھوپلا پہونچا کوائف تاج پور بھوپلا :۔

لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں شہر تاجپور بھوپلا ہی تھا اور پورنیہ گاؤں تھا اب برعکس ہے کہ بہ نسبت پورنیہ تاجپور کوردیہہ ہے ؎

کوردیہے شہر گہ می شود		گاہ شہرے بدتراز دہ می شود

کوردیہہ گاہے معظم شہر ہو		اور کبھی شہر معظم کوردیہہ

ایک تنگ گلی میں وہاں کے بدمزاج چودھری کا ایک مسافرخانہ تھا لوگوں نے کہا کہ اگر تم خود کہو تو شاید ایک رات کے لئے کرایہ پر دیدے، میں نے اس کو بلایا وہ (چودھری) یہ کہتا ہوا فوراً واپس ہوا کہ میں اس گھر ہی کو جلادوں گا تاکہ بے ہودوں کی مانگ کی مصیبت سے چھٹکارا پاؤں میں مجبوراً ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گیا اور ساتھ والوں سے کہا کہ کچھ کھانے کا انتظام کریں۔ جو کچھ ہاتھ لگا تیار کیا اور وہیں برسرِ راہ نہ گھر نہ آرام گاہ، بازاریوں کی طرح چند لقمے زہرمار کئے اتفاقاً فرندس نامی فرانسیسی سوداگر کا گماشتہ شیخ نکھو وہیں رہتا تھا ازراہِ انسانیت میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ابھی آدھا دن اور پوری رات گزارنی ہے بہتر ہے کہ غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیں۔ میں نے اس کی بات مان لی اور آرام پایا۔

وہاں ایک عجیب حکایت سنی کہ کسی کاشتکار نے خواب میں دیکھا کہ مرغی نے دھان کی شاخ پر انڈا دیا ہے اور دھان کہتا ہے کہ جب میری ذات اس درجے پر پہونچگئی تو اب میں بنگال سے جاتا ہوں (کاشتکار

---

[1] مولانا حسن قنوجی المتوفی ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء (والد نواب صدیق حسن خاں قنوجی) نے بدعات محرم پر ایک مفصل اور مدلل رسالہ ہدایت المؤمنین ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء رقم فرمایا ہے یہ رسالہ طبع ہوچکا ہے ہمارے کتب خانہ میں اس کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں۔

کی آنکھ کھلی تو اس نے لوگوں سے خواب کہدیا سب گاؤں والوں نے یہی بہتر سمجھا کہ مُرغیوں کو ایک دم مار ڈالا جائے تاکہ دھان پریشان ہو کر ہماری سرزمین نہ چھوڑ دے اور دُنیا قحط سے نہ مرجائے دوسرے دیہات میں بھی خبر ہو گئی اور چند بدمعاش نا عاقبت اندیشوں[1] کے علاوہ کہیں مرغیوں کا نشان بھی نہیں رہا۔

اسی مجمع میں قصبے کے قاضی بھی تھے میں نے ان سے پوچھا کہ آپ بھی ان باتوں کا یقین کرتے ہیں؟ کہنے لگے الحمدللہ میں مسلمان ہوں ایماندار، ایسی چیزوں کا انکار کیسے کرسکتا ہوں جن پر سب لوگوں کا اتفاق ہو۔ میں نے خاموشی ہی میں اپنی نجات دیکھی۔ صبح کو چندریا پہونچا اور اگلی صبح کو دیناج پور۔

کلکٹر دیناج پور سے ملاقات:۔

دیناج پور شہر میں بھی پورنیہ کی طرح اینٹ اور مٹی کی عمارتیں کم نظر آئیں لیکن دریا کا پانی خراب تھا پوچھتا پوچھتا کلکٹر صاحب کی کوٹھی چلدیا دری خانہ (ڈرائنگ روم) میں پہونچکر نظامت، جمعدار سے میں نے کہا کہ صاحب کلکٹر سے میرا نام اور پتہ دے کر کہدو کہ در دولت پر حاضر ہے اور اسے کیا حکم ہے؟ جمعدار نے عرض کی اور اگر مجھے لے گیا۔ میری باریابی حضور میں ہوئی نوکروں کے مرتبے سے زیادہ نوازش ہوئی اور ارشاد ہوا کہ مجھکو اتنی جلدی تمہارے پہنچنے کی اُمید نہ تھی اسی سوال وجواب میں کچھ وقت گزر گیا اور میں رخصت ہوا۔

جمعدار کو حکم ہوا کہ کہیں آرام کی جگہ اُنھیں ٹھہرا دو نُصرت حسین ندیا کے باشندے نے مجھے دیکھ لیا اور دفتر سے اُٹھکر میرے ساتھ ہولیا، ایک مکان اپنے گھر کے پہلو میں مجھے دکھا کر کہا کہ سردست یہیں آرام کرو اس کے بعد جو پسند خاطر ہو۔ میں غنیمت سمجھ کر وہیں ٹھیر گیا۔

دوسرے دن قاضی دلاور علی جو ہندوستان کے باشندے تھے اور عدالت میں صدر امینی کا کام کررہے تھے اور میر ببر علی عظیم آبادی سررشتہ دار رجسٹری اور مولوی آصف علی بردوانی مولوی عدالت اور شیخ خدابخش کلکتوی قائم مقام سررشتہ دار مجھے دیکھنے آئے اگلی صبح کو میں بھی بازدید کے لئے گیا۔ اگرچہ قاضی اور مولوی دونوں بظاہر خوش خلق تھے مگر اہل معاملہ قاضی کی دیانت کے بہت مدّاح تھے اور میر ببر علی شیعہ مذہب اور صُلح کُل کا طرز رکھتے تھے۔ شیخ خدابخش چالاکی اور فریب کاری میں مشاق تھا۔ لیکن انگریزی عملے کے دوسرے بہت سے مسلمانوں کی طرح کسی کام کے کرنے، نہ کرنے کا پابند نہ تھا۔ وہاں کا جج لسٹر صاحب تھا، کلکٹر میرا آقا اور رجسٹرار فرنج صاحب

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنی مُرغیوں کو ختم نہیں کیا اور وہ اس توہم پرستی سے متاثر نہیں ہوئے ان کو ان الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

تھا۔ مقدمات میں روبکار لکھنے کا دستور ان صاحبوں میں نہ تھا بلکہ فارسی میں خطوط لکھے جاتے تھے یہ طریقہ ہائل صاحب نے جو نمائش پسند تھا جاری کیا تھا لیکن لسڑ صاحب اور میرے آقا نے اس بدعت کو ختم کردیا۔ اور وہاں پر ایک ڈاکٹر تھا جس کا میں نام بھول گیا کسی کو میں نے اس سے خوش نہ پایا بلکہ سب رنجیدہ تھے مسافروں پر بھی بے جا حکومت کربیٹھتا تھا اور خواہ مخواہ جھگڑنے لگتا تھا۔

ہندو زمیندار کی ملازمت:۔

وہیں ایک راجا رادھاناتھ نامی بہت بڑا زمیندار رہتا تھا وہ مرا اور ایک مُنہ بولا لڑکا چھوڑا جس کی عمر بہت کم تھی سرکار نے حسب دستور اس کی جائداد کو "کورٹ آف وارڈس" کے ماتحت کردیا کارکنوں نے اپنے گھروں کی آبادی اور اس گھر کی بربادی کرڈالی ان کارکنوں میں ایک شخص کشن کنت رائے تھا جو اسی زمیندار کا ہم قوم تھا دوسرا اباب اللہ جو پہلے راجا کی سرکار میں سائیس تھا اور پھر کلکٹری میں ناظر ہوگیا تھا۔ راجا کی زمینداری نیلام پر چڑھ گئی اور اس شخص نے کم داموں میں خریدلی۔ اس وقت رام سنگھ نامی مختار تھا، اگرچہ وہ شخص شریر نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسی شخص کے سبب یہ زمینداری کورٹ آف وارڈس کے قانون کے ماتحت آئی ہے اور ریاستِ راجا کے لئے فائدہ مند تھی۔ میں مسکین نابالغ بچہ پیر نابالغ کا کارکن ہوگیا آمدنی سرکار میں جمع ہوجاتی۔ مالگذاری داخل خزانہ ہوجاتی اور بقیہ آمدنی سرکار میں امانت رہتی اور مستحقین میں سے ہرایک کو خرچ کے مطابق دے دیا جاتا۔ میرے آقا نے راجا کے بالغ ہونے تک کے لئے صاحب عدالت سے مشورہ کر کے اور کورٹ کی تحریری منظوری لیکر بابو پران کشن نامی کو جو راجہ کا ماموں تھا ولی مقرر کردیا یہ شخص نہایت دانشمند اور کام میں ہوشیار تھا راجا کی فلاح و بہبود پر کربستہ ہوگیا۔

وہاں کا ایک طریقہ اور تھا کہ داخل خارج کے وقت صاحب کلکٹر کی جانب سے دخل دلایا جاتا تھا اور محکمہ امانت کا یہ سررشتہ تھا کہ یہ کام فروخت کرنے والے کا ہے نہ کہ گواہ کا۔ اگر کلکٹر بیچے تو البتہ اس کو یہ حق حاصل ہے ورنہ زمینداری کو ایک کے قبضہ سے نکال کر دوسرے کے نام لکھنا اور اپنے دستخط کرنے کے علاوہ جو درحقیقت فریقین کے اقرار پر گواہی ہے اور کچھ نہیں کرسکتا شاید کسی سادہ لوح حاکم کے زمانے میں عملہ کے لوگوں نے یہ قانون تجویز کرالیا ہوگا میرے آقا نے یہ طریقہ جائز نہ رکھا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مسماۃ دیا کنور کی زمینداری کا قضیہ :-

مسماۃ دیا کنور کا شوہر بہت سا روپیہ اور جائیداد چھوڑ کر مُرشدآباد میں مرگیا یہ عورت بہت کم سن اور حسین تھی انگریزی سرکار نے کورٹ آف وارڈس کے قانون کے مطابق اس کے باپ کو اس کی تولیت سپرد کردی۔ باوجودیکہ وہ اٹھارہ سال کی ہوگئی لیکن باپ نے روپیہ کے لالچ میں سرکار میں اس کی اطلاع نہ کی دو سال یوں ہی گزر گئے طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ کلکٹر صاحب نے صاحبان کورٹ کی منظوری پر جن کا سر دفتر ایک صاحب تھا اس عورت کی بلوغیت کا خیال کئے بغیر، پدم لوچن نامی شخص کو وہ جائداد پنجسالہ پٹے پر دے دی اسی اثنا میں وہ کسی حیلے سے باپ کی قید سے نکل کر دیناجپور آگئی اور اپنی روداد لکھ کر کلکٹر کو پیش کی انصاف پسند کلکٹر نے جب اس کی عمر کا اس تحریر سے اندازہ لگایا جو اس کے باپ اور شوہر کے وارثوں نے شوہر کی وفات کے دن دفتر میں لکھائی تھی تو انیس سال برآمد ہوئے کلکٹر نے یہ چاہا کہ تیس ہزار روپیہ اس کی زمینداری کی آمدنی کا امانت سے نکال کر اس کے سپرد کرے لیکن ولی نے اس کی نادانی ظاہر کی اور کورٹ آف وارڈس نے معتمد لوگوں کے ذریعہ اس کے بالغ ہونے کی شہادت لیکر کلکٹر صاحب کے پاس روبکار بھیجا۔ کلکٹر نے کورٹ کو اطلاع دے کر روپیہ اس کو دے دیا اور اس کی خودمختاری کا حکم دے کر یہ چاہا کہ وہ عورت زمینداری پر بھی قبضہ کرے لیکن ٹھیکیدار مانع ہوا۔ کلکٹر صاحب نے بورڈ کو لکھا، حکم ملا کہ یہ صورت سابق کلکٹر کی غفلت اور دفتر والوں کی سستی سے پیش آئی ہے اب ٹھیکیدار کو سمجھا کر زمینداری اس کے ٹھیکے سے نکال لی جائے یا مالکہ سے کہا جائے کہ ٹھیکے کی میعاد تک ٹھیکے کی رقم سرکار سے وصول کرلیا کرے کلکٹر صاحب نے غور کر کے ایک صورت نکالی اور ٹھیکدار سے کہا کہ اب تک ٹھیکے کی رقم تم خزانچی کے پاس پہنچاتے تھے اب دیا کنور کے پاس پہنچایا کرو اور اس کو سمجھایا کہ خام تحصیل کا کام عہد بندی (یعنی پنجسالہ ٹھیکہ) کے ساتھ دشوار ہے ایسا نہ ہو کہ تمہیں ناتجربہ کاری کی بنا پر نقصان اٹھانا پڑے اس مدت میں کہ ابھی دو سال ہیں تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ٹھیکیدار کو کتنی گنجائش ہے اور اگر کوئی دوسرا اضافے کی درخواست دے دے گا تو اس وقت تمہارا قبضہ بھلائی کا سبب ہو جائے گا۔

چند دوسرے واقعات :-

نیرہں پر (دیناج پور) ایک مشہور بزرگ کے مزار پر ایک ہفتے تک عرس کا مجمع ہوتا اور ہر ایک خوانچہ فروش کو پروانہ ہفت روزہ دیا جاتا تھا کبھی چالیس روپئے، کبھی پچاس روپیے اس کا ٹھیکہ ہوتا تھا ساٹھ روپے

سے کبھی آگے نہ بڑھا۔ اس مرتبہ کئی آدمیوں نے تھوڑے تھوڑے روپیے کے فرق کے ساتھ درخواستیں دیں سر رشتے کے کارکنوں نے اُس شخص کی درخواست منظوری کے لیے پیش کر دی جس کی رقم سب سے زیادہ تھی دور بین اور معاملہ فہم صاحب نے فرمایا کہ سب کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے اور یہ اطلاع کر دی جائے کہ جو کوئی زیادہ رقم منظور کرے گا اور مناسب طریقہ سے ادا کرے گا اس کی درخواست منظور کی جائے گی اس تدبیر سے سات سو روپے تک نوبت پہونچ گئی اور ضمانت اپنے ذمہ کر لی۔

وہاں پر پوست کی زراعت جس سے افیون حاصل ہوتی ہے ممنوع تھی اور اس کام پر بہت سے آدمی مقرر تھے مگر کوئی بند و بست نہ ہوتا تھا صاحب کے حسن تدبیر سے گھر کے باغیچوں میں بھی اس کا اثر نہ رہا صورت یہ ہوئی کہ لسٹر صاحب نے صدر کی اجازت سے تھانے کے پیادوں کا ماہانہ چار روپئے کر دیا پہلے تین روپیے پا رہے تھے۔

لوہاروں اور سناروں کو اس دستور کے مطابق جو اس زمانے میں وہاں مروج تھا سندیں دیں چونکہ سر رشتے کے محرر روزمرہ کے معمولات کے ساتھ اس کام کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ صاحب ممدوح نے اجازت دیدی کہ درخواست والے اپنی سندیں بموجب اشتہار لکھالائیں سر رشتے میں مقابلے کے بعد دستخط کر کے دیدی جائیں گی بیروزگار لوگوں نے اس مزدوری سے بیحد فائدہ اُٹھایا کہ ایک سند کی لکھائی پانچ پانچ روپیے لے لیتے تھے لوگ اس کاروبار میں منشی غلام امام سر رشتہ دار فوجداری کی شرکت کا گمان کرتے تھے اور ڈاکٹر نے صاحب عدالت تک یہ بات پہونچا دی مگر ثبوت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔

مائل صاحب نے گواہوں کے اظہار لینے کا ایک عجیب طریقہ جاری کیا جو کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتا یعنی آدھے قد آدم ایک تپائی رکھی ہوئی تھی اس پر چڑھ کر گواہ شہادت دیتا تھا اور روبکار میں اس کا یہ سبب لکھوا رکھا تھا کہ اس ملک کے لوگ ایمان نہیں رکھتے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اس جگہ پر جب گواہ کھڑا ہوگا تو حاکم کے سوال پر یا تو جھوٹا آدمی رعب میں آکر سچ بولے گا یا لرزہ براندام ہو کر گر پڑے گا یہ نکتہ جو صاحب ممدوح کے خیال میں آیا تھا اگر صاحبان کونسل کے دماغوں میں آجاتا تو لوگوں کو درباری طریقہ سکھانے کا نیاز مند ہونا پڑتا۔ لیکن خداوند عالم مخلوق کا نگہبان ہے۔

نماند و ماند بسے بر زبان	زنیک و بد داوراں داستاں
رہے داستاں بس ہمیشہ زبان پر	رہیں گے نہ حاکم بد و نیک یاں پر

مکن انچہ خواہی کہ ماند نہاں — کہ ناکردہ پنہاں بود از کساں
جو چاہے کہ مخفی رہے ہر کسی سے — نکر اس کو ہرگز نہ سنا کسی سے
چو کردی بہ پوشیدن آں مکوش — بگفتار دانشوراں دار گوش
کیا جس کو تو نے اسے مت چھپانا — نصیحت یہ تجھکو ہے دانشورانہ
کہ پنہاں کنی تخم در کشت زار ، — شود آشکارا چو آید بہار
چھپایا ہے کھیتی میں جس بیج کو — بہار آئے گی جب وہی کاٹ لو

دیناج پور کے عام حالات :۔

اب کچھ وہاں کی سرزمین کی حالت بیان کرتا ہوں اس کے بعد فرید پور کی طرف آؤں گا۔ عورتوں کا لباس ناف سے گھٹنے تک ریشمی ، سینہ کھلا ہوا ، کمر بالوں سے ڈھکی ہوئی بہترین آنکھوں والی ، نہایت شوخ چشم ، ان کے شب دراز بال ، بناگوش کی سفیدی صبح کا مقابلہ نہ کر سکے ، شیر خوار بچے کو کام کے وقت ایک رسی میں کمر سے باندھ لیتیں کپڑا موجود ہونے کی صورت میں بھی تمام بدن چھپانا پسند نہ کرتیں ، بایں ہمہ دور کے باشندے (مسافر) کی بیحد تعظیم کرتیں اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا اس کے سامنے لا رکھتیں۔ اگر وہ اس کو قبول کر لیتا تو اس کی خوبی شمار کرتیں اور اگر صرف خورد و نوش پر اکتفا کر لیتا تو اس کا بھی ان پر کوئی بار نہ تھا بلکہ زندگی بھر اس کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں ۔ دیناج پور کے ضلع کی رنگین ریشمی ساڑیاں دور دور مشہور ہیں ، اور بوریا بھی ستیل پاٹی کو شہ ماتا ہے

شیر پکڑنے والے شیروں کے اتنے سر کلکٹر کے پاس لاتے تھے کہ گویا شیروں کا ریوڑ کا ریوڑ ان کے قبضے میں ہے۔ شیروں کے مارنے کا یہ طریقہ ہے کہ ایک باریک تاگا تیر کے پچھلے حصے میں باندھتے اور اگلے حصے میں گوشت کا ٹکڑا لگا دیتے اور اس جھاڑی کے قریب جہاں درندے کے پیروں کے نشان ہوں کمان میں لگا کر اس تاگے کے ذریعے ایسا کھینچ دیتے ہیں کہ ذرا سی حرکت سے تیر چھوٹ جائے جب شیر گوشت کھینچے گا فوراً تیر سے زخمی ہو جائے گا لوگ اس کی موت کا انتظار کرتے ہیں اور مرنے کے بعد اس کا سر کاٹ لاتے ہیں۔
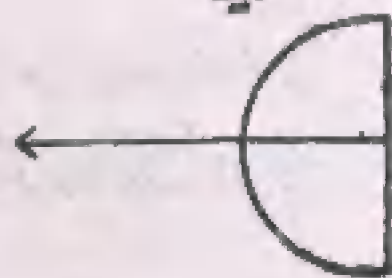
پورنیہ میں بیدری کا کام خراب نہیں ہوتا لیکن اصل اور نقل میں بہت بڑا فرق ہے نیزے کا بانس بھی اچھا ملتا ہے غلیل چلانے والے بھی اس کو پسند کرتے ہیں اور دور دور تحفے میں لیجاتے ہیں۔

کوائف مالدہ:۔

اب میں اصل مقصد کی طرف آتا ہوں ایک دن میں آقا کے پاس تھا کہ فمل صاحب کا حکم صدر پہنچا کہ ان کی بجائے لیک صاحب آتا ہے اور وہ جلال پور کے ضلع میں فرید پور کی کچہری میں عدالت کے کام پر جائینگے ان ہی ایام میں لسٹر صاحب چھپرہ کے جج ہو گئے۔ یہاں پر جج اور کلکٹر آجانے کے بعد میرے آقا اور لسٹر صاحب نے سفر کی تیاری کی نئے جج کا نام ہاویل تھا میں پہلے مالدہ کو روانہ ہوا تاکہ وہاں کے لئے کشتیاں کرایہ کرلوں، گاڑیوں پر سامان لدوادیا اور انگریز بازار میں جو مالدہ اور اس دریا کے بیچ میں ہے ایک جھونپڑے میں آٹھیرے وہیں ابریشم کی سرکاری تجارت کا مہتمم چسٹر صاحب رہتا تھا۔ اور میرے آقا سے واقف تھا ہم روزانہ صاحبوں کا انتظار کرنے لگے آخر وہ آگئے اور کشتیوں کو پسند کیا۔ لسٹر صاحب کے ساتھ منشی غلام امام بھی استعفادے کر آگیا میں اس کو دیکھکر خوش ہوا کیونکہ پہلی ہی ملاقات سے وہ اپنے آپ کو چھوٹے بھائی کے مرتبے میں سمجھتا تھا البتہ میرا آقا دو روز پہلے آگیا تھا لسٹر صاحب اور یہ دونوں چسٹر صاحب کے مکان پر ٹھیرے تین روز قیام کیا۔ دریا کی گہرائی وہاں پر کم تھی ایک روز ابریشم کا کام دیکھنے دریا پار مالدہ پہونچا۔

ریشم کے کام کو میری طبیعت نے پسند نہ کیا کیونکہ ریشم کے کیڑے جو کسی کو نہیں ستاتے نہایت بیدردی سے روزانہ بے انتہا مارے جاتے تھے صورت یہ ہوتی کہ ایک دیگچے میں پانی بھر کر چولہے پر رکھا جاتا اور نیچے آگ جلائی جاتی جب پانی گرم ہو جاتا تو اس کیڑے کے منہ کا ایک تار ہاتھ میں پکڑ کر اس کو گرم پانی میں ڈال دیا جاتا جب کیڑا اس تار کے ذریعہ ہاتھ پر آجاتا تو تار کو ہاتھ پر لپیٹ کر ہاتھ جھٹک دیا جاتا وہ بیچارا پھر منہ سے تار نکالتا ہوا اس کے ہاتھ تک آجاتا وہ سنگ دل پھر ویسے ہی کرتا یہاں تک کہ اس کی جان ہی جاتی رہتی۔

برآید چو ابریشمش از دہن	کرم پیلہ را جاں رود بے سخن
بناتا ہے منہ سے جو ریشم کو کیڑا	مرے وہ بلا سے ملے تمکو کپڑا
بود این آنکس کہ دارد نہاں	ہنر ہائے خود راز چشم کساں

وہی شخص دائم امن سے رہے گا ہنر کو جو اپنے نہ ظاہر کرے گا
ببیں و بدان و بسنج و بجن کہ کردار نیکو بہ است از سخن
سمجھ بوجھکر کام اچھا کرو کہ باتوں سے بہتر ہے کار نکو

مالدہ وہ شہر ہے جہاں کا آم سب جگہ سے بہتر ہے اور وہ کپڑا جس کو مالدہی کہتے ہیں اس کا تانا ریشمی اور بانا روئی کے سوت کا ہوتا ہے تاجر لوگ دور دور لے جاتے ہیں کرم پیلہ کو شہتوت کے درخت پر پالتے ہیں، وہ اس کے پتے چاٹتا رہتا ہے جب کوئی خریدار آتا ہے تو بیچ ڈالتے ہیں۔

بگفتند مردم کہ مردانِ راہ نجویند بہر خورش جز گیاہ
سُنا ہے مسافر نہ ہرگز تلاش بجز ساگ کرتا ہے تھوڑا سا آش
رہ رستگاری گر ایں ست و بس بجز گاؤ خر مردہ رہ نیست کس
اسی پر اگر بس کفایت رہے ذبیحہ کی ہرگز نہ حاجت رہے
دگر گفت برگِ درختاں خورند بگفتم نہ زاد کرم پیلہ اند
درختوں کے پتے کسی نے کھلائے کہا میں وہ ہیں کرم پیلہ کے جائے
شکم را بدہ ہر چہ آید ز پیش بیادِ خدا تازہ کن جان خویش
بھر دپیٹ جب تمکو حاجت پڑے بیادِ خدا جان تازہ رہے،

اس شہر میں پیشہ ور اور تاجر لوگ بہت ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ندی میں جس کو بنگالی زبان میں بگودار کہتے ہیں طغیانی ہوئی اور گاؤں میں پانی پھیل گیا۔ وہاں دفینہ تھا جو لوگوں کو مل گیا اور گاؤں کو آباد کر کے مالدہ نام رکھدیا۔

الغرض ہم کشتی پر سوار ہوئے کوچ اور پڑاؤ میں بھگوان گولہ تک لسڑ صاحب نے مغرب کا راستہ لیا اور ہم نے مشرق کا۔ ایک دن زمین میں زلزلہ آیا۔ پانی بھی ہلا۔ ہم چلتے چلتے فریدپور پہونچ گئے۔

حالات فریدپور:۔

فریدپور میں مارس صاحب رجسٹرار عدالت کا کام کرتا تھا اور سر من برٹ، ڈھاکہ کا سینیر جج اپیل سنتا تھا۔ اور وہاں کا اجنٹ دورہ میں تھا اس کے ساتھ مولوی علی[1] نقی تھے جو قاضی ذکی الطبع خوش تقریر و تحریر،

---

[1] تواریخ ڈھاکہ ص ۱۸۵

صاحب سلیقہ، نظم ونثر سے آشنا اور امور معیشت میں یکتا تھے اور حسنو میاں تھے جن کا لقب دیوان غلام رسول تھا میدنی پور کے رہنے والے تھے فارسی زبان کے شاعر تھے دونوں شخص عدالتوں کے سررشتہ دار تھے، کفایت اللہ ناظر اور محمد آصف فیصلہ نویس تھے محمد آصف نہایت خوشخط، شفیعا اور شکستہ بہت خوب لکھتے تھے منشی نثار اللہ کے داماد تھے جو بنگال میں خط شفیعا کے خوش نویس تھے اور بشارت کو قوالی کا کام انجام دیتا تھا۔

وہاں (فریدپور) کی آبادی غالباً میل کے سولھویں حصہ سے زیادہ نہ ہوگی اس کے نیچے ایک ندی جو ڈھول سمندر کے نام سے مشہور تھی بہہ رہی تھی پانی اس کا خوشگوار اور ہلکا تھا اس سرزمین کے مکانات سب چیزوں کے تھے کچہری کی عمارت بھی ویسی ہی تھی صاحب رجسٹرار چند روز کے بعد دوسری جگہ چلے گئے اور وہاں پر مسٹر لنڈ صاحب کو لبرک صاحب کا اکلوتا (فرزند) پہونچگیا، اور سررشتہ دار نے بھی اس ڈر سے کہ لوگ نالش نہ کردیں استعفاء دے کر گھر کا راستہ لیا۔ کالی شنکر کے وکیل حسن الدین نے جو موکل کا نعم البدل تھا سررشتہ دار کو بہت کچھ تسلی دی مگر کارگر نہ ہوئی۔

مسٹر لنڈ صاحب کو سنسکرت کا بیحد شوق تھا ایک پنڈت بھی اس کے ساتھ تھا ایک دن مجھ سے فرمایا کہ مجھے اُردو زبان سیکھنے کی بے حد تمنا ہے لیکن نہ معلوم یہ آرزو کب پوری ہو کیونکہ مغربی ہندوستان (نواح دہلی) میں اپنا جانا معلوم نہیں ہوتا۔

میرے آقا نے پہلے پلٹن کے سپاہیوں کی زیادتی کا انتظام کیا کیونکہ بہلاج سپاہیوں پر کی ہوئی نالش پر خود غور نہیں کرتا تھا بلکہ صوبیدار کو سپرد کر دیتا تھا کارٹن صاحب نے صوبیدار کو اجلاس میں بُلا کر فرمایا کہ تین کاموں میں سے ایک پسند کرلو یا تو ایسا بندوبست کرو کہ سپاہی پر نالش کی نوبت ہم تک نہ پہونچے یا جواب دہی اپنے ذمہ کرلو کہ سپاہی کے قصور کی بازپرس تم سے کی جائے یا سپاہی کو فیصلہ کے لئے ہمارے پاس بھیجدیا جائے اور اس کا خیال نہ کریں کہ ہر غریب عرضی کے کاغذ کی قیمت کہاں سے لائے گا۔ میں نے اسٹامپ فروش کو اجازت دے دی ہے کہ جو کوئی سپاہی پر استغاثہ دائر کرے اس کو کاغذ دے دیا جائے اور اس کاغذ کی قیمت میری تنخواہ سے محسوب کرلی جائے ایسے مستغیثوں کے لئے چھ ماہ تک اسٹامپ کی

ھ تاریخ ڈھاکہ ص ۱۹۶

معافی میں نے کورٹ کو لکھدی ہے اگر ان تینوں میں کوئی تجویز بھی منظور نہ ہو تو اپنے افسر اجنٹن صاحب بہادر کو لکھیں اور ایک ہفتہ کے اندر جواب یہاں لائیں ورنہ یہ حکم جاری ہو جائے گا کہ سپاہی مجمع عام میں سزائے بدنی پائے گا۔ یہ حکم دے کر فرمایا کہ اب جاؤ چونکہ صوبہ دار سمجھتا تھا کہ افسر باضابطہ منصف ہے لکھنا مناسب نہ سمجھا اور سپاہیوں کو تاکید کردی کہ رعایا پر ظلم نہ کریں۔

امیر خاں والی ٹونک کا ایک واقعہ :-

اگرچہ اجنٹن صاحب سے بندہ کی ملاقات نہیں ہے لیکن اس کا حال خوب جانتا ہوں جس زمانہ میں[1] کورٹنڈن صاحب بہادر کپتان نظامت تھا صاحب ممدوح اجنٹن تھا ہلکر کے ہنگامے[2] میں کپتان صاحب میرٹھ چلے گئے اور اجنٹن صاحب کو مراد آباد چھوڑ گئے اچانک ہرکارے نے خبر دی کہ امیر خاں[3] کا گانگن[4] کی طرف رُخ ہے لسٹر صاحب میرسے صاحب اور بلبن صاحب (لسٹر صاحب کا بھانجہ) سوار ہو کر گانگن کی جانب چلدیئے۔ سواروں کا

---

[1] ۱۸۰۵ء مراد ہے۔

[2] جس وقت راؤ ہلکر کا فرخ آباد کے قریب فتح گڈھ میں انگریزوں سے مقابلہ ہوا انگریز فتح یاب ہوئے ہلکر سیدھا بھرت پور پہونچا راجہ رنجیت سنگھ والئی بھرتپور نے ہلکر کی ہمت بندھائی اور اس کی مدد کے لئے ڈیگ پر راجہ بھرتپور نے توپ خانہ اور لشکر بھیجا انگریزوں نے یہ سُنکر ڈیگ کے قلعہ پر حملہ کردیا اس خبر کو سُنکر امیر خاں اپنے سب سواروں کو لیکر ہلکر سے آملے انگریزوں نے بڑی سختی سے محاصرہ جاری رکھا ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ نواب امیر خاں انگریزوں کے علاقے میں جاکر گڑبڑ کریں تاکہ انگریز پریشان ہو کر محاصرہ اُٹھالیں۔ (اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۲۰۲)

[3] امیر الدولہ امیر الملک نواب محمد امیر خاں بہادر شمشیر جنگ والی ٹونک قصبہ سنبھل ضلع مراد آباد میں ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء میں ایک معمولی سپاہی محمد حیات خاں کے گھر میں پیدا ہوئے محمد حیات خاں کے والد کا نام طالع یار خاں تھا طالع یار خاں نواب علی محمد خاں والی روہیل کھنڈ کے لشکر میں سپاہی تھے۔ طالع یار خاں کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا محمد حیات خاں اپنے باپ طالع یار خاں کے انتقال کے وقت خورد سال تھے نواب دوندے خاں نے ان کی پرورش کے لئے وظیفہ مقرر کردیا سنبھل کے محلہ سرائے ترین میں رہتے تھے نواب امیر خاں سنبھل میں پیدا ہوئے ماں باپ کی مفلسی کی وجہ سے خاطر خواہ تعلیم و تربیت نہ ہوسکی جب نواب امیر خاں کی عمر ۲۰ سال کی ہوئی تو تلاش روزگار میں نکلے، اپنی بہادری، دلاوری، تہوری اور شجاعت کا دُنیا پر سکہ بٹھادیا اور ریاست ٹونک کے مالک ہوئے سترہ سال تک ٹونک میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ایک رحمدل، خدا ترس، علم دوست اور جواد و سخی حکمراں کی حیثیت سے حکومت کی ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء میں وفات پائی (نواب امیر خاں از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مطبوعہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ء) ——

DISTRICT GAZETTEER OF THE UNITED PROVINCES VOL. XVI P. 159

[4] گانگن ندی مراد آباد (باقی صفحہ ۱۱۹ پر)

جمعدار نجف علی، ایجنٹ صاحب کا ساتھی کچھ آگے جاکر واپس آیا اور کہا کہ امیر خاں کے سوار قریب آگئے ہیں[1]۔ دونوں صاحب کہنے لگے کہ ہندوستانی آدمیوں پر وہم غالب ہے جنگل کے درختوں کو سوار سمجھ لیتے ہیں۔ وہ (میر نجف علی) اپنے دس بارہ سواروں کو لیکر گھوڑوں کو تیز دوڑاتا ہوا قزاولی طریقے سے آگے بڑھ گیا اور بندوقیں چلادیں۔ بندوقوں کا چلنا تھا کہ ٹڈی دل سپاہیوں کی جمعیت ظاہر ہوئی اجنٹن بہادر نظامت کے سپاہیوں کی دو کمپنیاں لاکر مقابل ہوگیا اور توپ چلی (اتفاقاً) توپ ٹوٹ گئی۔ لسٹر صاحب نے اپنے بچانے کو لیکر گھر کا راستہ لیا۔ اور امیر خانی سوار حملہ آور ہوگئے اجنٹن بہادر نے نہایت استقلال سے بیکار توپ کو کھینچتے ہوئے اور مخالف کو ہٹاتے ہوئے اپنی جمعیت کو لسٹر صاحب کے احاطہ مکان تک پہونچا دیا اور ریٹ صاحب جج مع اہل وعیال مال واسباب کو چھوڑ کر احاطے کے اندر آگئے اور عدالت کے عملے کے لوگ جو مرادآباد کے باشندے نہ تھے وہ بھی اسی احاطے میں آگئے اس احاطے میں نہ کوئی بُرج تھا نہ کوئی محفوظ مقام نہ ایسی خندق کہ اس قدر فوج سے پناہ مل سکتی۔ بایں ہمہ کوئی ایک توپ کھلونا نما بھی نہ تھی، نہ بارود گولہ۔ اس پر طرفہ یہ کہ احاطے کی دیوار کے نیچے درختوں کا جھنگٹ بھی تھا تین روز تک گھرے پڑے رہے محض اجنٹن بہادر کے استقلال اور حسن تدبیر سے سب کے سب آفت سے محفوظ رہے۔ جب کبھی سوار نعرے لگا کر حملہ کرتے تھے تو سب (محصورین) کے چہرے فق پڑ جاتے تھے مگر اجنٹن نہایت خندہ پیشانی سے سپاہیوں کی تسلی فرماتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۸ سے آگے) سے مغرب کی طرف قلعے کے نیچے بہتی ہے۔

[1] نواب امیر خاں بھرتپور سے جریدہ سواروں کے ساتھ روانہ ہوئے اور مہابن کے گھاٹ سے تحصیل وصول کرتے ہوئے گوکل آئے وہاں سے کوڑ گئے کوڑ سے سرسی، جلالی پور اور وہاں سے چھپیت گڑھ اور چھپیت گڑھ سے قمرالدین نگر پہونچے گنگا کا پایاب گھاٹ نہ پاکر ادھر اُدھر پھرتے رہے پھر گنگا کو عبور کر کے موضع دھنورہ میں خیمہ کیا وہاں سے ۱۵ فروری ۱۸۰۵ء کو امروہہ پہونچے ۱۷ فروری ۱۸۰۵ء کو مرادآباد پہونچے (نواب امیر خاں ص ۳۹)

DISTRICT GAZETTEER OF THE UNITED PROVINCES VOL XVI P 160

[2] انگریزی فوج سے مقابلہ ہوا جو مقابلے کی تاب نہ لاکر فرار ہوگئی نواب نے قیدخانہ توڑ کر قیدیوں کو زادِ راہ دے کر ان کے گھروں کو رخصت کر دیا رعایا کو ذرہ برابر تکلیف نہیں پہونچنے دی نواب امیر خاں نے مرادآباد کو قطعاً نہیں لوٹا البتہ سرکاری بنگلے جلا دئے گئے (اخبار الصنادید جلد اول ص ۴۰۴)

DISTRICT GAZETTEER OF THE UNITED PROVINCES (XVI) P. 160

رہتے تھے[1] نہ معلوم اس تفصیل کے ساتھ ان کی یہ کیفیت کونسل پہونچی یا نہیں یا افسرانِ نظامت کے لئے ایک دم ترقی کا دستور نہ ہوگا کیونکہ وہ برسوں اس عہدے پر رہے۔

رجوع بہ حالات فریدپور

اب ہم پھر اپنے قصے کی طرف آتے ہیں۔ وہاں (فریدپور) پر یہ قانون جاری ہونے والا تھا کہ زمیندار کے سپاہی عدالتی احکام تھانے پہونچایا کریں۔ زمینداروں نے عذر کیا میرے آقا نے اعلان کرایا کہ دس روز کے اندر اپنا عذر ڈھاکہ کورٹ میں پیش کر کے اس قانون کے التواء کا حکم ہم تک پہونچائیں ورنہ گیارھویں روز عدالت کا پیادہ تمہارے سامنے لفافہ ڈال کر چلا آئے گا اور اگر تم نہ پہنچاؤ گے تو قانونی دفعات کے بموجب جواب دہی کرنی ہوگی۔ گیارہویں دن ایسا ہی کیا اور قانون جاری ہوگیا۔

فریدپور اور حاجی گنج کے راستے میں آدمی گم ہوجاتے تھے اور کہیں ان کا سُراغ نہیں ملتا تھا حکم دیا کہ یا تو زمیندار جنگل کاٹ کر میدان صاف کریں ورنہ سرکار کٹوائے گی اس صورت میں زمیندار زراعت کے لئے دعویدار نہ رہے گا۔ یا زمیندار حفاظت اپنے ذمہ لے لیں چنانچہ ان ہی ایام میں یہ آفت کم ہوگئی بلکہ جب تک میں رہا پھر کبھی نہیں سُنا۔

صاحب نے اپنی ایک تجویز کورٹ کے ذریعے صدر لکھ بھیجی کہ سررشتہ دار اور ناظر دو جُدا گانہ محکمے ہونے چاہئیں یک جا ہونا اچھا نہیں اور فوجداری کی سررشتہ داری بندے کے لئے تجویز[2] کی اور دیوانی ایک دوسرے کے لئے۔ شاید کلکتہ سے وہ صاحب کا نیازمند تھا لیکن لکھنے پڑھنے سے عاری تھا۔

---

[1] اسی اثنا میں نواب امیر خاں کے ہرکارے جنرل اسکاٹ کے ہرکاروں کو گرفتار کر کے لائے ان کے پاس سے چٹھی نکلی جس سے معلوم ہوا کہ دوپہر تک بہت بڑی انگریزی فوج آجائے گی نواب کو چونکہ جم کر مقابلہ کرنا مقصود نہ تھا بلکہ انگریزوں کو پریشان کرنا مدنظر تھا لہذا اگلے دن صبح کو وہاں سے کوچ کر کے ٹانڈہ کے راستے کاشی پور پہونچے اور کمایوں کے علاقے کی طرف روانہ ہوئے انگریزی فوج نواب کے تعاقب میں روانہ ہوئی لیکن نواب امیر خاں کی فوج کی برق رفتاری کے مقابلے میں انگریزوں کی فوج تھی مفلوج ہوکر رہ گئی

نواب امیر خاں ص ۳۹، ۴۰

اخبار الصنادید جلد اول ص ۵۰۵

[2] مولوی عبدالقادر مؤلف روزنامچہ کو فوجداری کی سررشتہ داری پسند نہ آئی لہذا ڈھاکہ چلے آئے۔

ورود ڈھاکہ :-

یہ ناچیز براہ نادانی یا غرور جوانی کی بنا پر رزاق مطلق کی روزی رسانی پر اعتماد کر کے بلا اجازت وہاں سے بھاگ کر ڈھاکہ پہونچا۔ وجہ یہ کہ میں نے دس روپے سے تین سو روپے تک کی ملازمت کی ہے مگر جہاں بھی رہا ہوں مجھ سے زیادہ تنخواہ اور عزت میں دوسرا نہیں رہا۔

بدل گفتم آں روز ہرگز مباد　　پئے نان وہم شیوۂ خود بباد
خدایا کوئی روز ایسا نہ ہو　　کہ روٹی کے پیچھے بگڑ جائے خو

جس دن میں فرید پور سے چلا تو پانچ روپئے کے علاوہ میرے پاس کچھ نقد نہ تھا اور جو کچھ سامان تھا اسے اس کورودیہہ میں کون خریدتا۔

ڈھاکہ میں کسی سے واقفیت نہ تھی صرف اسی خیال سے کہ بڑا شہر ہے شاید کوئی صورت نکل آئے کشتی والوں کو تین روپے کرائے کے دے کر ڈھاکہ چل دیا۔ تین روز میں شہر کی عمارتیں نظر آئیں۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہاں نہ کوئی مہمان سرائے ہے نہ مسافر خانہ! اسی فکر میں تھا کہ ناگاہ ایک شخص آیا اور دریا کنار سے میرا نام لے کر پوچھا کہ وہ[1] کونسی کشتی میں ہے؟ ملاح نے کہا یہ ہے، وہ میرے پاس آگیا، میں نے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے اور کون ہو؟ اس نے جواب دیا میرا نام شفیع ہے اور نواب نصرت جنگ کے پیشکار سید محمد حسین خاں[2] کا بھیجا ہوا آیا ہوں پالکی اور سامان لیجانے والے مزدور ساتھ ہیں (سید محمد حسین خاں) نے سلام کہا ہے اور کہاہے کہ اگر ایک دو روز یہاں ٹھیریں تو میرے اوپر احسان ہوگا میں نے پوچھا وہ مجھے کیا جانیں کہا آغا میر فرزند خاں صاحب وہاں (فرید پور) سے آکر ذکر خیر کرتے تھے اس بنا پر وہ مشتاق ہو گئے۔

بالآخر میں سید محمد حسین خاں کے مکان پر پہونچ گیا وہ حویلی میں تھے ان کا لڑکا محمد میر مجھ کو اپنے ساتھ لے گیا اور ایسی جگہ پہنچایا جہاں ضروریات کی ہر شے مہیا تھی اور پوچھا کہ کچھ ناشتہ لاؤں؟ میں نے کہا کہ احسان آباد کے مقام پر ناشتہ کر چکا ہوں۔

جناب خان صاحب (محمد حسین خاں) جب تشریف لائے تو انھوں نے ایسی شفقت فرمائی کہ والد بزرگوار

---

[1] مولوی عبدالقادر مولف روزنامچہ ہے

[2] سید محمد حسین خاں کے حالات صفحہ ۳۲۱ پر ملاحظہ ہوں

کے علاوہ کسی اور سے نہیں دیکھی تین روز تک ان کا مہمان رہا اس عرصے میں شہر کے تمام عزیزوں کو وہ خواہ مخواہ میرے پاس لائے جو بھی آتا تھا یہی کہتا تھا کہ کل میرے یہاں نمک روٹی پر قناعت کرو. نواب نصرت جنگ[1] نے بھی چوبدار بھیجکر یاد فرمایا اور بیحد نوازشیں فرمائیں رخصت کے وقت عطر اور پان عنایت ہوا اور خوان بھیجا. یہی صورت نواب شمس الدولہ[2] بہادر کے یہاں ہوئی ایک مہینہ اسی طریقے پر گزر گیا اس کے بعد روزانہ ایک چیز کوئی برتن یا کپڑا اپنے ملازم کو دیتا کہ دوستوں سے پوشیدہ فروخت کرکے کچھ کھانے کا بندوبست کرے آخر یہ صورت بھی نہ رہی اس دن مجھے فکر ہوئی کہ اب کیا کرنا چاہئے اور دو شعر موزوں ہو گئے۔

باخلق نکو باش کہ تسخیر ہمیں ست	بر باد مدہ خاک خود کہ اکسیر ہمیں ست
دُنیا سے بھلائی کرو تسخیر یہی ہے	برباد نہ کر جان کو اکسیر یہی ہے
ہر عقدہ کہ از ناخن کوشش نکشاید	بگذار بتقدیر کہ تدبیر ہمیں ست
جو عقدہ ترے حال ہی ہو جائے نہ حل	تقدیر پہ چھوڑ اس کو کہ تدبیر یہی ہے

تائید غیبی :-

میں ان اشعار سے اپنی خاطر پریشانی کو تسلّی دے رہا تھا کہ دروازے میں ایک عورت داخل ہوئی اور میرا نام لیکر پوچھا کہ وہ (مولوی عبدالقادر) کہاں ہے؟ ساتھیوں نے پتہ بتا دیا وہ میرے پاس آگئی اور کہنے لگی کہ میں مراد آباد کی رہنے والی ہوں میرا لڑکا امانت جس کے متعلق دو کلمات خیر صوبیدار سے آپ نے فرما دیئے تھے حولدار ہو گیا ہے مجھے اپنی باندی اور لڑکے کو باندی زادہ سمجھئے اور یہاں کس اُمید پر پڑے ہو؟ میں نے کہا وطن کا ارادہ ہے مگر سامان کی فکر ہے اپنا زیور اُتارا اور کہا کہ یہ دو سو روپئے کا مال ہے لیجئے اور سفر کی تدبیر کیجئے۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ سب پروردگار کی کارسازی ہے. دل کو قوی کرکے میں نے اسے جواب دیا کہ اگر ضرورت پڑی تو لے لوں گا اس وقت اپنے ہی پاس رکھو اور رنجیدہ خاطر نہ ہو کیونکہ میں خود جان بوجھکر یہ تمہارے سپرد کرتا ہوں، کہنے لگی میری دعوت قبول کیجئے شام کو خشک روٹی لاؤں گی۔ میں نے منظور کر لی۔

---

[1] نواب نُصرت جنگ المتوفی ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء کے حالات صفحہ ۱۳۰ پر ملاحظہ ہوں

[2] نواب شمس الدولہ بہادر المتوفی ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء کے حالات صفحہ ۱۳۰ ملاحظہ ہوں۔

جب وہ عورت چلی گئی تو ہرکارے نے کارٹن صاحب کا خط لاکر میرے ہاتھ میں دیا میں نے لفافہ کھولا۔ اس میں ایک پرچہ دستخطی اور انگریزی خط میری نظر پڑا۔ مضمون یہ تھا کہ :-

" میرا خط تین سو سینتیس روپے کی رسید کے ساتھ اجنٹن صاحب کے پاس بھیجکر روپیہ وصول کرلیں اور اگر زادِ راہ کافی نہ ہو تو وہیں توقف کرکے مجھے لکھیں حسب طلب روپیہ وہیں پہنچ جائے گا اگرچہ نظر سے دور ہو دل سے دور نہیں۔ میں نے روپیہ وصول کرکے رسید مع عرضی اجنٹن صاحب کے پاس بھیجدی کہ آقا کے پاس پہونچادیں شام کے وقت اس عورت نے کھانا بھیجا۔ کھایا اور اس رات آرام سے سویا۔

نواب شمس الدولہ بہادر کی عنایت :-

صبح کو کشتی کرایہ کرنے کے لئے اپنا ملازم بھیجا جناب خان صاحب (محمد حسین خاں) نے سنتے ہی نواب شمس الدولہ کو خبر کردی۔ نواب صاحب نے میاں ننکو کو میرے پاس بھیجا یہ میاں ننکو نواب صاحب کی کلکتہ میں نظربندی[1] کے زمانے میں حسن خدمت کی بنا پر آج نواب صاحب کے جز و کل کا مختار ہے اور نواب صاحب کی خاطر سے سرکار انگریزی سے بھی مرزا محمد علی خاں بہادر کا خطاب ملا ہوا ہے[2] مختار نے یہ پیام دیا کہ دو مہینے صبر کرو اس عرصے میں کوئی معقول صورت تجویز کردی جائے گی میں نے کہا کہ تم اپنے اندازے سے کچھ کہو کہنے لگا کہ ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوں گے۔ میں نے کہا کہ آج ہی سے اسی روپئے لکھدیں اور دو مہینے تک کی بے تنخواہ دینے مجھ سے رسید لیں تیسرے مہینے اسی روپیہ مجھے دیدیں اگر اس سے زیادہ عنایت ہو تو نوازش ہے اس نے کہا کہ شاید یہ تدبیر مناسب نہیں میں نے کہا کہ پھر اسوقت میں کیا کرونگا جب زادِ راہ یہیں خرچ ہوجائیگا بھیک مانگنا مجھے آتا نہیں یہی بہتر ہے کہ مجھے رخصت فرمائیں۔

---

[1] نواب شمس الدولہ کی نظربندی کا واقعہ صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ ہو۔

[2] "مرزا محمد علی عرف ننکو میاں سابق سے ان (نواب شمس الدولہ) کی سرکار کا داروغہ تھا اور جسوقت گرفتار ہوکر کلکتہ گئے تھے یہ شخص ہمیشہ ان کے ساتھ رہا نواب شمس الدولہ انواع حسن خدمات اور جان نثاری کے سبب سے اس کو نہایت معتمد اور خیرخواہ جانتے تھے اپنی سرکار کا مدار المہام مقرر کیا اس وقت سب چیزوں کی ارزانی تھی اور گھر کا سامان پورا تھا مرزا محمد علی اس مبلغ قلیل سے بحسن تدبیر کل اخراجات سرکار کے انجام دیتا تھا اور سارے لواحقین کی تنخواہ دیتا تھا تاریخ نصرت جنگی میں لکھا ہے کہ کارنمائیوں سے نواب شمس الدولہ کے یہی ایک کام ہوا کہ مرزا محمد علی کی نمک حلالی اور حسن تدبیرات کی تعریفیں نواب گورنر جنرل اور اراکیان کونسل کے یہاں لکھکر اس کی عزت افزائی فرمائی اور حسب استدعا ان کے سرکار کمپنی سے خطاب خان بہادر مع خلعت مرزا محمد علی کو ملا" (تواریخ ڈھاکہ ص ۱۶۱، ۱۶۲)

مختار (میاں ننکو) نواب کے پاس چلا گیا اور جناب نواب میر اشرف علی[1] صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ نواب شمس الدولہ نے تمہاری تنخواہ میرے ذمے کر دی ہے ستر روپئے ہر مہینے، باورچی خانہ کا خرچ اور خدمت گاروں کی تنخواہ تمہارے پاس بھیجدوں گا۔ جاڑے اور گرمیوں کے کپڑے میرے لباس کے مصارف میں شامل ہیں سواری بھی میری طرف سے متعین ہو جائے گی میں نے عرض کیا کہ نواب صاحب کے تذکرے کی ضرورت نہیں۔ جناب میرے مربی اور بجائے چچا کے ہیں مجھے اپنے مہربان کی نوکری سے کیا عار ہے لیکن کوئی کام فرمائیے جس کو میں انجام دوں، فرمایا کہ میں تم کو واجب الاحترام قوت بازو اور لوگوں کی نظروں میں باعثِ فخر سمجھتا ہوں یہی کام ہے کہ کچھ عرصہ تک یہاں رہو اور اپنے سفر کرنے کے تذکرے سے میرا دل نہ ستاؤ۔ جب جی چاہے تمہیں دیکھ لوں اور جو کچھ دل میں آئے دریافت کر لوں میں نے بہت اچھا کہہ کر منظور کر لیا۔

حالات کارٹن صاحب:-

اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کارٹن صاحب کے کچھ حالات بھی لکھدوں کیونکہ انگریزی سرکار میں سب سے پہلے میں ان ہی کا دست گرفتہ ہوں وہ شخص نہایت عقل مند کم گو، پاک دل اور خوش مزاج ہے فارسی اور بنگلہ کے لکھنے اور پڑھنے میں دوسرے کا محتاج نہیں، چشم مروت بہت رکھتا ہے شکایت کسی کے سامنے زبان پر نہیں لاتا جس مجرم کو سزا کا حکم دیتا ہے اس سے آنکھ نہیں ملاتا۔ ادنیٰ ملازم سے بھی سخت کلامی نہیں کرتا، ہنر پسند ہے کسی کی عیب جوئی نہیں کرتا، ہندوستانیوں سے میل جول کم رکھتا ہے ہاں جس کو اس قابل سمجھے زبان اردو، بنگلہ اور فارسی خوب سمجھتا ہے اگرچہ بول نہیں سکتا جس شخص کو اپنی دانست کے مطابق نہ پاوے پھر اس کی صورت نہیں دیکھتا اس پرانے غلام[2] کی بھلائی سے خوش ہوتا ہے اور پریشانی سے رنجیدہ لیکن چونکہ اس کے دامن دولت کو میں نے خود ہی چھوڑا ہے نوکری کا تذکرہ جب تک میری طرف سے نہ ہوگا وہ زبان پر نہ لائے گا۔ توقیعات کسری یا رقعات عالمگیری کے طرز پر مختصر اور مفید تحریر کو پسند کرتا ہے اس کی فرمائش سے ایسے بہت سے فقرے میں نے لکھ کر دے دیئے ہیں۔

---

[1] میر اشرف علی کے حالات صفحہ ۱۳۳ پر ملاحظہ ہوں

[2] مولوی عبد القادر مؤلف روزنامچہ مراد ہیں۔

قیام ڈھاکہ :-

اب میں پھر ڈھاکہ کے قیام کا تذکرہ کرتا ہوں جس آرام سے میں وہاں رہا اب تک کسی دوسری جگہ وہ آرام مجھے نہیں ملا۔ میرا کام صرف دید باز دید (ملاقاتیں) تھا اور لکھنے پڑھنے کا مشغلہ۔ حضرات ذیل کتابیں پڑھتے تھے۔ میر محمد صالح فرزند میر محمد علی فاضل، محمد میر فرزند جناب سید محمد حسین خاں منشی عبد العلیم معلّم، اشہد علی فرزند میر حیدر بخش طبیب[1]، میر ذوالفقار علی فرزند حکیم عبد الشانی خاں، اور مندرجہ ذیل بزرگوار مناظرہ اور تحقیق کے ذریعہ فائدہ پہنچاتے تھے۔

منشی ریاض الدین۔ وکیل اپیل جو بعد کو منتی دورہ ہو گئے تھے اور اب کسی ضلع میں مولوی ہیں اور اس کام کے لئے موزوں ہیں۔

میر غلام علی۔ فرزند میر ولی سندیلہ کے رہنے والے نواح لکھنؤ کے مدارس میں فنونِ درسیہ کے عالم تھے۔

مرزا محمد میر۔ جناب خان صاحب (محمد حسین خاں) کے ولی عہد۔ سے فارسی نظم و نثر اور محاورات اردو کا تذکرہ رہتا تھا۔

میر سید علی مہدی خاں۔ اسی طرح جناب میر صاحب (میر اشرف علی) کے صاحبزادے میر سید علی مہدی۔

میر سید علی حسن خاں۔ خان عرف میر حیدر جان اور میر سید علی حسن خاں عرف میر حسن خاں اکثر شام کے وقت ہاتھی پر سوار ہو کر بندے کی قیام گاہ پر قدم رنجہ فرماتے تھوڑی دیر بیٹھتے اور مجھکو ساتھ لیجاتے اور دن چھپے تک دولت خانے پر پہونچ جاتے۔ ہر قسم کے کلمات کی تحقیق کرتے اور وہاں پر میر صاحب کی خدمت میں بھی ایسی ہی گفتگو ہوتی رہتی تھی[2]۔

خواجہ خلیل اللہ۔ بھی اکثر آتے رہتے تھے اور جو چاہتے دریافت کرتے رہتے تھے۔

---

[1] حکیم حیدر بخش اپنے دور کے نامور حکیم تھے مشہور زمیندار شیخ غلام علی کی صاحبزادی سے عقد ہوا تھا نواب شمس الدولہ کی سرکار میں حکیم مقرر تھے۔ (تواریخ ڈھاکہ ص ۱۹۶)

[2] میر اشرف علی کے صاحبزادوں کو خان بہادری کا خطاب عطا ہوا تھا سید علی حسن خاں دریا میں ڈوب کر مر گئے سید علی مہدی خاں کے دو بیٹے سید امیر الدین حیدر اور سید اسد الدین حیدر تھے سید اسد الدین حیدر کے دو بیٹے سید محمود اور سید محمد تھے سید محمود فارسی کے بڑے ادیب اور نامور شاعر تھے اور نواب سید محمد ڈپٹی کلکٹر تھے سرکاری ملازمت میں نہایت نیک نام رہے۔ (تاریخ ڈھاکہ)

جناب مولوی عبدالعظیم، جناب مرزا محمد باقر طبا طبائی، جناب مرزا جعفر فرزند حاجی کریم، آغا محمد واعظ، آغا ہادی شوستری، آغا محمد کاظم آذربائیجانی میرزین العابدین شیرازی، میرزین العابدین کتاب خواں، مرزا عاشور بیگ شاعر، مرزا شمس الدین، مرزا حیدر علی وغیرہ بزرگوں کی خدمت میں کبھی میں حاضر ہوتا تھا۔ اور کبھی وہ تشریف فرماہوتے تھے۔

نواب شمس الدولہ کے یہاں علمی صحبت :۔

ایک مرتبہ مولوی نورالزماں کی خدمت سے بھی فیضیاب ہوا ہوں جو فاضل، قانع اور پرہیزگار تھے اگرچہ روشنی طبع، لطافت تقریر اور طرز دلجوئی نہ رکھتے تھے لیکن آدمی نیک تھے پہلی ملاقات میں خود ہی علمی گفتگو شروع کی اور خود ہی رنجیدہ ہو گئے بندہ پھر ان کی فیض صحبت سے محروم رہا۔ مگر ایک دن نواب صاحب (نواب نصرت جنگ) کی محفل میں نواب شمس الدولہ بہادر نے شیخ بہاؤالدین کا کشکول ہاتھ میں لئے ہوئے بندے سے فرمایا کہ شیخ نے اس کتاب میں درخت کے پانی میں الٹے عکس کی وجہ اتفاقی رویہ لکھی ہے اس کا مطلب کیا ہے بیان کرو میں ازراہ ادب مولوی پر سبقت کرنی مناسب نہ سمجھا عرض کیا کہ حضرت مولانا ارشاد فرمائیں یہ سنکر مولانا بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ کتب درسیہ کی تعلیم پہ قادر ہونے کا نام علم ہے نہ کہ اس واہیات میں پڑنے کا۔ یہ کام تمہارا ہی ہے مجبوراً جیسا کچھ میری سمجھ میں آیا عرض کیا۔ میں نے کہا کہ شفاف سطح میں جو چیز دکھائی دیتی ہے وہ سطح سے جس قدر دور ہوگی اتنی ہی عکس کی گہرائی میں نظر آئے گی درخت کی چوٹی پانی سے دور ہے اور جڑ قریب ہے لہذا بہ نسبت جڑ کے چوٹی زیادہ گہرائی میں نظر آئے گی لامحالہ جڑ اوپر اور پھننگل نیچے دکھائی دے گی بہت ممکن ہے کہ کشکول "بمقدار بعد از نظر فرو رفتہ دیدہ می شود" میں لفظ "نظر" کاتب کی بھول ہو۔

جناب مولانا (نورالزماں) باوجودیکہ اس فن سے مطلق مناسبت نہیں رکھتے تھے لیکن کچھ لغویات سی کہنے لگے میں نے ان کی اس تقریر میں نجات دیکھی نواب صاحب نے ارشاد فرمایا کہ میرا ذہن ان کلماتِ طیبات کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ نواب صاحب نے پھر بندے سے فرمایا کہ اس کی کوئی دلیل بھی ہے میں نے عرض کیا ہے۔ فرمایا "کیا ؟" میں نے کہا کہ فن مرایا و مناظر کے مسلمات میں سے ہے کہ شعاع کا زاویہ، انعکاس کے زاویہ کے برابر ہوتا ہے، اب خط ا ب کو پانی کی سطح تصور کریں اور ب ج کو درخت کی لمبائی اور ا ع دیکھنے والے کا قد اور ع ہ ا زاویہ شعاع اور ب س ج زاویۂ انعکاس جانب سر

درخت، اور زاویہ ا ط ع شعاع اور زاویہ انعکاس ب ی ک شکل یہ ہے:۔
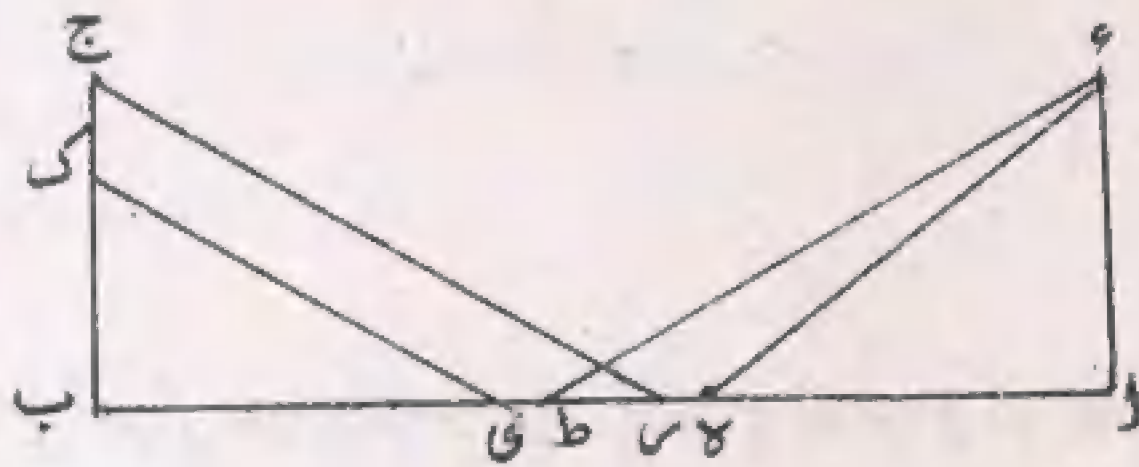
ظاہر ہے کہ خط م ج، خط ی ک سے بڑا ہے پس ک سطح آب میں جو ا ب ہے ج سے قریب دکھائی دے گا لامحالہ ک اوپر نظر آئے گا اور ج پیچھے اور ب اوپر دکھائی دے گا اور ک اس کے نیچے۔
نواب صاحب نے اس کو بیحد پسند فرمایا لیکن یہ کہا کہ زاویہ شعاع اور زاویۂ انعکاس میں مساوات کا سبب کیا ہے۔ میں نے کہا یہ تو ظاہر ہے کہ اگر جسم شفاف ہے تو شعاع باہر چلی جائے گی خواہ سطح جسم پر عمود ہو یا نہ ہو بہر کیف زاویۂ متقابلہ پیدا ہو جائے گا یہی ہندسہ متساویہ کی دلیل ہے۔ شکل یہ ہے:۔
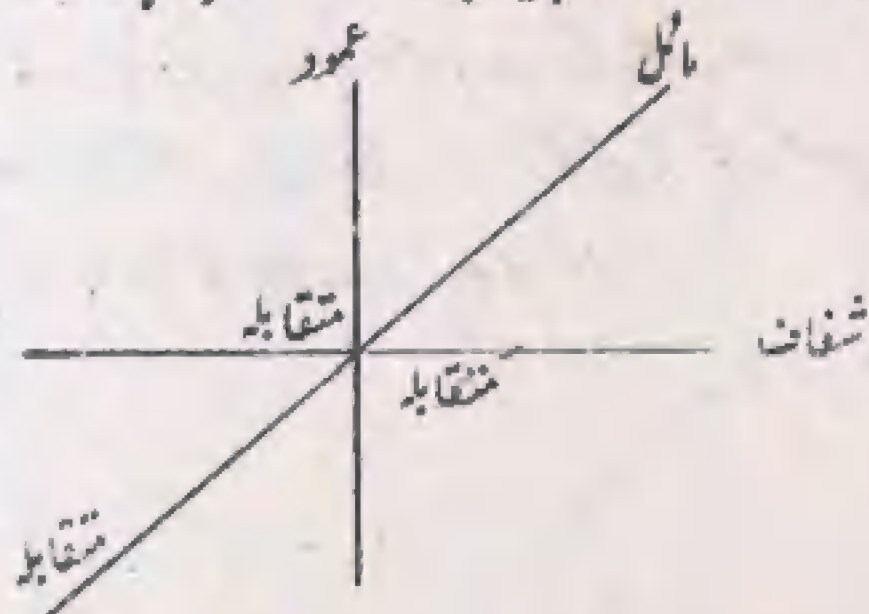
اور جب شفاف کی پشت پر کثیف جسم رکھدیں کہ شعاع کے اندر جانے کو منع کرے تو وہ شعاع واپس ہو کر دوسری چیز پر پڑے گی اسی کا نام انعکاس ہے پس مساوی زاویہ وہی زاویہ متقابلہ رہے گا۔ شکل یہ ہے:۔
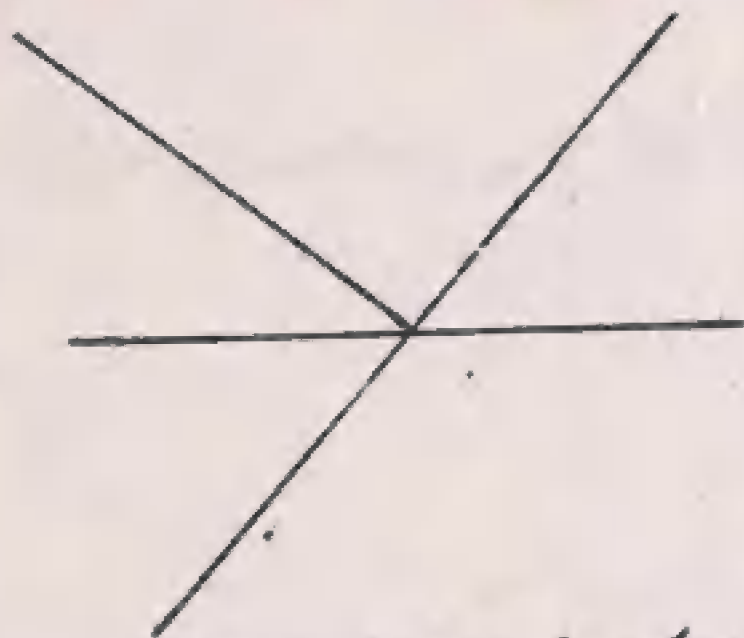
اور اس طرح بھی تصور کر سکتے ہیں کہ جسم شفاف پر شعاعی خط عمودی ہے جیسے

ح

ب ا ب خط ہ ح ء خط
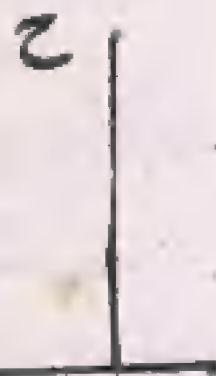
اس صورت میں د ء ح کی مقدار ح ء ب کی مقدار کے برابر ہے کیونکہ دونوں زاویئے قائم ہیں اور جو قائمے دو خطوط مستقیم سے پیدا ہوں وہ آپس میں برابر رہتے ہیں اسی طرح دو گول خط نیز ایک مستقیم اور ایک خط سے، ہر طرح کے قائمے افراد آپس میں مساوی ہوں گے یا مائل ہے تو جس قدر خط شعاعی میلان کرے گا لامحالہ اسی قدر خط انعکاسی بھی میلان کرے گا کیونکہ اگر دو شخص آپس میں ایک دوسرے کا چہرہ آئینوں میں دیکھیں تو ایک کا خط شعاعی ہوگا دوسرے کا انعکاسی

ء ح

ب ہ د
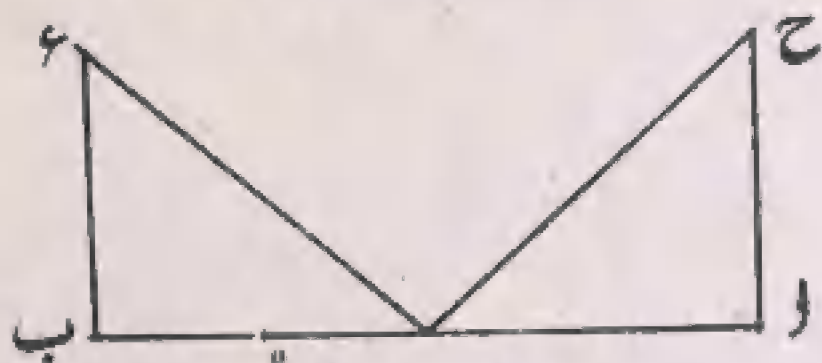
اکابر ڈھاکہ :- اب کچھ حالات اعیان شہر کے بیان کرتا ہوں :

نواب سید علی خاں بہادر :-

ان کے بزرگ قزوین کے باشندے، سادات اور اہل علم تھے۔ انقلاب زمانہ سے نجف اشرف اور کربلائے معلےٰ آگئے فرقہ امامیہ کے پیشوا امیر سید علی ان کے چچا تھے اور والد بزرگوار سید مرتضیٰ سرزمین بنگالہ

کے شہر جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں وارد ہوئے نواب جسارت خاں[1] نے جو اس وقت حاکم شہر تھے ان کی تشریف آوری کو غنیمت سمجھکر اپنی لڑکی ان کے نکاح میں دے دی اس خاتون سے تین لڑکے پیدا ہوئے اور ماں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے وطن آخرت کو سدھاریں اور سید مرتضےٰ نے بھی ملک جاودانی کی راہ لی اسوقت نواب کو بھی لڑکی کے صدمے نے اس خاکدان عالم سے سرائے جاودانی میں پہونچادیا۔

نواب حشمت جنگ :-

(سید مرتضیٰ کا) بڑا لڑکا سید امجد (نواب جسارت کا نواسہ) کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نواب (جسارت خاں[1]) کی جانشینی کا مستحق نہ تھا مسند پر بیٹھا حشمت جنگ بہادر کا خطاب ہوا[2] جب وہ بھی اپنی والدہ اور بزرگوں کے پاس جا پہنچا اس کا منجھلا بھائی اس کے بجائے مسند نشین ہوا کیونکہ اس کے کوئی لڑکا نہ تھا۔

---

[1] علی وردی خاں مہابت جنگ نے حسین الدین خاں نائب صوبیدار ڈھاکہ کے قتل ہونے کے بعد نواب جسارت خاں کو ۱۱۶۸ھ ۱۷۵۴ء میں صوبۂ ڈھاکہ کی نیابت پر مقرر فرمایا اُنھوں نے بیس سال تک نوابی کی میر محمد جعفر خاں کے وقت میں بھی ان کی نوابی قائم رہی جس وقت میر قاسم مسند حکومت پر بیٹھا تو نواب جسارت خاں کو ڈھاکہ سے بلوا کر اپنی رفاقت میں رکھا جب میر قاسم نے بنگال چھوڑا تو نواب جسارت خاں ان کی ہمراہی چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے نواب سراج الدولہ اور نواب میر قاسم کے مقابلے میں نواب جسارت خاں نے انگریزوں سے سازباز رکھی اور انگریزوں کی فلاح و بہبودی کو ہمیشہ مدنظر رکھا انگریزوں نے جسارت خاں کی خدمات کے صلے میں ان کو پھر ڈھاکہ کی نیابت پر مقرر کر دیا اور وہ سات سال تک اس عہدے پر قائم رہے جب سرشتۂ نظامت بنگال انگریزوں کے ہاتھ آیا تو نواب جسارت کی پانچ ہزار روپیہ پنشن مقرر ہوئی ۱۷۷۸ء میں نواب جسارت خاں نے انتقال کیا (تواریخ ڈھاکہ ص ۹۳، ۱۵۶، ۱۵۷)

DANI, AHMAD HUSAIN DACCA (THE SAOGAT PRESS DACCA, 1956) PP 51-53

BIRT, F.B. BRADLEY, THE ROMANCE OF AN EASTERN CAPITAL, LONDON, PP. 203, 220)

TAIFOOR, SYED MOHAMMAD, GLIMPES OF OLD DHAKA PP. 163, 167

[2] سید محمد خاں المخاطب بہ نواب حشمت جنگ کو ان کے نانا جسارت خاں نے اپنے آخری زمانۂ حیات میں اپنا جانشین مقرر کیا اور اپنی پنشن کو نواب حشمت جنگ کے نام مقرر کروانے کیلئے گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز سے درخواست کی گورنر جنرل نے نواب جسارت خاں کے حسن خدمات کے صلے میں ان کی پنشن نواب حشمت جنگ کے نام بحال کردی اور نوابی عزت و صولت جیسی کہ نواب جسارت خاں کی تھی قائم رکھی، نواب حشمت جنگ نے سات سال مسند نشین رہ کر ۱۷۸۵ء میں انتقال کیا تواریخ ڈھاکہ ص ۱۵۸ Dacca, P 55

Glimpres of old Dhaka, P 165, 108.

نواب نُصرت جنگ :-

اُمراء میں نُصرت جنگ لقب ہے اور غریبوں فقیروں میں اس کا نام نواب اولیاء ہے مشغلہ قرآن شریف لکھنا، کتب بینی اور عبادت ہے۔ ہر ایک کے ساتھ اس کے مرتبے کے لائق سلوک کرتا ہے اپنے حسب لیاقت مراعات رکھنے کی بنا پر بظاہر امیروں میں شامل ہے اور اقوال و اعمال باطنی اس کو صلحا میں ملاتے ہیں باوجودیکہ انگریزی سرکار سے سالانہ نقد مقرر ہے مگر نہ اتنا کہ مصارف ریاست کو کافی ہو لیکن کھینچ تان کر کے اور اپنے مصارف میں تنگی کر کے حتی الوسع ہمت سے کام لیتا ہے[1]

نواب شمس الدولہ بہادر :-

اس (نواب نُصرت جنگ) کے بھائی سید احمد علی خاں بہادر شمس الدولہ[2]، نواب مبارک الدولہ مرشد آبادی کے داماد ہیں بھائی کے اوصاف کے علاوہ علمی استعداد زیادہ رکھتے ہیں اکثر مطالعہ کتب اور ان کے انتخاب میں وقت گزارتے ہیں، ریاست کی ضرورت کی وجہ سے کچھ ذی لیاقت اشخاص سے ملاقات رکھتے ہیں فارسی نثر مختلف طرز پر لکھنے کی ایسی مہلت ہے کہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد میں نے اپنے ہم جنسوں میں کوئی دوسرا

---

[1] نواب سید علی خاں بہادر الملقب بہ نواب نُصرت جنگ، انتظام الدولہ نصیر الملک نواب حشمت جنگ کے بعد جانشین ہوئے سرکار کمپنی میں بڑے نیک نام رہے نواب نُصرت جنگ نے ۳۰ سال نوابی کی بڑے لائق اور خوشنویس تھے اور باوجود اس شوکت و امارت کے طلبہ کو خوش نویسی کی تعلیم دیتے تھے۔ ترسٹھ سال کی عمر میں ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۲ء میں بعارضہ اسہال انتقال ہوا۔

تواریخ ڈھاکہ ص ۱۵۷، ۱۵۹ DACCA, P 55

THE ROMANCE OF AN EASTERN CAPITAL P. 270 GLIMPSES OF OLD DHAKA, PP, 168, 171

[2] امیر الملک شمس الدولہ سید احمد علی خاں بہادر ذوالفقار جنگ، نواب نُصرت جنگ کے چھوٹے بھائی تھے نواب آصف الدولہ بہادر والئ اودھ کے جانشین وزیر علی خاں نے انگریزی رزیڈنٹ بنارس چیری کو قتل کر دیا تھا اس میں نواب شمس الدولہ بھی ملوث تھے اس لئے انگریزوں کا دل ان سے صاف نہ تھا اور یہ اپنے بھائی نُصرت جنگ کی جگہ نائب ناظم مقرر نہ ہو سکے بلکہ نُصرت جنگ کی تنخواہ سے ڈیڑھ ہزار روپیہ ان کی ذات کے واسطے سرکار کمپنی سے مقرر ہو گیا۔ سیر المتاخرین ص ۳۶۰، تواریخ ڈھاکہ ص ۱۵۹، ۱۶۲، تاریخ اودھ حصہ سوم ص ۳۸۲

GLIMPSES OF OLD DHAKA PP. 17-174. DACCA PP 59 - 59

THE ROMANCES OF AN EASTERN CAPITAL PP 249 - 50

شخص نہیں دیکھا چند رسالے بھی فارسی زبان میں لکھے ہیں انگریزی لکھنے پڑھنے پر بھی قادر ہیں لیکن چوں کہ بندہ اس زبان (انگریزی) سے ناواقف ہے اس لئے اس میں میری ستائش فضول ہے۔

ہم چشموں کی بدنظری اور ہم نشینوں کی نمک حرامی سے گھر بیٹھے بلائے ناگہانی یعنی وزیر علی خاں[1] کے ساتھ سازش کی تہمت میں چند روز کلکتہ میں فرنگیوں کا نظر بند رہنا پڑا بالآخر اپنی خوش نصیبی اور دولت انگریزی کی قدر دانی سے اس دریائے ہلاکت سے ساحل مراد تک پہونچے اب ڈھاکہ کی مسند پر وہی رونق افروز ہیں نامہ نگار (مولوی عبدالقادر) کے حال پر بے حد نوازش ہے۔ ایک روز حسب طلب میں گیا دربان نے اطلاع دینے میں تغافل کیا میں اپنی جگہ واپس آ گیا۔ پھر دلِ وحشی آمادہ نہ پایا مگر اس جانب سے الطاف غائبانہ ہیں اور بندہ بھی اب تک بے انتہا عقیدت رکھتا ہے لیکن اپنے کھوٹے سرمایہ کو اس آدمیت پرکھنے والے سے چھپا رکھا ہے۔

شکم سیر کن باد و نانِ جویں		پئے پوشش تن گلیمے گزیں
ملے جو کی روٹی اگر پیٹ بھر		ڈھکے تن فقط ٹاٹ ہی سے اگر
بگرما و سرما بزیر درخت		بسر کن کہ نے مایہ داری نہ رخت
درختوں کے نیچے ہی راتیں گزار		نہ ہو جبکہ سرمایہ کچھ پاس یار

---

[1] آصف الدولہ کے نطفے سے کوئی فرزند نہ تھا اس نے ایک غریب لڑکے کو فرزندی میں لے لیا اور وزیر علی خاں نام رکھا جو نہایت ذہین اور خوبصورت تھا علم و ہنر اور انشاء کی تعلیم خوب پائی تھی خوش نویسی میں مرزا محمد علی اعجاز رقم کا شاگرد تھا اسپ تازی شمشیر افگنی تیر اندازی اور چوگان بازی میں اس کو خوب مشق تھی نواب آصف الدولہ کے بعد مسند آرائے حکومت ہوا، آصف الدولہ کے بھائی نواب سعادت علی خاں نے اعتراض کیا اس کے تصفیے کے لئے گورنر جنرل سر جان شور خود لکھنؤ آئے اور وزیر علی خاں کو معزول کر دیا اس کا بنارس میں رہنا طے ہوا وہاں اس نے انگریزوں سے بدلہ لینا چاہا اور انگریزوں کی حکومت کے خلاف ایک محاذ بنایا، اطراف و نواح کے زمینداروں روٴسا اور مقتدر حضرات سے نامہ و پیام کیا۔ انگریزی رزیڈنٹ متعینہ بنارس اور دوسرے انگریزوں کو مار ڈالا اور انگریزی فوج سے مقابلہ کیا آخر میں راہ فرار اختیار کی۔ مہاراجہ جے پور نے دھوکہ دے کر انگریزوں کے قبضہ میں پہونچا دیا۔ انگریزوں نے وزیر علی خاں کو کلکتہ کے قلعہ میں قید کر دیا جہاں بحالت قید ۱۸۱۷ء میں انتقال ہوا۔ تاریخ اودھ حصہ سوم ص ۲۷۳، ۲۸۵ — وزیر نامہ از محمد امیر علی خاں مطبوعہ مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء ص ۴۹، ۵۰۔ قیصر التواریخ جلد اول ص ۱۳۶، ۱۴۲۔

انداں بہ کو دربار گاہ شہاں — درآئی بپا مردی ناکساں
نہیں اس سی بہتر ہے دربار سلطان — کرے گر سفارش تری مرد ناداں
چہ سود از زر و سیم داری بہ گنج — چو باشی زبے آبروئی بہ رنج
زر و سیم کوٹھی بھرا ہے تو کیا — جو بٹا تری آبرو پر لگا
کہ گنجت بمانے رسد اے پسر! — تو باشی بہ گور و خاکت بسر
خزانے پہ تیرے سدا سانپ لوٹیں — تری ہڈیاں خاک میں مل کے ٹوٹیں
کسے کو ترا خواہد ادرا بخواہ — گدا زادہ باشد و یا پور شاہ
بنا ہے جو تجھ سے تو اُس سے نباہ — گدا زادہ ہو یا کوئی بادشاہ
ہر آں کو فرومایہ داند ترا — کہ گہ خواند و گاہے براند ترا
سمجھکر کمینہ جو تجھکو کبھی — بلا کر کرے پھر نہ عزت تری
اگرچہ شہ ہفت کشور بود — بزور و بزر چوں سکندر بود
اگرچہ وہ دُنیا کا ہو بادشاہ — زر و زور میں ہو سکندر پناہ
بامید نیکی مرو سوئے او — مکن چوں سگاں جائے در کوئے او
نہ کر اس سے نیکی کی ہرگز تو آس — نہ پھر اس کے کوچہ کے تو گرد پاس

سیّد محمد حسین خاں :-

سیّد مکرم خاں کے بیٹے ہیں جو ہمت علی خاں، شجاعت علی خاں اور رستم علی خاں کے خاندان سے ہیں یہ محمد شاہی اُمرا میں سے ہیں سیر المتاخرین[1] میں ان کا ذکر ہے سیّد محمد حسین خاں کی والدہ حکیم معصوم علیخاں

---

[1] سیر المتاخرین میر غلام حسین طباطبائی کی تصنیف ہے یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے سب سے پہلے جلد دوم مرتب ہوئی دوسری جلد کا آغاز روز شنبہ یکم صفر ۱۱۹۴ھ / جنوری ۱۷۸۰ء کو ہوا تقریبًا ایک سال میں بروز یکشنبہ ۲۱ ماہ محرم ۱۱۹۵ھ مطابق نومبر ۱۷۸۰ء کو تمام کو پہونچا۔ اس کے بعد مصنف نے اس جلد کے تتمہ کے طور پر جلد سوم لکھی جو چند مہینوں میں یوم سہ شنبہ، رمضان ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء کو تمام ہوئی اس تتمہ سے فارغ ہونے کے بعد اسے اصل کتاب کا مقدمہ لکھنے کا خیال ہوا بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء میں مقدمہ لکھنا شروع کیا اور یہ کام تقریبًا ایک سال میں تمام ہوا اس طرح یہ کتاب تقریبًا ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۳ء میں اختتام کو پہونچی۔

کی لڑکی ہے جنکو محمد شاہ کے دربار سے بہادری کا خطاب ملا تھا۔ اور اس سرا پردۂ عصمت کا نکاح سید مکرم خاں سے بادشاہ نے کرایا تھا حسبی و نسبی سیادت کے آثار ان کے عادات شریفہ سے ظاہر تھے اپنے اور پرائے کے لئے کوشش کرنے میں ہر وقت تیار، اور دشمن کی مدد سے کوسوں دور، غریبوں کے ساتھ انکسار اور زبردستوں سے بے پروائی ان ہی کا شیوہ تھا ان کے ولیعہد میر شجاعت علی خاں عرف مرزا میر جاشنی، شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے اُردو زبان میں بھی عاشقانہ شعر کہتے تھے فارسی نثر جو غور سے لکھتے تھے۔ وہ بے ربط نہ ہوتی تھی اور سلطان میر عرف آشنا تھا میر عبدالحی عرف محمد میر جوانِ صالح لکھنے پڑھنے اور علم مجلسی میں بہت اچھا تھا لیکن یہ سب پدر بزرگوار کے سامنے ہی چل دیئے میر رستم علی جس کو نواب (نصرت جنگ) محبت آمیز طریقہ پر آغا میر کہتے ہیں زمانہ سازی میں یکتا ہے۔

میر اشرف علی:

الہ آباد کے پُرانے باشندے تھے کچھ عرصے تک کسی انگریز افسر کے ساتھ رہ کر نظامت اور سر رشتہ داری کا کام انجام دیا اس کے بعد پرگنہ بلدا کھار علاقہ ڈھاکہ کے زمیندار مرزا بھیلا کے خاندان میں ایک خاتون سے عقد کر لیا اور اپنی بیوی اور ساس کے حصّے کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جو کچھ ہاتھ لگا اس سے زیادہ خرچ کیا۔ زیادہ تر خرچ مہمانداری اور مسافروں کے سامان کی تیاری پر ہوتا تھا۔ وہ اس ناچیز (مولوی عبدالقادر) پر بلا کسی استحقاق سابق، آئندہ اُمید اور طلب حُسن خدمت کے جو مربیانہ احسان اور بزرگانہ شفقت کرتے تھے اس کا شکریہ میں اپنے کسی قول و فعل سے ادا نہیں کر سکتا کہ ملک بقا میں اپنے آباء کرام کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ خدا کرے اس کی برکت اس کے فرزندوں کو نصیب ہو اور اتفاق کی توفیق بخشے [1]

مولوی عبدالعظیم:-

اُن کے بڑے مولوی حفیظ اللہ نہایت فراخ حوصلہ ہیں ان بزرگوں کا مسکن خطہ دلپذیر کشمیر ہے تجارت پر

---

[1] میر اشرف علی بڑے نامور اور باحیثیت زمیندار تھے جن کی زمینداری کی آمدنی بیس ہزار روپے ماہوار تھی ان کا مکان رمنہ کے قریب محلہ پھول بڑیہ میں تھا میر اشرف علی کی سرکار میں سیکڑوں آدمی پرورش پاتے تھے اور داد و دہش بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ میر اشرف علی نے رنگون کی پہلی لڑائی میں سرکاری فوج کی رسد وغیرہ کے بارے میں بڑی مدد کی تھی اور لاکھوں روپے دیئے تھے میر اشرف علی اپنے وقت کے بڑے ذی عزت اور صاحب حوصلہ شخص تھے۔ (تواریخ ڈھاکہ ص ۱۰۷)

[2] مولوی حفیظ اللہ خاندان نوابان ڈھاکہ کے پہلے شخص تھے جو لیعہد نواب نُصرت جنگ ڈھاکہ آئے اور تجارت کے ذریعہ (باقی صفحہ ۱۳۳ پر)

بسر کرتے تھے لیکن ہمت امیرانہ رکھتے تھے کہ ہر کس وناکس کی امداد میں لگے رہتے تھے خصوصاً مولوی عبدالعظیم جن کی گھٹی میں شکستہ دلوں کی دلداری اور عاجزوں کی دستگیری ہے وہ دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک و احسان کرتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو خبر ہو اسی بنا پر میں بھی تفصیل سے بیان نہیں کرتا اب اس خاندان میں جو کچھ ہیں وہ علیم میاں ہیں[1]۔

خواجہ خلیل اللہ :۔

خواجہ خلیل اللہ بھی اسی خاندان سے ہے اگرچہ تجارت کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے مگر اپنے بازو کی طاقت اور تائید الٰہی سے روزی مل جاتی ہے میرے بے تکلف مہربان ہیں[2]

مرزا شمس الدین :۔

محمد تقی خاں[3] کی اولاد میں ایک خاندانی شخص ہے پرہیزگار اور خدا پرست ہے مگر دریا دل اور تنگ دست ہے[4]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۳ سے آگے) بڑی دولت پیدا کی علوم دینیہ میں اچھی قابلیت تھی بہت سی زمینداری خریدی (تواریخ ڈھاکہ ص ۲۴۹)

[1] مولوی حفیظ اللہ کے بڑے بھائی خواجہ احسان اللہ کے لڑکے تھے خواجہ احسان اللہ نہایت صوفی منش اور عالم باعمل تھے۔ اپنے لڑکے خواجہ علیم اللہ کو مولوی حفیظ اللہ کے پاس چھوڑ کر مکہ معظمہ ہجرت کر گئے خواجہ علیم اللہ نے اپنے چچا کے پاس رہ کر تجارت کے ذریعہ بڑی دولت جمع کی امیر و کبیر اور رئیس اعظم بن گئے غرباؤ مساکین کی امداد کے لئے اپنی زمینداری کا بڑا حصہ وقف کیا ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا۔ مولوی محمد فاضل نے تاریخ کہی ہے۔

مر گئے خواجہ علیم اللہ امیر نامدار　　داخلِ جنت ہوئے با حشمت و تمکین و شان

سال مرگ ان کا کہا فاضل نے سال عیسوی　　آہ وادیلا، ہوا ڈھاکے کا ختم خواجگان،

خواجہ علیم اللہ کثیر الاولاد تھے ان کے بڑے صاحبزادے نواب عبدالغنی ان کے جانشین ہوئے جو نہایت نیک، دانشمند اور علم و حلم کی دولت سے بہرہ مند تھے سرکار سے "سر" کا خطاب ملا انھوں نے کار خیر کے بہت سے کام کئے۔ نواب سر عبدالغنی کے صاحبزادے نواب سر احسن اللہ خاں تھے (المتوفی ۱۹۰۱ء) جن کے نواسے خواجہ ناظم الدین (ف ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۴ء) اور خواجہ شہاب الدین ہیں۔ تواریخ ڈھاکہ ص ۲۵۲، ۲۴۸

[2] تواریخ ڈھاکہ صفحہ ۲۰۵　[3] "میر تقی خاں نے ایران سے آکر بذریعہ تجارت اچھی دولت حاصل کر کے زمینداری خریدلی ناموری کے ساتھ امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے ان کا مکان محلہ تل گولے میں تھا دو لڑکے سید خاں اور سید محمد باقر تھے"۔ تواریخ ڈھاکہ ص ۲۰۶

[4] "مرزا شمس الدین کے صاحبزادے آغا غلام علی ڈھاکہ کے نامور زمیندار اور صاحب عزت شخص تھے ننکو میاں کے داماد تھے"۔

تواریخ ڈھاکہ ص ۲۰۵

...زا جلال الدین :-

مرزا فتح علی کا لڑکا نواب (نصرت جنگ) کی سرکار میں ملازم ہے نیک جوان ہے۔

...رزا محمد باقر طبا طبائی :-

اصفہان کے سیدوں میں سے ہیں اس کی ماں خاندان صفویہ سے تھیں فاضل، دانشمند، مہذب اور جامع علوم سے واقف تھے اکثر جزئیات کے مختلف اقوال بیان فرما دیتے تھے عربی عبارت بھی قلم برداشتہ اچھی لکھتے اور فارسی تو ان کی زبان ہی تھی اپنے مذہبی اعتقاد و اعمال میں نہایت مضبوط اور معاملات میں صُلح کل کا مشرب رکھتے تھے۔

...غا ہادی شوستری :-

باوجودیکہ عروض و قافیہ سے واقف نہ تھے شعر ایسا کہہ لیتے کہ سُننے والا خوش ہو جائے۔

...رزا جعفر :-

حاجی کریم تاجر کے لڑکے اچھا سرمایہ رکھتے تھے لیکن اپنی تن پروری کی طرف توجہ نہ تھی مگر کبھی توجہ بھی کرتے تھے۔ کچھ خفقان سا تھا شرفا کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے تھے ایک دن مجھ سے کہا کہ اگر دریا میں میرے ہم سفر ہو جاؤ تو ایران چلیں اور اپنے کارندے کو دیکھ کر چلے آئیں کیونکہ تمہاری ہم نشینی سے میرے خفقان میں کمی ہو جاتی ہے ایک دو سال میں جب مع الخیر یہاں آ جاؤ گے تو دس ہزار روپیہ نقد دوں گا، میں نے کہا کہ پھر آپ کی صحبت کی برکت سے مجھے خفقان ہو جائے گا اور وہ دس ہزار روپیہ اگر مجھے کوئی ہم نشیں مل گیا تو میں اسے دیدوں گا میرے پاس نفع میں صرف وہی خفقان رہ جائے گا یہ نکتہ پسند کیا۔ اور ہنسنے لگے،

حکیم عبدالشافی خاں :-

بیماروں کی طرف بیحد متوجہ ہوتے تھے۔ اب سُنا ہے[۱] کہ ان کے لڑکے ذوالفقار علی باپ کے نعم البدل ہیں بڑی خوشی کی بات ہے میں اسے (ذوالفقار علی کو) اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہوں۔

مرزا حیدر علی تاجر :-

اگرچہ دوسروں کی طرح چنداں زردار نہیں تھے لیکن ہنرمندی اور معاملہ فہمی کی بنا پر بہت کچھ ترقی کرلی

---

[۱] سنہ ۱۲۳۱ھ

ہے ضروری لکھنا پڑھنا اور فارسی و دواوین کے اشعار سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں اب اس شہر میں بہت غنیمت ہیں[1]

میر محمد علی حکیم :-

اگرچہ یونانی طب کے علم و عمل میں زیادہ دسترس نہیں مگر اخلاقِ حمیدہ کی بنا پر اس وقت[2] لوگ زیادہ تر ان ہی کی طرف توجہ کرتے تھے ان کا چھوٹا بھائی اور شاگرد حکیم پناہ اللہ کلکتہ میں ہے بندہ سے ملاقات تھی نہ معلوم اب کیسا ہے

مرزا غلام علی :-

ذہین ہیں اور استعداد اچھی رکھتے ہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ کتب درسیہ پر عبور کیا ہے یا نہیں[3]

میر محمد صالح :-

میر محمد علی فاضل کے فرزند ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس شہر میں وہ (میر محمد علی) بے حد غنیمت تھے بندے نے اس بزرگوار کی زیارت نہیں کی کئی لڑکے تھے سب بھائیوں میں یہی میر محمد صالح علم سے زیادہ انسیت رکھتے ہیں۔ سولہ مہینے تک اس شہر ڈھاکہ میں رہا بتاریخ ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۲۶ھ[4] ۱۸۱۲ء کو میر اشرف علی کے لڑکوں[5] کی شادی انجام پائی نکاح سے ایک دن پہلے تمام شہر کی دعوت کی محلے محلے اور گھر گھر خوان بھر کے کھانے پہنچائے[6]۔

---

[1] مرزا حیدر علی کا مکان محلہ بیگم بازار میں بڑی شان و شوکت کا تھا ایک مشہور امام باڑہ تھا اس میں بڑی دھوم سے محرم کی مجالس ہوتی تھیں" (تواریخ ڈھاکہ ص ۱۸۹) [2] ۱۸۱۵ء [3] میر غلام علی کے والد حاجی شمس الدین تھے ڈھاکہ کے نامور اور ذی عزت زمیندار ، اور اپنے وقت کے بڑے صاحب حوصلہ شخص تھے نواب شمس الدولہ کے مدار المہام ننکو میاں کی بیٹی حور النساء بیگم سے شادی ہوئی تھی بڑے مہمان نواز تھے (تواریخ ڈھاکہ ص ۲۰۵) [4] ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۵ دسمبر ۱۸۱۱ء۔

[5] میر سید علی مہدی خاں و میر سید علی حسن خاں پسران میر اشرف علی [6] شادی کی تقریبوں میں امراء کے یہاں خاص ترتیب اور قاعدے سے خوان تقسیم ہوتے تھے جس کی ہیئت ترکیبی یہ تھی کہ ایک بڑی کشتی یا چند کشتیوں میں مٹی کے پیالے پیالیاں اور برتنوں میں کھانے لال بانات کے خوان پوش سے ڈھک کر مہمانوں کے گھر بھیجے جاتے تھے ان کشتیوں میں چار قسم کی روٹیاں، چار طرح کے چاول چار نوع کے نان خورش چار قسم کے کباب، چار قسم کی مٹھائیوں کے علاوہ پنیر بورانی، چٹنی اور اچار یعنی کل ۲۴ قسم کی اشیاء ہوتی تھیں "ڈھاکہ پچاس برس پہلے" از حکیم حبیب الرحمٰن ص ۷۳ مطبوعہ اتحاد پریس لاہور ۱۹۴۹ء)

شب عقد میں آرائش محفل، روشنی اور آتشبازی اتنی ہوئی کہ خیال میں نہیں آتی تھی بہت ممکن ہے کہ نصف لاکھ روپیہ سے زیادہ خرچ ہوگیا ہو

روانگی کلکتہ:۔

سولہ مہینے میں ڈھاکہ ٹھیرا ناگہاں والد صاحب کا خط پہونچا اس میں تحریر تھا کہ

"تم کو تین سال ہو گئے میرا دل پریشان ہے بیماری کی حالت میں تمہاری یاد سے دل میں اور زیادہ پریشانی ہوتی ہے اب زندگی بھر میرے پاس رہو کہیں باہر مت جاؤ۔"

ان کی تحریر دیکھتے ہی میں ایسا پریشان ہوا کہ کس کا سونا کس کا کھانا، ایک کشتی جسے بجرہ کہتے ہیں۔ کلکتہ تک کرایہ کی کلکتہ آنے سے مقصد حافظ احمد کبیر کو دیکھنا تھا میں اور وہ انتہا طفلی اور ابتداء شباب سے برسوں رات دن یکجا رہے تھے اتفاقًا وہ کلکتہ پہونچ گئے میں اس ملک میں سرگرداں پھرتا رہا۔ لامحالہ میں نے چاہا کہ پھر ان کو ایک مرتبہ دیکھ لوں نہ معلوم موت پھر ایسا موقع دے یا نہ دے مولوی حفیظ اللہ صاحب کے مکان سے ہم کشتی پر سوار ہوئے شہر کے لوگ اخلاقًا رخصت کے لئے اتنے جمع ہو گئے کہ کبھی وطن سے روانگی کے وقت بھی ایسا اتفاق نہ ہوا تھا ایک چھوٹی کشتی کرائے کرنی پڑی تین میل تک بعض احباب ساتھ آئے تین روز میں اس زادِ راہ کے بارے ملاحوں کو جن میں بہت سے مسلمان تھے کھلا کر ہلکا ہوا۔ راستے میں فریدپور آیا وہاں سے کارٹن صاحب سے ملے بغیر گزر جانا مناسب معلوم نہ ہوا۔ ایک روز کا وقفہ کر کے میں گیا آداب بجالایا، کچھ دیر بیٹھا اور اٹھ آیا اور منزلیں طے کرتا ہوا کلکتہ پہونچا چیت پور میں کرائے پر مکان لیا اور ملاحوں کو رخصت کیا۔ عجب اتفاق کہ جس دن کلکتہ پہونچا ہوں شام کا وقت تھا چودھویں شب تھی، سمندر کے پانی میں جوار بھاٹا کا شور ہوا میرے ہمراہی ڈرنے لگے تمام شب ان کی تسلی اور دلاسے میں گزری۔

مشاہیر کلکتہ

حافظ احمد کبیر:۔ میں پوچھتے پوچھتے مدرسہ عالیہ پہونچا اور اپنے دوست احمد کبیر کو دیکھا[1]

---

[1] مولوی حافظ احمد کبیر مجدّدی ولد شاہ محمد پیر مجذوب، ولادت تقریبًا ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء میں رامپور میں ہوئی (باقی صفحہ ۱۳۸ پر)

مولوی بہادر علی :۔ مولوی بہادر علی نے جو ہم محلہ اور ہم سبق تھے اور مدرسے میں چوتھے نائب مدرس تھے اپنے دیدار سے مجھے مشرف کیا اور جب میں نے ان کے سجھائیوں کو دیکھا تو بہت مسرت ہوئی۔

مولوی نعمت علی :۔ مولوی نعمت علی بھی جواب چھپرہ میں مولوی عدالت ہیں ایک دن مجھے دیکھنے آئے

مولوی امین اللہ :۔ جناب مولوی امین اللہ صاحب کی خدمت فیض درجت میں جو اس وقت صدر مدرس تھے میں حاضر ہوا، سچ تو یہ ہے کہ اس زمرے میں حق صدارت ان ہی کا تھا باوجود اس بلند مرتبہ ہونے کے شعر کے فن خسیس کو عزت بخشی، نواح عظیم آباد کے باشندے، ذکی الطبع، وضعدار ذی وجاہت اور باوقار تھے، جیسا کہ علماء کو ہونا چاہیئے ایسے ہی تھے بہت سے لوگ جو خوش خلقی اور بدتمیزی میں فرق نہیں کرتے ان بزرگ کو کج خلق سمجھتے تھے [1]

مولوی غلام سبحان :۔ مولوی غلام سبحان صاحب سے بھی صحبتیں رہیں جو اس وقت صدر مفتی ہیں اور اُس وقت تیسرے نائب مدرس تھے، ہشاش، بشاش، ملنسار اور طلبا کی تربیت میں بیحد مصروف رہتے تھے، اب زمانے نے تفکرات میں ڈال دیا ہے۔

مولوی عبدالمجید :۔ ان ہی دنوں میں جناب مولوی عبدالمجید صاحب کو بھی دیکھا جو میسوری [2] شہزادے کے عتاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷ سے آگے) اکثر علوم رامپور میں مفتی شرف الدین سے حاصل کئے حرمین شریفین اور شام میں حدیث وغیرہ کی تحصیل کی بڑے جید عالم تھے مولوی عبدالقادر خاں سے ایام طالب علمی سے بہت دوستی تھی ممالک اسلامیہ سے آکر کلکتہ میں مدرسہ عالیہ کی ملازمت منسلک ہوگئے ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں رامپور میں وفات پائی اپنے داماد کے حظیرہ کے سامنے جانب جنوب متصل دیوار مسجد مدفون ہیں۔

(تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۷۹) و تاریخ مدرسہ عالیہ از مولانا عبدالستار مدرسہ عالیہ ڈھاکہ ۱۹۵۹ء حصہ دوم ص ۱۸۳)

[1] مولوی امین اللہ ولد مولانا سلیم اللہ، قصبہ نگر نہسہ کے رہنے والے تھے اپنے والد اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد تھے ان کی مشہور تصنیف قصیدۂ عظمیٰ ہے میرزاہد، شرح مواقف اور مسلم الثبوت بزبان کے حواشی ہیں، ۲۷ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء کو کلکتہ میں انتقال ہوا، (تاریخ مدرسہ عالیہ) حصہ دوم ص ۱۸۷-۱۸۸)

[2] ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد اس کے بارہ شہزادوں اور ایک شہزادی کے لئے تقریباً سات لاکھ روپے مقرر ہوئے اور ان سب کو ویلور کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا ۱۸۰۶ء میں شہزادوں نے آزادی کی کوشش کی اور اس منصوبے کی تکمیل کے لئے شہزادہ شکر اللہ کو سردار و سالار مقرر کیا گیا انگریزوں نے طاقت سے یہ مخالفت دبا دی اور اس خاندان کو کلکتہ منتقل کر دیا (باقی صفحہ ۱۳۹ پر)

سے معتوب تھے ان سے یہ تذکرہ ملاقات کے درمیان آگیا کہ دور سے چیز چھوٹی کیوں معلوم ہوتی ہے؟ اسکی صورت یہ ہے کہ ا ب کو مری قرار دیں اور ج کو آنکھ ا ب، ج ا اور ج ب دو شعاعی خط ہیں پھر ا ب کو ورا فاصلے سے رکھیں تو وہ دو خط شعاعی لمبے جائیں گے۔ اور ج کا زاویہ تنگ، لہٰذا چیز کا چھوٹا اور بڑا ہونا اس زاویہ کے چھوٹے اور بڑے ہونے کی بنا پر ہے۔

ج
ب ا
ب ا
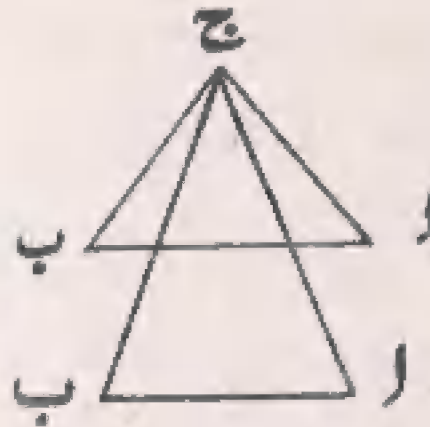
مولوی کرم حسین:۔ بلگرام کے جلیل القدر سادات میں سے ہیں مذہب اثنا عشری اور مسلک صلح کل رکھتے ہیں۔ فارسی عبارت قلم برداشتہ چست، درست اور رواں لکھتے ہیں تنگی اور فراخی میں زندہ دلی سے اوقات بسر کرتے ہیں بڑا مشغلہ کتب لغت و ادب اور تواریخ عجم و عرب کی سیر ہے۔

مولوی علی اعظم:۔ علوم عربیہ و ادبیہ کی تحصیل و تربیت کے زمانے میں مولوی مخدوم صاحب لکھنؤ کے منظور نظر رہے تھے کلکتہ پہونچکر باقی علوم قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں کاکوروی اور جناب مولوی امین اللہ صاحب، صدر مدرس سے حاصل کئے چند روز مدرسے میں مدرس اور میکان صاحب، میر منشی سپہ سالار کے منشی بھی رہے حسن پرستی میں سعدی، جامی، عراقی اور اوحد الدین کرمانی کی یادگار سمجھے جاتے ہیں آخر کلکتہ کی خاک سیاہ ہی میں بیماریِ حیات کی تکلیف سے موت کی نیند سو گئے ان کی یادگار ان کا چھوٹا بھائی مولوی عالم ہے

مرزا جان تپش:۔ کلکتہ کے مشہور شاعروں میں مرزا جان تپش شاہ جہاں آبادی خواجہ میر درد کے شاگرد تھے[1] تپش مرشدآباد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۸ سے آگے) جہاں یہ لوگ ٹالی گنج میں مقیم ہوئے شہزادہ سلطان صاحب علم و فضل تھے بشکر اللہ سلطان کے بیٹے بشیر الدین توفیق المتوفی ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء غالب کے شاگرد تھے۔ (تلامذہ غالب، از مالک رام صفحہ ۲۰۰، ۲۰۸ (مرکز تصنیف و تالیف نکودر ۱۹۵۷ء)

[1] محمد اسمٰعیل معروف بہ مرزا جان متخلص بہ تپش، ساکن دہلی، ان کے والد یوسف بیگ خاں، بخارا کے رہنے والے تھے۔ تپش محمد یار بیگ سائل اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے علی ابراہیم اور تپش سے بنارس میں ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء میں ملاقات ہوئی اس وقت یہ نوجوان تھے اور شہزادہ جہاندار کی ملازمت میں تھے اس کے بعد یہ مرشد آباد پہونچے اور وہاں سے کلکتہ چلے گئے وہاں یہ نواب شمس الدولہ کی رفاقت میں قید میں رہے (باقی صفحہ ۱۴۰ پر)

میں نواب شمس الدولہ کے رفیق رہے اور اپنے آقا کی رفاقت میں بڑی بڑی زحمتیں اُٹھائیں ان بلاؤں سے نجات کے بعد راجہ لب کشور نے ان کی معیشت کی کفالت کی۔

مرزا ابوالقاسم:۔ مرزا ابوالقاسم بھی مشہور شاعروں میں ہیں عالی خاندان ہیں شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے کچھ عرصے لکھنؤ رہے آب ودانہ نے کلکتہ پہونچایا لیاقت کے مناسب معاش نہیں ہے۔

مرزا احمد بیگ خاں:۔ مرزا ہادی خاں کے صاحبزادے ہیں اور اچھے شاعر ہیں اپنا سلسلہ نسب تمایش خاں سے ملاتے ہیں بندہ (مولوی عبدالقادر) کو شہر ڈھاکہ سے ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہے اور بے تکلفانہ دوستی ہے ریختہ گوئی میں پرانے شعراء کا نمونہ ہیں اس شہر کے اکثر لوگ اس فن میں ان سے استفادہ کرتے ہیں اس خیال سے کہ لوگ یار فروشی نہ سمجھیں ان کا مرتبہ جیسا میں جانتا ہوں نہیں لکھتا۔

قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں موہانی:۔ کمالات علمیہ رکھنے کے علاوہ شاعر اور طبیب بھی تھے، اہل سنت ان کو اپنے گروہ میں اور شیعہ اپنی جماعت میں شمار کرتے تھے اور میری دانست میں جو انھوں نے کہا ہے ٹھیک کہا ہے اور گویا موتی پرو دیئے ہیں۔

مذہبم عشق ست و من واقف ز ادیاں نیستم
عشق کے مذہب پہ میں نے دین سارے کھو دیئے،
ہندو و نصرانی و گبر و مسلماں نیستم
اب نہ ہندو نے مسلمان سب کے دفتر کھو دیئے

بظاہر شرعی طریقے کے چنداں پابند نہ تھے بہتر[۲] مذہبوں میں بس یکتا تھے لیکن اپنے عہدے پر نیک نام رہے خود غرضی کے غبار سے اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیا۔

قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں کاکوروی:۔ بڑے فاضل وکامل تھے علوم متعارفہ و نادرہ کے ماہر تھے اس کام اور اس زمانے میں اپنے وقت کے جامی کہے جاسکتے تھے شرافت ان کی وضع سے ٹپکتی تھی، اور علو ہمت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹ سے آگے) قید کے زمانہ میں انھوں نے ریختہ میں یوسف زلیخا لکھی۔ شمس البیان فی مصطلحات ہندستان بھی ان سے یادگار ہے،

یادگار شعراء (فہرست کتب خانہ شاہان اودھ از اسپرنگر)

اُردو ترجمہ از طفیل احمد بی اے ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۱۹۴۳ء صفحہ ۵۰)

کی بنا پر ہر کس و ناکس کے لئے ان کا گھر مسافر خانہ بنا ہوا تھا۔ عاجزوں کے حرف تلخ سنتے اور شربت کے گھونٹ کی طرح چڑھا جاتے[۱ھ]۔ ہمت اور دوست نوازی میں قاضی سعید الدین[۲ھ] خاں ان کے جانشین ہیں اور علم کے اعتبار سے کہتے ہیں کہ مولوی حکیم[۳ھ] الدین اور مولوی علیم الدین[۴ھ] ہیں مجھے ان دونوں بزرگوں کی

۵ھ قاضی نجم الدین ولد مولوی حمید الدین قصبہ کاکوری کے ملک زادگان میں سے تھے ۱۵ ربیع الاول ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء کو کاکوری میں پیدا ہوئے ۱۵ سال کی عمر میں علوم مروجہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے شروع میں قصبہ آسیون نواح لکھنؤ کے مدرسہ میں مدرس تھے حکومت کمپنی نے جب بنگال میں قاضی القضاۃ کا منصب قائم کیا تو قاضی نجم الدین کاکوروی کا اس پر تقرر ہوا تقریباً پچیس ۲۵ سال اس عہدے پر فائز رہے اور نہایت نیک نام رہے قاضی نجم الدین نے حکومت کمپنی کے حکم سے فقہ پر فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی جو کلکتہ میں سرکار کے حکم سے چھپی تھی اور مفتیان عدالت کے لئے نہایت کام کی چیز تھی ایک دوسرا رسالہ جبر و مقابلہ لکھا تھا یہ بھی کلکتہ میں طبع ہوا تھا، شعر و سخن کا بھی شوق تھا طبیعت نہایت موزوں تھی۔ ثاقب تخلص فرماتے تھے صاحب نفحۃ الیمن نے قاضی نجم الدین کے کلام کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں انتقال ہوا۔ مولوی فتح علی جونپوری نے قطعہ تاریخ کہا ہے۔

بحر حکمت شمس ملت نجم دیں قاضی قضاۃ چونکہ در باغ جہاں با حور عین ہمدوش گشت

سر فرو بردم پئے تاریخ ودد گوشم رسید علم و فضل و درس وز ہمدردیں ہمرپوش گشت

سیر اودھ از مولوی مسیح الدین کاکوروی مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۲۹ء ص ۱۰-۲۴، تذکرہ علمائے ہند ص ۵۰۹-۵۱۲، تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۴۳۲-۴۳۸ و نزہۃ الخواطر جلد ہفتم ص ۴۹۷-۴۹۸ نفحۃ الیمن از شیخ احمد شیروانی مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء ص ۱۴۶۔

۵ھ[۲] قاضی سعید الدین قاضی نجم الدین کاکوروی کے فرزند اول تھے ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ نہایت لائق اور فاضل تھے اول قاضی عدالت دائرہ سائرہ اور پراونشل کورٹ اضلاع متعلقہ بریلی (روہیل کھنڈ) کے تھے اس کے بعد آپ نواب خورد سال فرخ آباد کے نائب مختار ہوئے ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء میں انتقال ہوا سیر اودھ ص ۲۷، تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۸۹-۱۹۳؛ عہد بنگش ص ۲۰۶۔ ۵ھ[۳] مولوی حکیم الدین قاضی نجم الدین کے فرزند دوم تھے علوم مروجہ کی تحصیل نہایت شوق سے کی حکومت کمپنی کی طرف سے کانپور میں مفتی عدالت، صدر امین اور صدر الصدور رہے ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء میں انتقال ہوا سیر اودھ ص ۲۷ و تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۳۲-۱۳۳)

۵ھ[۴] مولوی علیم الدین، قاضی نجم الدین کے فرزند سوم تھے نہایت لائق، فاضل، ذہین اور ذکی تھے سرکار کمپنی کی طرف سے مفتی صدر الصدور رہے وجع الصدر کے عارضے میں فوت ہوئے ان کے صاحبزادوں میں مولوی ریاض الدین اور مولوی مسیح الدین مشہور ہوئے ہیں مولوی مسیح الدین صاحب واجد علی شاہ، بادشاہ اودھ کے مقدمہ کی پیروی کے لئے لندن گئے تھے۔ مولوی مسیح الدین کا انتقال ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں ہوا۔

(۱) سیر اودھ ص ۲۴-۲۸ (۲) تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۲۷۴-۲۸۱ (۳) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۲۸۷-۲۸۹

زیارت ابھی تک نصیب نہیں ہوئی اور مولوی خلیل الدین[۱] خاں ہندوستانی اور انگلستانی اُمراء میں اب بھی تمام خاندان سے زیادہ نامور ہیں مگر میں نے ان بزرگوار کو کبھی دور سے دیکھا ہے اور فن ریاضی کی تمام قسموں میں ان کی مہارت کا کمال سُنا ہے۔ ایک مختصر رسالہ ظل مثلث کے ابطال میں لکھا ہے مجھ جیسا شخص جو جملہ فنون خصوصًا فن رویۃ المحال سے بے بہرہ ہے اس کتاب کے مطالب تک نہیں پہونچ سکتا ہے اگر کوئی اس کے چھپوانے کی ہمت کر جائے تو دُنیا کے مہندس بالخصوص دانایان فرنگ اس کے جذر اصم کو فرصت کے وقت تفریح طبع کا مشغلہ سمجھیں گے۔

فضل مولا خاں:- تخلص فضل ہے قاضی سعید الدین خاں کے ہمراہ اس شہر میں وارد ہوئے فن مصاحبت میں یکتا تھے جو شخص بھی اس کام میں ان کے مقابلہ پر آتا یقینًا زک اُٹھاتا۔ ان کے صاحبزادے کہتے تھے کہ اگر ان کو ابو زید سروجی دیکھ لیتا تو ان کی عربی فارسی اور ہندی غزلوں اور قصیدوں کو اساتذۂ سلف کا ہم پایہ بتاتا، اور اگر کوئی واقف ہو جاتا تو چوری کی تہمت ان پر رکھتا، اُس زمانے میں نواب مرشد آباد کی سرکار میں رسوخ پیدا کر لیا تھا، ابھی پیٹ بھر روٹی نہ کھائی تھی کہ موت نے کہا اُٹھو اور تلخ شربت پیو۔

حکیم احمد علی خاں:- اسی شہر میں حکیم احمد علی خاں ہیں جو مہاراجہ کلیان سنگھ مخاطب بہ راجا بہادر فرزند راجا شتاب رائے نائب صوبہ بہار کے رفیق ہیں چیت پور میں بندے (مولوی عبدالقادر) کے حال پر نوازش کی اور فرمایا کہ عشرہ محرم ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۳ء کے بعد جو آنے والا ہے مہاراجہ سے ملاقات کرو میں نے کہا کہ تقریب کون کرائے گا ایک مسلمان کا نام زبان پر لانے میں نے پوچھا کیا وہ عرض بیگی (اطلاع کنندہ) ہے فرمایا، نہیں بلکہ مہاراجا کا سالا ہے میں نے کہا مجھے کیا جانے، کہا کہ میری زبانی تمہارا نام سُنکر مشتاق ہیں کسی روز ہم تم ساتھ چلیں گے میں نے کہا ایسے عالی ہمت کو جو ہندوؤں کو بھی اپنی عام مہربانی سے محروم[۲] نہیں رکھتا شکم پروری کے لئے تکلیف دینا مناسب نہیں آخر میں مسلمان ہوں، ہندوؤں سے زیادہ میرے ساتھ مراعات کی اُمید ہے میرے شفیق حکیم صاحب نے فرمایا کہ ایسے تکلفات کی پابندی کے ساتھ اس زمانے

---

[۱] مولوی خلیل الدین، قاضی نجم الدین خاں کے فرزند چہارم تھے ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء میں پیدا ہوئے نہایت لائق فاضل تھے علم ہیئت و ریاضی میں بڑا دخل تھا، سرکار اودھ میں نہایت اعزاز رکھتے تھے مختلف کتابوں کے مصنف تھے ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء میں انتقال ہوا (۱) سفر اودھ ص ۲۵ (۲) تاریخ اودھ حصہ چہارم (۳) تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۳۶ و ۱۵۱۔

[۲] یہ اس واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے اس شخص کی رشتہ داری راجا کلیان سنگھ سے تھی۔

میں بسا اوقات دشوار ہے میں نے کہا کہ بزرگوں کی دعا سے آسان ہو جائے گی۔

روانگی مرشد آباد:۔ ہر چند دل نہیں چاہتا تھا کہ حافظ احمد کبیر سے رخصت ہو جاؤں اور وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں یہیں (کلکتہ) رہوں۔ مگر کئی باتوں سے مجبور ہوا ایک تو ڈھاکہ میں کرم فرماؤں سے وعدہ کیا تھا کہ قبلہ گاہی کی زیارت کو جاتا ہوں دوسرے قبلہ گاہی کے حکم کی تعمیل کہ جس قدر ممکن ہو جلد اپنے کو میرے پاس پہونچاؤ۔

دل پر پتھر رکھ کر پچھم کو چل دیا۔ مرشد آباد کے قریب پہونچا تھا کہ رات کے وقت کشتی میں چوری ہوئی سبب یہ ہوا کہ چنگی کے چپراسیوں نے آکر تمام سامان درہم برہم کر دیا اور کچھ عرصہ تک کشتی کو چلنے سے روک دیا سامان نہ دیکھنے کی صورت میں کچھ رشوت چاہتے تھے میں نے کہا سامان دیکھ لو اور جو سوداگری کا سامان سمجھو وہ لے لو انھوں نے دیکھا مگر کچھ نہ پایا صندوقچے کو بھی اٹھایا وزنی پایا اس میں جو کچھ تھا قصداً چھوڑ دیا اور لوگ جمع ہو گئے تھے وہ صندوقچہ ساتھ والے آدمیوں کے تساہل سے اوپر ہی رہ گیا حالانکہ ہمیشہ نیچے کے درجہ میں رہتا تھا روزانہ یہ دستور تھا کہ رات کے پہلے حصہ میں میں جاگتا تھا بعد کو یکے بعد دیگرے ایک ایک آدمی حفاظت کرتا تھا ابھی سب لوگ جاگ رہے تھے میرا ارادہ بھی سونے کا نہ تھا مگر بستر پر لیٹ گیا کہ آنکھ لگ گئی لوگوں نے مجھے بیدار نہ کیا اور سو گئے دو گھڑی بعد جب میری آنکھ کھلی تو سب کو سوتا پایا اور کھڑکی کھلی دیکھی لوگوں کو جگایا دیکھا کہ صندوقچہ جاتا رہا، ہائے ہائے کرنے لگے اور کہنے لگے کہ یہ کام ملاحوں کی سازش سے ہوا ہے میں نے کہا کہ اب شور مچانے سے کیا فائدہ جو کچھ ہوا میری نادانی سے ہوا گزشتہ پر افسوس بیکار ہے آئندہ کے لئے ہوشیار رہو چور کے لئے سامان بہت ہے صبح کو کشتی مرشد آباد پہونچ گئی نقد ایک روپیہ بھی پاس نہ رہا۔

مرشد آباد میں میر گدائی کے مکان کے قریب اس آقا فردوش[1] کے ذریعے جو نواب شمس الدولہ کو مصیبت میں ڈال کر انگریزی سرکار سے سالانہ وظیفہ پاتا تھا دو روپے ماہوار کے کرایہ پر ایک مکان لے لیا اور ملاحوں کو جو عظیم آباد تک کشتی کا کرایہ پیشگی دے دیا تھا ان سے مرشد آباد تک کا حساب کر کے واپس لے لیا . . .

. . . میں نے یہ بھی چاہا کہ دو شالہ، پالکی اور دوسرے تانبے کے برتن فروخت کر کے جس طرح آیا ہوں اسی

۱؎ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ آقا فردش کون تھا۔

طرح واپس ہو جاؤں لیکن جلدی میں یہ بھی نہ ہو سکا آخر ڈیڑھ سو روپیہ کا خریدا ہوا دوشالہ نوے روپے میں بیچکر ہمراہیوں کی تنخواہ ادا کی جو باقی بچا روزمرہ کے خرچ میں لایا۔

اعیان مُرشد آباد:- جن بزرگوں نے ڈھاکہ سے آنے والوں کی زبانی بندہ (مولوی عبدالقادر) کا نام سن لیا تھا مجھے دیکھنے آئے بلکہ دیکھنے سے زیادہ محض احباب کے حسن بیان کی خبر پر اعتماد کر کے ڈھاکہ والے جیسے شفیقوں کی طرح مہربانی کرنے لگے۔

مرزا احمد:- سب سے پہلے مرزا احمد صاحب نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا مرزا صاحب اپنے باپ کے تمام اندوختہ کو بے اندازہ دادودہش اور مقاصد میں برباد کر کے نظامت کے سالیانہ پر قناعت کئے ہوئے تھے یہ سالیانہ سدرمق سے زیادہ نہ تھا اور خط نسخ کے خوش نویس تھے، طرح طرح کی باتیں کیں۔ تھوڑی دیر نشست رہی اور چلے گئے۔

مرزا حسین بخش:- دوبارہ مرزا احمد، مرزا حسین بخش کو جو فارسی عبارت اچھی لکھتے تھے اور تمیز دار آدمی تھے اپنے ساتھ لائے۔

بہادر علی خاں:- دوسرے روز مرزا صاحب نے بہادر علی خاں سے جو سنبھل کے باشندے اور نواب امین الدولہ انصاری کے خاندان سے تھے بندہ کا ذکر کر دیا وہ بھی بمقتضائے حُب وطن اس ناچیز کو دیکھنے آئے۔

میر محمد علی:- ایک روز نہ معلوم کس نے کہہ دیا کہ نواب مبارک الدولہ کے پوتے میر محمد علی نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا میر محمد علی خط نستعلیق خوب لکھتے تھے اور گھوڑے کے اچھے سوار تھے، اس آوارگی سے جو مبارک الدولہ کی اولاد میں عام ہے الاماشاء اللہ علیحدہ رہتے تھے، دیر تک نشست رہی اور فرمایا کہ کبھی کبھی میرے پاس آکر میرا دل خوش کر دیا کرو میں نے کہا ضرور آستاں بوسی سے استفادہ کروں گا۔

شریف احمد:- مخدوم زادہ شریف احمد جو سرہند کے بزرگ زادوں میں ہیں اور بچپن میں رامپور میں انھوں نے مجھے دیکھا تھا میری خبر سنکر میرے پاس پہونچے اور سعادت علی خاں کو جو فخر الدین حسین خاں زمیندار گھوگھرہ کے مختار تھے میرا مشتاق بنا لائے ان بزرگوں کی دید باز دید میں ایک مہینہ گزر گیا۔

میر حسین:- مرزا حسین بخش ممدوح کے مکان پر ایک دو مرتبہ میر حسین صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو میر حسن کے بھائی اور نواب سید زین الدین علی خاں مخاطب بہ بلند اقبال سے بھائی چارہ رکھتے تھے، صلحاء اور پرہیزگاروں کی سی وضع رکھتے تھے فقہ امامیہ کے مسائل جزئیہ پر بیحد توجہ تھی۔ علم کلام۔ اصول فقہ، حدیث

رجال، علوم عربیہ ادبیہ اور حکمت فلسفہ میں بھی مہارت تھی۔

حکیم معین الدین خاں:۔ اسی شہر میں حکیم معین الدین خاں کو سعادت علی خاں کے مکان پر دیکھا جو شاہجہاں آباد کے قدیم باشندے ہیں اور آج کل باندہ میں نواب ذوالفقار بہادر کی سرکار میں ہیں، علاوہ فنِ طب کے دوسرے رواجی فنون سے بھی آشنا ہیں۔ پھر رسم دید باز دید بھی درمیان میں آگئی۔

نواب یعسوب الدین علی خاں:۔ ایک دن مرزا احمد صاحب نے نواب یعسوب الدین علی خاں کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل کرایا جو نواب مبارک الدولہ کے داماد تھے فارسی میں پختہ تحریر تھی کتب تواریخ و حدیث پر بھی عبور تھا مہذب امیر سمجھے جاتے تھے شام کی نماز کا وقت تھا میں نے وہیں نماز ادا کی شاید پہلے سے امامیہ مذہب کے دوستوں کی ستائش پر مجھے شیعہ سمجھے ہوں گے اکثر ہر مذہب کے بزرگوں کے نزدیک بھلائی ان ہی کے مذہب میں منحصر ہے میری دست بستہ نماز کو بری نظروں سے دیکھنے لگے[۱] مگر فرط اخلاق کی وجہ سے زبان پر نہ لائے تاکہ رنج کا سبب نہ بن جائے پھر کہا کہ ایک مدت سے سعدی کی دو بیتیں خوب سمجھ میں نہیں آتیں اگر بیان کر دو تو تمہاری یادگار رہے گی۔

گل سرخش چو عارض خوباں	سنبلش ہمچو زلف محبوباں،
پھول جیسے حسین رخسار ہے	تار سنبل ہے زلف بھی ہالے
ہمچناں کز نہیب برد عجوز	شیر ناخوردہ طفل دایہ ہنوز
ماہے سردی کے چھ مری بڑھیا	اور نازک ہو نو ولد بچہ،

میں نے کہا جناب کے سامنے اس طریقے کی باتیں بگھارنا ہندوستان میں مرچ اور کرمان میں زیرہ بھیجنا ہے مگر حکم سے سرتابی کرنا اس سے زیادہ بڑا ہے اگر میں درست کہدوں تو جناب کا فیض صحبت ہے ورنہ بندہ سرتاپا خطا ہے میں نے کہا کہ لفظ ہمچناں کا تعلق پہلی بیت سے ہے اور برد عجوز سردی کی زیادتی کے چھ دن ہیں جو آخر میں ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ پھول اور سنبل اس وقت ایسے معلوم ہو رہے ہیں کہ سردی کے خلل سے بچہ ان کا دودھ ہی نہیں پیتا کیونکہ وہ سردی سے جم گیا ہے یا یہ کہ سردی کی تکلیف سے

---

[۱] مولوی عبدالقادر اہل سنت وجماعت کے طریقہ پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھ رہے تھے اور چونکہ یہ طریقۂ نماز امامیہ مذہب کے مطابق نہ تھا۔ اس لئے نواب یعسوب الدین خاں نے اظہار نفرت کیا۔

یہی گل و سنبل شیر ناخوردہ بنے ہوئے تھے شیر ناخوردہ مجاز ہو جائے گا آب نا رسیدہ سے اور مناسبت طفل سے لفظ دایہ استعمال کیا گیا۔ انھوں نے سنا خواہ میری بات دل نشیں ہوئی ہو یا میری خاطر[1] سے پسند کر لیا ہو۔

نواب دلاور جنگ کے یہاں علمی صحبت:۔ ایک دن مرزا حسین بخش نے نواب دلاور جنگ کے فرزند صولت جنگ کی خدمت میں باریاب کیا ایسے گفتار و کردار کا نوجوان امیرزادہ اس ملک میں تو کیا کہیں اور بھی کم ملے گا، امیرانہ شان محفوظ رکھتے ہوئے شرفاء کی انتہائی دلجوئی ملحوظ رکھتے تھے جیسے ہی میں نے دروازے میں قدم رکھا وہ ایک کمرہ سے باہر آئے اور وہیں بغل گیر ہو گئے اور دوسرے کمرے میں لیجا کر بٹھایا پھر جب دیکھا کہ میں جانا چاہتا ہوں تو خدمت گار کو اشارہ کیا چند قسم کے عطر لا کر ان کے سامنے رکھدیئے، مجھے اشارہ کیا کہ یہاں پر ہندوستان جیسے اچھے عطر تو شاید کم ملیں گے" تاہم ان قسموں میں سے کوئی پسند کرو تھوڑا تھوڑا میں نے سبکو سونگھ کر دیکھا اور سب کی تعریف کی. کہنے لگے اگر چاہو تو اور کمروں کی بھی سیر کر لو میں نے کہا جیسا ارشاد ہو، اُٹھے میں ان کے پیچھے پیچھے چلدیا اور رخصت ہو کر اسی دروازے سے باہر نکلا، جس سے داخل ہوا تھا اور وہ محل سرا میں رونق افروز ہو گئے اگر بنظر غائر دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ گھر کے دروازہ ہی پر استقبال ہوا اور وہیں تک مشایعت ہو گئی رُخصت کے وقت عطردان دے دیا، اس کے علاوہ کچھ نہ کیا اور اسی مجلس میں کہا کہ اگر کچھ عرصے یہاں رہو تو مجھے اصطرلاب کا شوق ہے حاجی باقر جو ہمارے شہر کے فاضل ہیں اس مسئلے کو اچھی طرح ذہن نشین نہیں کرا سکے" وہ چاہتے ہیں کہ منقول کی طرح معقول کو بھی ان سے تسلیم کر لوں میں نے گزارش کی کہ ان ظروف مدور کی باتیں جیسی کہ میں سمجھتا ہوں خدا ہی جانتا ہے. فرمایا ایک صفحہ پر تین دائرے ایک مدار راس الجدی دوسرا مدار راس الحمل تیسرا مدار راس السرطان کس طرح کھینچتے ہیں میں نے عرض کیا کہ پہلے مدار راس الجدی کا دائرہ جتنا بڑا چاہیں

---

[1] مؤلف نے جو شرح بیان کی ہے اس میں اِغلاق ہے شیخ سعدیؒ اصل میں گلاب اور سنبل کی مدح سرائی کرتے ہیں اور ہر ایک میں دو دو باتیں ثابت کرتے ہیں گلاب میں حسن اور نزاکت اور سنبل میں باریکی اور پیچ در پیچ ہونا. گلاب کے حسن کی تشبیہ عارض خوباں سے دی ہے اور نزاکت کی تشبیہ اس بچہ سے دی ہے جس نے پیدا ہو کر ابھی دودھ نہ پیا ہو سنبل کی باریکی زلفِ محبوبان کے مشابہ ہے اور اس کی پیچیدگی و شکن دار ہونا ایسا ہے جیسے کوئی بڑھیا سردی کی وجہ سے سُکڑ مکڑ کے بیٹھ گئی ہو (محمد ایوب قادری)

کھینچ لیں اور اس میں دو خطوط مستقیم ایک دوسرے کو مرکز پر عمودی حالت میں کاٹتے ہوئے کھینچ لیں ایک کا نام نصف النہار اور دوسرے کا خط اعتدال رکھیں اب نصف قطر (خط نصف النہار کا نصف) کو برابر کے سات حصوں پر تقسیم کریں اور ابتداء خط سے پانچویں نشان کو مرکز قرار دے کر۔ پہلے دائرے سے ملا ہوا ایک دائرہ کھینچیں یہ دائرہ منطقۃ البروج ہوگا پھر پرکار اصل مرکز پر رکھ کر جہاں منطقۃ البروج خط اعتدال کو کاٹ رہا ہے ایک دائرہ کھینچیں یہ دائرہ منطقۃ البروج ہوگا پھر پرکار اصل مرکز پر رکھ کر جہاں منطقۃ البروج خط اعتدال کو کاٹ رہا ہے ایک دائرہ کھینچیں یہ مدار راس السرطان شکل یہ ہے۔
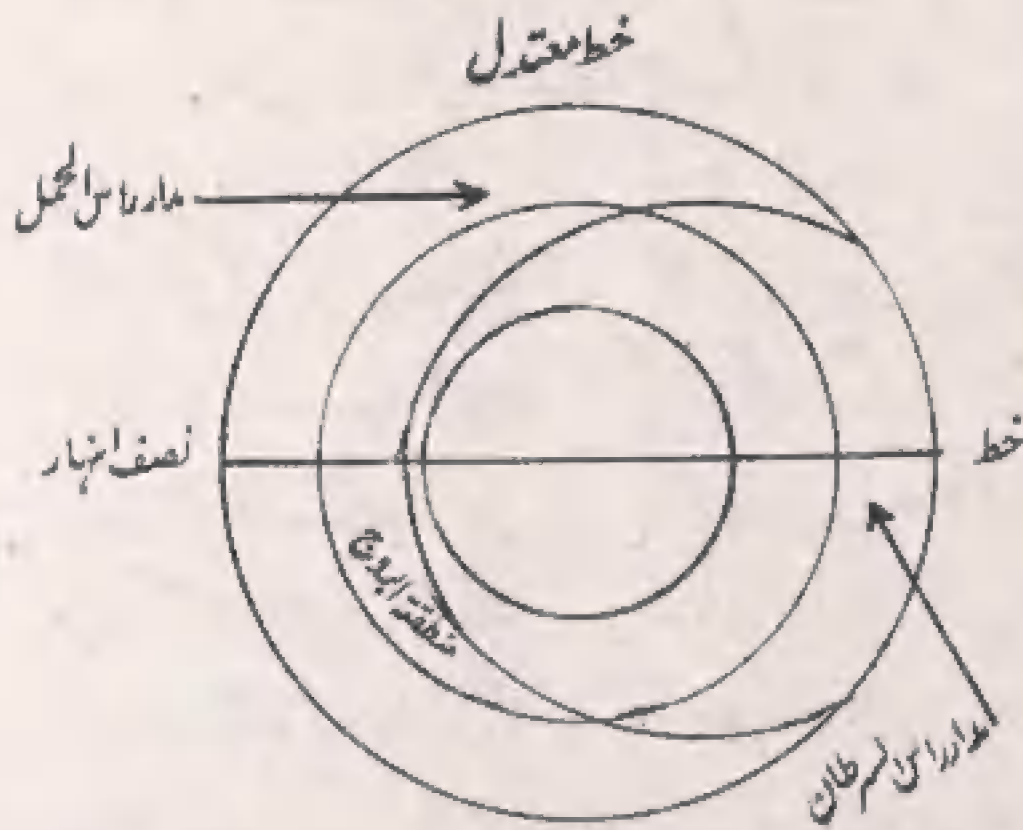
یہ اس لئے ہے کہ فلک میں تقاطع معدل النہار اور منطقۃ البروج واقع ہے۔ صفحہ میں بھی لازمی ہے کہ وہ خط اعتدال کو جو بمنزلہ معدل النہار کے ہے دو جگہ قطع کرے اور وہاں پر اگرچہ مرکز منطقہ اور معدل ایک ہے مگر قطب ہر ایک کا جداگانہ ہے لیکن صفحہ میں یہ شکل (۵ مقالہ ۳) اصولاً دوائر منطقۃ الاقطاب متقاطع بہ کرہ کا ایک مرکز پر کھینچنا محال ہے پھر مدار راس الحمل اور اسی طرح مرکز مدار راس سرطان و جدی علیحدہ علیحدہ ہیں لیکن تینوں کے قطب وہی معدل والے قطب ہیں اور کرہ کے متحد الاقطاب دائرے صفحے میں ایک مرکز پر آتے ہیں اور مدار راس الحمل اور مدار راس المیزان کرہ میں برابر ہیں ایک مدار راس معدل اور منطقۃ البروج کے شمالی تقاطع کی جانب ہے اور دوسرا جنوبی تقاطع کی جانب۔ لامحالہ صفحہ میں یکساں ہیں۔ اور وہی ایک دائرہ دو مقام یعنی تقاطع منطقۃ البروج اور خط اعتدال پر قطع کرتا ہے اور ان دونوں

مقاموں کا نام "دو اعتدالی نقطے" ہے اور مدار راس الجدی چونکہ معدل اور منطقۃ البروج سے بہت دور ہے اور ایسے ہی مدار راس السرطان ضروری ہے کہ منطقۃ البروج کے ایک نقطہ پر ہر ایک مل جائیں اور جب نصف قطر کے ساتوں حصوں کو دوگنا کیا تو سب چودہ ہو گئے اور جب پانچ کو دوگنا کیا تو سب دس ہوئے مرکز صفحہ کے ایک جانب سات اور دوسری جانب تین۔ جس وقت مدار راس السرطان کے مرکز پر ان سات قسموں میں سے تین قسم کے فاصلہ پر دائرہ کھینچیں تو لامحالہ منطقۃ البروج سے مل جائے گا۔

نواب دلاور جنگ اس تقریر کو غور سے سُنکر خوش ہوئے اور پوچھا اس فن کی کوئی کتاب تمہارے پاس ہے میں نے کہا نہیں، جو کچھ ہے بس یہی ناچیز ہے۔ البتہ مرزا حسین بخش صاحب کو بندے کے مکان پر بھیجدیا جائے اگر کوئی کتاب اس فن کی ان کو مل جائے تو جناب کی نذر ہے

چہ کار آیدت نامہ دیگراں	مگر بہر افسانۂ باستاں
نہ کام آئیں گی کوئی تیرے پرائی	کتابیں نہ ہوں جن میں قصے کہانی
سخن راکہ باشد خرد ذیخ و بن	تو از دیگراں گد یہ آں مکن
تجھ میں جو آجائے تیرے سخن	تو پھر دوسروں سے بھکاری نہ بن
بدل جو کہ بہتر زجام جم است	کہ جام از دل جم زور بانم ست
مطالعہ کرو پہلے تم اپنے دل کا	کہ ہے جام جمشید دربان دل کا

بہادر علی خاں اور دوسرے احباب نے نواب بلند اقبال کے سامنے جس طرح چاہا میرا نام لے دیا۔ دوستوں کی چرب زبانی کی بناء پر ان کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے کہ اگر تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھ جایا کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ زندگی بھر ہمارے ہی پاس رہ جائے اور لوگوں کی رائے ہے کہ ایسی خوبیوں کا ایک شخص ہمارے پاس رہنا چاہیئے کیونکہ اس کساد بازار عالم میں انسان بہت کم ملتا ہے اس کے بعد پوچھا کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ ایک نے کہا سُنی۔ دوسرے نے کہا شیعی۔ ایک گروہ نے کہا کہ معلوم نہیں۔

میں نے جب یہ تذکرہ سُنا تو اپنے دوستوں سے کہہ دیا کہ نواب کی ملازمت سے مجھے باز رکھیں کیونکہ ایک سرمایہ دار ہندو کے برابر میری وقعت نہیں ہو سکتی خود بدولت (نواب صاحب) سیٹھ کے مکان پر تشریف فرما ہوتے ہیں، مجھے امامت، مجتہدی، امام باڑے کی تولیت یا حج و زیارت کی نیابت کی خواہش نہیں ہے۔ پھر اگر ایسی گفتگو درمیان میں آئی تو آزادانہ جواب دوں گا جس کا انجام مجھے اپنے اور مہربان کے لئے اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

میں نے بہت جلد سفر کی تیاری کردی یہ ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۳ء کی روداد تھی اس وقت کلکتہ کے گورنر ماٹرا[51] اور مرشد آباد کے ناظم سید زین الدین علی خاں بلند اقبال تھے جو نواب دلیر جنگ عرف ببر جنگ کے فرزند ہیں اور وہ نواب صادق علی[52] خاں میرن کے علاقی بھائی نواب مبارک الدولہ[53] کے لڑکے ہیں اور یہ فرزند ہیں جعفر علی[54] خاں

---

[51] ۴؍ اکتوبر ۱۸۱۳ء کو لارڈ منٹو مستعفی ہوئے اور لارڈ ماٹرا ان کے عہدے پر مقرر ہو کر آئے اس کے عہد میں راجہ نیپال سے لڑائی ہوئی اور اس علاقہ کا بڑا حصہ ۱۸۱۵ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا ۱۸۱۸ء میں رعایا کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک انجمن اسکول بک سوسائٹی کلکتہ میں قائم کی اور اس کے ذریعہ سے جابجا اسکول جاری ہوئے، ۱۸۱۹ء میں ڈھاکہ میں بچوں کی تعلیم کے لئے ایک مکتب جاری ہوا، اور شہر کے رؤسا عمائد نے اس مکتب کی حمایت کی اور انگریزوں نے بھی اس کی بڑی تائید کی اور بہت سے طلبہ اس میں داخل ہوئے ۱۸۲۳ء میں لارڈ ماٹرا راہی انگلینڈ ہوئے اور ان کی جگہ لارڈ امہرسٹ آئے۔ (تواریخ ڈھاکہ ص ۱۲۴، ۱۲۵)

[52] میر جعفر کا فرزند تھا اسی کے حکم سے نواب سراج الدولہ قتل ہوا تھا میر جعفر نے بوجہ کبرسنی کے میر صادق علی خاں کو انتظام حکومت میں دخیل کیا اس نے رعایا کو تنگ اور ناراض کیا اور مخلوق پر ظلم ڈھائے گھسیٹی بیگم و آمنہ بیگم دختران علی وردی خاں کے مال و اسباب کو ضبط کر لیا اور ان عورتوں کو دریا میں ڈوبو دیا مگر منتقم حقیقی کی گرفت سے کون بچتا ہے اس کے اوپر بھی ٹھیک ایک ماہ کے بعد بجلی گری اور ۲۰ جنوری ۱۷۶۰ء کو یہ ظالم کیفر کردار کو پہونچا اس کا لڑکا نواب دلیر جنگ عرف ببر جنگ تھا۔

(تاریخ ڈھاکہ ص ۱۰۴، ۱۰۹ تاریخ جدید صوبہ اڑیسہ وبہار ص ۲۰۴)

[53] نواب مبارک الدولہ پسر چہارم میر جعفر خاں نواب سیف الدولہ کے بعد مسند نشین نظامت ہوا اس کے عہد میں مشاہرہ نواب ناظم کا پچاس لاکھ سے سولہ لاکھ ہوا ۱۷۹۵ء میں انتقال ہوا، اس کے بعد اس کا بیٹا ناصر الملک ببر جنگ جانشین ہوا۔ مبارک الدولہ ہمیشہ لہو و لعب میں مشغول رہتا تھا انتظام کا مادہ بالکل نہ تھا۔ برسات میں ایک کشتی بنا کر دریا میں چھوڑتا اور اس پر روشنی کرتا اور خواجہ خضر کی نیاز میں ہزاروں روپیہ صرف کرتا اسی طرح ہولی اور دیوالی کے مراسم خود ادا کرتا اور ہزاروں روپیہ ان تقریبات پر صرف کرتا انتظام ریاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صاحب سیر المتاخرین نے اس کے حالات تفصیل سے اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔

تواریخ ڈھاکہ ص ۱۱۴، ۱۳۱، سیر المتاخرین از غلام حسین طباطبائی (نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۷ء ص ۸۲۱، ۸۲۳)

[54] نواب جعفر علی خاں ملت فروش اور غدار اعظم تھا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن

ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن

(باقی ۱۵۰ صفحہ پر)

کے جو سراج الدولہ[1] جانشین مہابت جنگ[2] کی جان و ریاست کا غاصب تھا نمازی بھی ہے اور شراب خوار بھی، نیکی اور بدی کا پلہ برابر رکھتا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ مبارک الدولہ کی اولاد میں نواب میر جنگلی ریاست کے شایاں ہے، لیکن بندے نے اس کو نہیں دیکھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹ سے آگے) دوسری جگہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

کے شب ہندوستان آید بروز
مرد جعفر، زندہ روح او ہنوز
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است
ایں مسلمانے کہن ملت کش است

[1] نواب علی وردی خاں ناظم بنگالہ کے انتقال کے بعد ۱۰ اپریل ۱۷۵۶ء کو اس کا نواسا نواب سراج الدولہ پسر نواب زین الدین خاں بنگال و بہار کی حکومت پر مسند نشین ہوا جنگ پلاسی میں انگریز کامیاب ہوئے سراج الدولہ نے راہ فرار اختیار کی۔ انگریزوں اور میر جعفر سے پہلے سے سازباز تھی لہذا میر جعفر کو مسند نشین کیا۔ سراج الدولہ راج محل سے گرفتار ہو کر مرشد آباد لایا اور میر محمد صادق خلف میر جعفر کے حکم سے قتل کیا گیا۔ میر جعفر سے جب انتظام درست نہ ہوا تو انگریزوں نے اس کو دست بردار کر کے اس کے داماد میر قاسم کو بٹھایا مگر میر قاسم نے انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننا گوارا نہ کیا اور ان سے مقابلہ کیا ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ ہوئی پھر دوبارہ میر جعفر کو باوجود ضعیف اور جذام میں مبتلا ہونے کے مسند نشین کیا مگر ۱۷۶۵ء میں میر جعفر مر گیا۔ (تواریخ ڈھاکہ ص ۹۷، ۱۱۱ تاریخ جدید صوبہ اڑلیسہ و بہار ص ۲۰۵، ۲۸۱)

Glimpses of old Dokah - P - 145 - 162

[2] مرشد قلی خاں کے بعد اس کا داماد شجاع الدین ناظم بنگالہ مقرر ہوا شجاع الدین کے ایک رشتہ دار مرزا محمد کے دو لڑکے تھے حاجی احمد اور مرزا محمد علی عرف علی وردی خاں شجاع الدین نے ان دونوں بچوں کی تربیت کی علی وردی خاں بڑا شجاع بہادر اور دلیر تھا۔ مختلف عہدوں پر ممتاز رہا شجاع الدین کے بعد اس کا لڑکا سرفراز خاں ناظم بنگالہ مقرر ہوا مگر علی وردی خاں نے بادشاہ دہلی سے نظامت بنگال کی سند حاصل کر لی اور سرفراز خاں کو قتل کر دیا ۱۷۴۱ء میں علی وردی خاں حسام الدولہ شجاع الملک مہابت جنگ ۶۵ سال کی عمر میں بنگال و بہار و اڑلیسہ کی نظامت پر سرفراز ہوا علی وردی بڑا شجاع اور زیرک صوبہ دار تھا ۱۹ اپریل ۱۷۵۶ء کو علی وردی خاں کا انتقال ہوا چونکہ کوئی اولاد نرینہ نہ تھی اس لئے سراج الدولہ اسکا نواسہ اس کا جانشین ہوا۔ (تواریخ ڈھاکہ ص ۹۷-۹۵، تاریخ جدید اڑلیسہ و بہار ص ۲۵۰، ۲۸۵)

Glim pese of old Dhake - P - 136 - 144

حالات مُرشد آباد :- مُرشد آباد مرشد قلی خاں[1] کا آباد کردہ ہے۔ اکثر محلے وباء سے ویران ہو گئے ہیں۔ مبارک الدولہ کا خاندان ..... بڑا عالی ہمت ہے یہ لوگ آمدنی سے زیادہ خرچ کرڈالتے ہیں، شراب، رنڈی، ناچ، رنگ وہاں بلائے عام ہے زاہد نام اسی کا ہے خرقہ پہن لے مگر لوگ مانوس مزاج اور مسافر نواز ہیں وہاں کے تمام رئیس امامیہ مذہب ہیں، تجارت پیشہ، دوکان دار، اہل حرفت اور روزگار پیشہ سنّی اور شیعہ دونوں ہیں۔

ایک نیا مذہب جس کو نودیہ کہتے ہیں[2] محمد شاہ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا جس کی تفصیل سیر المتاخرین

---

[1] مرشد علی خاں کا اصل نام جعفر خاں تھا اور اس کو نعرا خاں بھی کہتے تھے اس کا باپ ایک مسکین اور تنگ حال برہمن تھا حاجی شفیع نامی کوئی ایرانی تاجر مرشد قلی خاں کو خرید کر اصفہان لے گیا وہاں اس کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کی حاجی شفیع کی وفات کے بعد مرشد قلی خاں پھر ہندوستان آیا اور دکن میں صوبیدار کی ملازمت کرلی اور اپنے کام کو بڑی قابلیت سے انجام دیا۔ سنہ ۱۷۰۱ء میں دیوانی بنگال پر سرفراز ہوا اور یہاں کے انتظام کو بہت توجہ سے درست کیا شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اس سے بہت خوش ہوا بنگال و بہار کی نظامت سپرد کی سترہ سال تک بنگال و بہار و اڑیسہ کی نظامت پر سرفراز فرمایا ۱۷۲۵ء میں انتقال ہوا (تواریخ جدید صوبہ اڑیسہ بہار ص ۲۳۹، ۲۴۰، تواریخ ڈھاکہ ص ۷۰، ۹۰)

The Roman of an Eastern capital h.P 183-190

Glimpses of old Dhaka - P114-120

[2] مشہد کا رہنے والا ایک شخص محمد حسین تھا وہ اس مذہب کا بانی ہوا۔ اور بیگوکیت کا عقیدہ جاری کیا وہ کہتا تھا کہ ہر اولوالعزم پیغمبر کے نو بیگوک تھے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اول بیگوک حضرت علی بن ابی طالب تھے اور آٹھویں بیگوک امام رضا تھے آٹھویں امام تک امامت اور بیگوکیت جمع رہی اس کے بعد بیگوکیت اس شخص محمد حسین کو ملی اور امامت محمد تقی کو ملی۔ اور خود کو امامیہ مذہب ظاہر کرتا تھا اور اہل سنت کو بتاتا تھا کہ بیگوک اول حضرت ابو بکر صدیق تھے اسی طرح بالترتیب چاروں خلفاء راشدین اور چار اموی و عباسی خلفاء میں سے جو نہایت نیک اور عادل ہوتے تھے بیگوک شمار کرتا تھا اور نواں بیگوک خود کو ظاہر کرتا تھا۔ پانچ وقت کی نماز کے بجائے صرف تین وقت صبح، دوپہر اور شام کی عبادت رکھی تھی اس نے ایک کتاب "اقوزہ متوسر" کے نام سے ترتیب دی اور اس کے مرید "نودیہ" کہلاتے تھے۔ صاحب سیر المتاخرین نے اس نئے مذہب کے بانی کے لڑکوں سے ملاقات کی تھی صاحب سیر المتاخرین نے مفصل حالات لکھے ہیں۔

(ملاحظہ ہو سیر المتاخرین ۴۴۵ - ۴۵۲ و "سراج الدولہ از محمد عمر رضا انور الٰہی"

(انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۲ء، ص ۲۷۱، ۲۸۳)

میں موجود ہے اس فرقے کا سرگروہ "دیدفر" نامی اس وقت اس شہر (مرشدآباد) میں مقیم تھا، اور دیگر شہر بھی اس مذہب کی عید کے دن محفل میں شامل ہوتا تھا۔

صرافے کے ہندوؤں میں سے ایک ہندو کو ہندوستانی بڑا زردار سمجھتے ہیں اور اس کو سیٹھ کہتے ہیں ناگوری الاصل ہے اپنے بزرگوں کا مذہب چھوڑ کر ویشنو طریقہ اختیار کرلیا ہے تمام ہندوستان میں اس کی سرمایہ داری کے قصے مشہور ہیں اور اس کی مالداری کے متعلق طرح طرح کی باتیں جو عقل سے بعید ہیں زبانوں پر ہیں اصل واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دکھنیوں (مرہٹوں) کی لوٹ کھسوٹ کی بناپر شہر کے سرمایہ دار قیمتی جواہرات اس سیٹھ کے مورث کے پاس رکھ کر بھاگ گئے تھے جب دکھنی لشکر واپس ہوگیا اور اس غاصب نے مالکان زر کے آنے کی خبر سنی تو گنگا نہانے چل دیا، اور امانت کی کتاب ساتھ لے گیا بوڑھا تو تھا ہی اور مال کا عاشق تھا پانی میں بیٹھ رہا لوگوں کی بے انتہا قیمتی امانتیں اس کی اولاد کے پاس رہیں۔

نکو ہیدہ کردار باخود ببرد　　زر و سیم واماندگاں را سپرد

بھلے آدمی نے یہ کرتوت کرکے　　دیا مال بچوں کو بے موت مرکے

منزل عظیم آباد:۔ غرض مرشدآباد سے کشتی میں بیٹھکر عظیم آباد[1] تک پہونچا اور ایک روز ٹھہر کر روانہ ہوگیا۔ اس شہر میں ایک درویش شہرۂ آفاق تھا شاہ حمزہ اس کو کہتے تھے میں نے ڈھاکہ میں اس کو دیکھا تھا نہ شریعت کا پابند

---

[1] شہزادہ عظیم الشان پسر محمد معظم (بہادر شاہ) کو ۱۶۹۷ء میں بنگال کی حالات کی درستی کے لئے اورنگ زیب عالم گیر نے بھیجا پھر وہ بہار کی صوبیداری پرنامزد ہوا بڑا بہادر، دلیر اور شجاع تھا شہزادہ عظیم الشان نے پٹنہ کے قلعہ کی ازسرنو مرمت کرائی، اس کے اندر کی عمارات کو بھی درست کرایا، پٹنہ کو بہت کچھ ترقی دی اور یہ شہر عظیم آباد کے نام سے مشہور ہوا شہزادے نے ہر فرقے اور ہر گروہ کے محلے جداگانہ بنائے منصبداران دفتر شاہی کے لئے دیوان محلہ آباد کیا اور امرائے فوج کے لئے لودی کرہ بسایا مغلوں کے لئے مغلپورہ شہزادوں اور امراء کے لئے محلہ کیواں شکوہ آباد کیا عظیم الشان کا مقصد تھا کہ عظیم آباد کو دوسری دلی بناوے مگر موت سے کس کو چارہ ہے جب اس کے والد بہادر شاہ نے ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں لاہور میں انتقال کیا دعوے داروں میں جنگ ہوئی عظیم الشان اس معرکہ میں ضرور کامیاب ہوجاتا مگر بدقسمتی سے اس کی سواری کا ہاتھی عین لڑائی میں بدمست ہوکر ایسا بھاگا کہ شاہزادہ کو لئے ہوئے دریائے راوی میں گر پڑا اور یوں شہزادے نے ملک عدم کی راہ لی۔ (تاریخ جدید صوبہ اڑیسہ بہار ص ۲۳۶، ۲۳۷ تواریخ ڈھاکہ ص ۷۵، Glimpses of old Dhaka. P.111. 118, The Romances of an Eastern capital. P.187. 190 Dacca P 44. 46.

تھا نہ دنیاداری سے آزاد، بھنگ کی خشکی نے اس کے دماغ کو تباہ کر رکھا تھا۔ پریشان کلمات بہت بکتا تھا نادان لوگ ان باتوں کو رموز و معارف سمجھتے تھے ایک شخص اور تھا جس کو ٹکیا شاہ کہتے تھے اس کے پاس کوئلے کے چورے کی ٹکیوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے تھے جو چلم کی آگ کے کام آتے ہیں بظاہر تو دیوانہ ہے مگر خدا عالم الغیب ہے۔

ورود بنارس: چونکہ سفر خرچ پاس نہ رہا تھا بنارس میں اترنا پڑا کچھ اسباب فروخت کیا اور بیس روز وہاں ٹھہرا میر نصیر الدین سے جن سے پیشتر بریلی میں شناسائی ہوگئی تھی پھر ملاقاتیں ہوئیں آخر یہاں سے لکھنؤ کو روانہ ہوگیا، چنگی والوں نے رشوت کے لالچ میں میرے سامان میں سے کپڑے کے چند عدد نکال لئے چاہتے تھے کہ روپئے بھی لے لیں اور . . . . احسان بھی رکھیں میں نے رسید لیکر وہیں چھوڑ دیئے اور ایک درخواست بذریعہ ڈاک کلکٹر کے پاس بھیجکر میر نصیر الدین صاحب کے ذریعے اس کی قیمت وصول کرلی۔ ایک روز جونپور رہا، عمارتوں میں وہاں کا پل اور تختے میں تیل سب جگہ مشہور ہے پھر لکھنؤ پہونچا۔

قیام لکھنؤ: مرزا کاظم شیرازی نے جو نواب (سعادت علی خاں)[1] کے باورچی خانے میں ملازم تھا اور اب علیحدہ ہو کر سوداگری کر رہا تھا مجھے دیکھ لیا اور اس خیال سے کہ شاید ڈھاکہ سے تجارت کا مال لایا ہوگا بے حد منت و سماجت سے مجھے اپنے گھر لے گیا یہ مکان نیا بنا ہوا تھا مجھے یوں پسند آیا کہ خاص بازار کے قریب تھا اور یہ زمانہ نواب سعادت علی خاں کے آخری عہد کا تھا[1] جب میں نے سامان دھوپ ہی میں چھوڑ دیا تب وہ سمجھا کہ مسافر ہے تاجر نہیں ہے اب اسے مروت مانع ہوئی کہ مجھے گھر سے نکال دے۔

حکیم مرزا محمد علی: اسی روز میرا ہم محلہ امیر خاں جو عبد الباقی خاں کے رسالے میں نوکر تھا مجھ سے ملنے آیا۔ میرے ایک ساتھی سے اس کی ملاقات ہوگئی تھی اس لئے اسے میری آمد کا علم ہوگیا تھا۔ میر عبد العلی سہسوانی[2]

---

[1] نواب سعادت علی خاں فرزند نواب شجاع الدولہ ۱۷۹۸ء سے ۱۸۱۴ء تک والیٔ اودھ رہا تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ اودھ جلد چہارم از نجم الغنی وقیصر التواریخ جلد اول

[2] میر عبد العلی کا وطن سہسوان ضلع بدایوں تھا تحصیل علم رامپور، دہلی اور لکھنؤ کی ریاست ٹونک میں بعہد نواب وزیر الدولہ سرونج کی نظامت کے عہدے پر ممتاز ہے مولانا فضل حق خیرآبادی نے مولوی اسمٰعیل شہید کے رسائل کا رد لکھا میر عبد العلی نے (باقی صفحہ ۱۵۴ پر)

جو بندہ کے ہم سبق تھے (ایک شخص) منور معمار ان کے والد[1] سے عقیدت رکھتا تھا وہ خود مع مرید مجھ سے آکر ملے دوسرے روز میں میر عبدالعلی سے ملنے گیا وہ مکان پر نہ ملے ان کے بھائی سے معلوم ہوا کہ نفیسی شرح موجز[2] حکیم مرزا محمد علی صاحب کے یہاں پڑھنے گئے ہیں پوچھتے پوچھتے میں وہیں پہونچا اور سلام کرکے بیٹھ گیا کتاب میں بحث یہ تھی کہ معتدل حقیقی کا وجود اگر ہو بھی جائے تو کہاں ہو کیونکہ ہر مرکب اپنے غالب جزء کے مکان میں ہوتا ہے اور معتدل میں کوئی جز غالب نہیں ہوتا لہٰذا اس کا وجود محال ہے میں نے کہا جس جگہ ترکیب پائے وہیں رہ سکتا ہے کیونکہ وہاں سے دوسرے مکان میں منتقل ہونے کا کوئی سبب نہیں یہ سُن کر ــــ حکیم صاحب نے خیال کیا کہ شاید یہ ماہر فن ہے ان کو اس کی کیا خبر تھی کہ ہر دانش مند سے سُن سُن کر کچھ کچھ یاد کر لیا ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ حکیم صاحب نے درس ختم کر دیا اور مجھ سے پوچھا کہ یونانیوں کے مسئلہ الٰہیات کہ وجود محض خیر ہے اور عدم محض شر، اس کا کیا مطلب ہے خدا کی مدد تھی کہ اسی روز اس مسئلہ کو ہدایۃ الحکمۃ[3] کی شرح ملا صدرا میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے بیان کر دیا۔ اور ایک رباعی بھی پڑھ دی جس میں اجمالاً یہ مسئلہ میں نے نظم کیا تھا،

نیکو بنگر کہ ہست در ملک وجود	خیر کلی ز شر جزئی مقصود
اس ملک وجودی پہ ترا غور ذرا ہو	مقصود بھلائی ہے ثمر گرچہ برا ہو
ہر چہرۂ زیبا کہ بود خال سیاہ	پیداست کہ جز حسن نخواہد افزود
چہرے پہ حسینوں کے اگر خال سیاہ ہو	ہرگز کہے کوئی کہ وہ نقص نما ہو

حکیم صاحب رباعی سُن کر بے حد خوش ہوئے اور بندے کے متعلق جو کچھ ان کے دل میں آیا میں انشاء اللہ تعالیٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۳ سے آگے) مولانا فضل حق خیرآبادی کے ان رسائل کے جواب دیئے کچھ دنوں رامپور میں بعہد نواب محمد سعید خاں بھی رہے ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں مکہ معظمہ میں انتقال ہوا۔ (حیوۃ العلماء از عبدالباقی سہسوانی مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۳ء ص ۳۹، ۴۰)

[1] میر عبدالعلی کے والد کا نام مولوی تراب علی تھا جو نہایت فاضل اور درویش صفت شخص تھے [2] موجز قانون، قانون شیخ کا خلاصہ ہے جو علاؤ الدین علی ابن ابی الحزم قرشی المعروف بہ ابن نفیس المتوفی ۶۸۸ھ / ۱۲۸۸ء نے کیا ہے اس کی تین شرحیں نفیسی، سدیدی اور اقصرائی مشہور ہیں۔

[3] ہدایۃ الحکمۃ اثیر الدین ابہری کی تالیف ہے جس پر ملا صدر الدین محمد ابن ابراہیم الشیرازی کی شرح ہے جو شرح صدرا کے نام سے مشہور ہے۔ ملا صدر الدین میر باقر داماد اور بہاؤ الدین آملی کا مشہور شاگرد ہے ہدایت الحکمۃ پر میر حسن معین الدین المیبذی کی شرح بھی مشہور ہے (باقی صفحہ ۱۵۵ پر)

سے کہہ دیا۔ حکیم (مرزا محمد علی) صاحب[ل۱] (میر انشاء اللہ خاں) صاحب اور میر عبدالعلی تینوں بزرگوار مجھ سے ملنے آئے اور نوازش فرمائی۔

میر انشاء اللہ خاں:۔ دوسرے روز میر انشاء اللہ خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اگرچہ وہ شعر و شاعری میں مشہور ہیں لیکن میری دانست میں علم مجلسی اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ اس کام میں وہ یکتائے زمانہ کہے جا سکتے تھے۔ اردو فارسی عربی بنگالی پوربی مرہٹی کشمیری ترکی اور افغانی لوگوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کرتے تھے فارسی نثر بے تکلف خوب رواں لکھ لیتے تھے تیراندازی، شمشیر بازی اور گھوڑے کی سواری اچھی جانتے تھے وکالت کے ذریعے جو کچھ ملتا سب جمع رکھتے رندوں میں پیر مغاں اور حلقۂ مشائخ میں شیخ صنعاں بنے ہوئے تھے[ل۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۴ سے آگے) میبذی پر توضیحات و حواشی مولانا عین القضاۃ لکھنوی (ف ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۵ء) نے لکھے ہیں جو چھپ چکے ہیں۔ ہدایت الحکمۃ کی شرح مولانا عبدالحق خیرآبادی ابن مولانا فضل حق خیرآبادی نے بھی لکھی ہے۔

ل۱ لکھنؤ کے نامی گرامی طبیب تھے محلہ توپ دروازہ میں رہتے تھے ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں انتقال کیا میر علی اوسط رشک نے تاریخ وفات کہی ہے۔

بقراط زمانہ بو علی سینا　　　اے فخر ہمہ سابق و لاحق افسوس

تاریخ وفاتش قلم رشک نوشت　　　افسوس طبیب ہائے حاذق افسوس　۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء

مختصر سیر ہندوستان از حکیم محمد وحید اللہ بدایونی ۲۲　　　(مطبوعہ مطبع احمدی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء)

ل۲ میر انشاء اللہ خاں ولد میر ماشاء اللہ خاں مرشد آباد میں پیدا ہوئے نہایت ذہین و فطین تھے شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ان کی سرکار سے وابستہ رہے پھر لکھنؤ پہونچے اول شہزادہ سلیمان شکوہ سے متعلق رہے پھر علامہ تفضیل حسین کی سفارش سے نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی ہوئی ان کی کلیات اور دریائے لطافت مشہور ہے ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء میں انتقال ہوا تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے

(۱) لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابو اللیث ص ۱۶۹-۱۹۰ (۲) گل رعنا از حکیم عبدالحئی دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء ص ۲۵۳، ۲۶۴

(۳) تاریخ داستان اردو ص ۱۴۵-۱۵۱ (۴) آبحیات از مولوی محمد حسین آزاد مطبوعہ پنجاب پریس لاہور ص ۲۵۴ - ۳۰۲

(۵) گلشن ہند از مرزا علی لطف ص ۴۱ - ۴۳

(۶) تذکرہ شعراء (از ابن امین اللہ طوفان) مرتبہ قاضی عبدالودود مطبوعہ آزاد پریس پٹنہ ۱۳۶۸ھ/۱۹۵۰ء ص ۳ - ۴

(۷) گلستان بے خزاں از حکیم قطب الدین مطبوعہ نولکشور پریس ۱۲۷۱ھ ص ۱۰ - ۱۱

محفل مشاعرہ:- ایک دن مشاعرے کی محفل میں جو ان دنوں مرزا جعفر[1] کے مکان پر ہوتی تھی میں بھی چلا گیا مرزا محمد حسین قتیل[2]، مصحفی، میر نصیر دہلوی[3] اس زمرے میں سرگروہ شمار ہو رہے تھے اور شیخ امام بخش ناسخ[4] کو ان

---

[1] مرزا جعفر کا اصلی نام مرزا فخرالدین احمد خاں بہت ہوشیار آدمی تھا لکھنؤ کے حالات پر پوری پوری اطلاع رکھتا تھا۔ نواب سعادت علی خاں کے حالات کو مسخ کر کے رزیڈنٹ بیلی سے بیان کرتا تھا اس سے نواب کو رنج ہوتا تھا۔ نواب غازی الدین حیدر کے زمانے میں مرزا جعفر اور اس کے فرزند مرزا قمرالدین احمد خاں عرف مرزا حاجی کو خوب عروج ہوا کیونکہ غازی الدین حیدر کو تخت نشین کرانے میں ان لوگوں کی کوششیں بھی شامل تھیں مرزا جعفر ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء میں راہی ملک عدم ہوا قطعہ تاریخ انتقال

میرزا جعفر کہ دائم از امام جعفر ش حب بر دل بود این بر ہر دو عالم ظاہر است

بہر تاریخ وفاتش چوں تامل شد مرا آمد از ہاتف ندا جعفر بہ نزد جعفر ست ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء

(تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۹۰، ۱۱۵، ۲۰۶ — قیصر التواریخ جلد اول ص ۲۲۹)

[2] فرید آباد (دہلی) کے رہنے والے تھے درگاہی مل کھتری کے بیٹے تھے ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں پیدا ہوئے پہلے دیوالی سنگھ نام تھا ۱۸ برس کی عمر میں مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تعلیم سے متاثر ہو کر فیض آباد میں مسلمان ہوئے اور محمد حسین نام رکھا گیا فارسی کے شاعر و ادیب تھے مولوی غلام امام شہید اور مولانا شاہ سلامت اللہ کشفی بدایونی، قتیل کے مشہور شاگرد تھے مرزا قتیل دربار اودھ کے متوسلوں میں تھے نہر الفصاحت، چہار شربت اور دیوان وغیرہ قتیل سے یادگار ہیں سید انشاء سے دوستی تھی اُردو کے سلسلہ میں قتیل کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ دریائے لطافت کی ترتیب میں انشاء کے شریک ہے ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں انتقال کیا ناسخ نے تاریخ کہی ہے

سال ترحیل قتیل اے ناسخ گفتہ ام "شہرہ آفاق قتیل"

(داستان تاریخ اُردو ص ۱۵۲ - تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۹۹ — تلامذہ غالب ص ۱۶۶، ۱۶۷)

[3] شاہ نصیر الدین نصیر دہلی کے رہنے والے تھے ان کے والد شاہ غریب نے تعلیم و تربیت میں بڑی کوشش کی نگران کی قسمت میں ملک سخن کی حکمرانی تھی شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہوئے چند روز کی مشق میں اچھا کہنے لگے شاہ عالم کے درباری شعراء میں منسلک ہوئے لکھنؤ میں آئے دیوان چندو لال کا شہرہ سن کر حیدرآباد پہونچے اور وہیں ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں انتقال ہوا۔

(گل رعنا ص ۲۷۲، ۲۸۷ - تذکرہ شعراء مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۴، ۵ — آبحیات ص ۳۹۴، ۴۱۰)

[4] امام بخش ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے مشہور ہیں فیض آباد میں نواب محمد تقی خاں کے ملازم ہو گئے انکی صحبت میں ترقی پا کر میر کاظم علی رئیس لکھنؤ سے وابستہ ہو گئے لکھنؤ ہی میں تعلیم و شاعری کی طرف متوجہ ہوئے لکھنؤ اسکول کے خاص (باقی صفحہ ۱۵۷ پر)

دنوں اس فن میں دن دونی شہرت حاصل تھی۔

میاں مصحفی:- ایک روز میاں مصحفی کے مکان پر جانے کا اتفاق ہوا خوب تفصیلی ملاقات رہی کثرت سے لوگوں کو میر نجات کی گل کشتی پڑھاتے تھے اور اکثر لوگوں کے اشعار کی اصلاح بھی کرتے تھے مگر بایں ہمہ نان شبینہ کیلئے محتاج تھے اور کہتے تھے کہ میری پیدائش بلبھ گڑھ میں ہوئی جو شاہ جہاں آباد کے قریب ہے[1]

مولوی محمد اسمٰعیل مراد آبادی (لندنی):- ایک دن مولوی وجیہہ[2] الدین صاحب نے جو مراد آباد کے بزرگوں میں سے ہیں کرم فرمایا بندہ (مولوی عبدالقادر) بھی ان کی زیارت کے لئے محلہ نیا ہٹیرہ (لکھنؤ) میں گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۶ سے آگے) اُستاد تھے اور اصلاح زبان میں بڑا کام کیا مرزا حاجی سے بھی توسل رہا ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں انتقال ہوا۔

لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۳۶۸ - ۴۰۶

آب حیات ص ۳۳۴ - ۳۷۰

گل رعنا ص ۳۴۰ - ۳۵۸

[1] غلام ہمدانی ولد شیخ ولی محمد نام مصحفی تخلص، امروہہ وطن تھا درسیات کی تحصیل دہلی میں کی عربی میں جو خامی رہ گئی تھی اس کی تکمیل لکھنؤ میں کی، دہلی میں شاہ نیاز احمد بریلوی سے بھی کچھ پڑھا دہلی سے نکل کر نواب محمد یار خاں امیر فرزند نواب علی محمد خاں والئی روہیل کھنڈ کی سرپرستی میں آنولہ پہونچے نواب محمد یار خاں ٹانڈہ (آنولہ سے متصل ایک گاؤں ہے) میں سکونت رکھتے تھے وہاں کچھ دنوں رہے پھر لکھنؤ چلے گئے آنولہ اور ٹانڈہ کی صحبتوں کو مصحفی نے لکھنؤ میں بھی یاد کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں "واللہ کہ یاد آں صحبت گزشتہ داغ ناکامی بر دل دردمندی گزارد" لکھنؤ میں مصحفی و انشاء کے معرکے مشہور ہیں سنہ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں انتقال ہوا۔ مصحفی پر نثار احمد فاروقی نے ایک نہایت مبسوط مفصل اور تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے جو برہان دہلی (مئی تا دسمبر ۱۹۵۹ء) میں مسلسل شائع ہوا ہے

لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۹۱ - ۲۹۵

گل رعنا ص ۲۱۸ - ۲۳۰ - آبحیات ص ۳۰۲ - ۳۳۱

تاریخ ادب اُردو ص ۱۹۶ - ۱۹۰

مقدمہ ریاض الفصحاء رازی از مولوی عبدالحق (دہلی ۱۹۳۴ء)

[2] مولوی وجیہہ الدین کے والد کا نام مولوی شبیر محمد تھا مولوی وجیہہ الدین مراد آباد کے عمائد میں تھے۔

اور جناب مولانا کے بڑے صاحبزادے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب[۱] کو جو ہر فن میں نئے طرز سے باتیں کرتے تھے دیکھکر بیحد خوشی ہوئی زہے نصیب کہ باپ ان کو علماء گزشتہ پر ترجیح دیتے تھے۔ چھوٹے صاحبزادے مولوی جمیل الدین[۲] صاحب بیحد خلیق ہیں اگرچہ بڑے بھائی جیسی علمی لیاقت نہیں لیکن خوش خلقی کی بناء پر سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

میر علی مرثیہ خوان:۔ ایک دن مہینے کی پہلی جمعرات کو میر علی صاحب کی مرثیہ خوانی سننے چلا گیا مرثیہ سنا آواز اچھی ہے اور اس فن میں ایسی مشق اور مہارت حاصل کر لی ہے کہ اکثر موسیقی کے ماہران کے ثناخواں ہیں۔

اس کے بعد میں نے سفر کا ارادہ کیا۔ منو معمار اور حکیم (مرزا محمد علی) صاحب مانع ہوئے اور کہا کہ اتنا اور ٹھہرو کہ کسی دن تم کو نواب (سعادت علی خاں) تک پہونچا دیں میں نے کہا کب تک امید ہے کہا کہ برسات بھر یہاں رہنا پڑے گا۔ میرے پاس چار مہینے کے مصارف کی گنجائش نہ تھی لہٰذا معذرت کر دی حقیقت یہ ہے کہ جس دن میں اس شہر میں آیا تھا اسی دن ایک مخبر نے آکر کہا کہ دیوان خانے کے نائب داروغہ لالہ امرت لال[۳] نے کہا ہے کہ فلاں شخص کو ہمارا سلام پہونچا کر کہو کہ مقام چاہدا

---

[۱] مولوی محمد اسمٰعیل ذہین، ذکی الطبع اور علوم مروجہ میں استعداد کامل رکھتے تھے مولوی تراب علی لکھنوی کے شاگرد تھے نصیر الدین حیدر نے سفارت پر لندن بھیجا اس لئے مولوی اسمٰعیل لندنی مشہور ہوئے ایک انگریز خاتون مس ڈف ان کے نکاح میں تھی مولوی محمد اسمٰعیل نے یورپ کے جدید علوم بھی حاصل کئے تھے مولوی محمد اسمٰعیل لندنی کی تصنیفات سے شرح یزدی اور حاشیہ میبذی مشہور ہیں صاحب تذکرہ علمائے ہند اسمٰعیل لندنی کے متعلق لکھتے ہیں" واپسی میں جب وہ عدن پہونچے تو ان کی عیسائی بیوی نے کہا کہ زیارت بیت اللہ یہاں سے قریب ہے کیوں نہیں کر لیتے اس کے جواب میں کہا کہ مجھے پتھر کی دیواروں سے کوئی اعتقاد نہیں ہے، اعوذ باللہ من سوء الاعتقاد"

(تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۴ ۔ نقوش سلیمانی از سید سلیمان ندوی کراچی ۱۹۵۸ء ص ۸۲ تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۳۲۸-۳۲۹)

[۲] مولوی جمیل الدین مولوی وجیہ الدین کے چھوٹے صاحبزادے تھے ان کے نامور فرزند مولوی تاج الدین عرف مولوی منو تھے جنہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مرادآباد میں علم جہاد بلند کیا اور شہید ہوئے۔

(روزنامہ انجام کراچی، جنگ آزادی نمبر مورخہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء، العلم کراچی جنگ آزادی نمبر (اپریل ۱۸۵۷ء)

[۳] امرت لال عرض بیگی نواب شجاع الدولہ کی بیٹی مسیتی بیگم کی سرکار میں داروغہ دیوان خانہ بھی رہا ہے نواب غازی الدین حیدر اس سے بہت مطمئن تھے نہایت قابل شخص تھا مرزا قتیل کا شاگرد تھا۔ (قیصر التواریخ جلد اول ص ۲۴۲

کے اخبار نویس کی تحریر سے نام، وطن اور کلکتہ سے لکھنؤ آنا مجھے معلوم ہوگیا تھا آج شہر کی خبروں سے معلوم ہوا کہ اس نام و نشان کا شخص گوشائیں گنج سے نوآباد شہر میں آیا ہے اور خاص بازار کے قریب کاظم شیرازی کے مکان میں ٹھہرا ہے[لہ]۔ بعد مغرب میں (امرت لال) دو گھنٹے مکان پر رہتا ہوں اگر قدم رنجہ فرمائیں تو مفصل ارادہ اور حالات معلوم کر کے امیر (نواب لکھنؤ) کے حضور میں لکھدوں۔ میں نے کہا قسمت میں ہوا تو کسی دن حاضر ہوں گا۔ پھر میں نے سوچا کہ اپنا لباس امراء کے دربار کے لائق نہیں اور نہ اتنا سرمایہ ہے کہ اس کو بیچ کر یہاں (لکھنؤ) کے قیام اور سفر کا خرچ برداشت کر سکوں اس کام کا انجام دشوار سمجھتے ہوئے مہینہ بھر سیر کر کے گھر (رامپور) کو چل دیا۔

مولوی ظہور اللہ فرنگی محلی:۔ ایک دن مولوی ظہور اللہ صاحب کی زیارت سے بھی مشرف ہوا جو فرنگی محل (لکھنؤ) کے بزرگوں میں سے ہیں اور وہاں کے معمول کے مطابق فنون مروجہ کی اصطلاحوں اور مسائل کی تعلیم دیتے تھے[لے]

لہ نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں سر رشتہ اخبار کی کیفیت نہایت عمدہ تھی ہر قسم کی نیک و بد کی اطلاع دینے کے لئے ہر ضلع میں ہرکارے مقرر تھے اور شہر میں بھی ہر ایک امیر و سردار اور اہل خدمات و محل کی ڈیوڑھیوں پر ہرکارے خبر لکھنے کے لئے مقرر تھے اور کوئی سر رشتہ ایسا نہ تھا جس میں ہرکارہ نہ ہو ہرکاروں کا یہ کام تھا کہ ریاست کے سود و زیان سے متعلق خاص خبریں بالتحقیق بہم پہنچائیں اور ان کو دار الاخبار کے افسر اعلیٰ کے پاس پہونچادیں"

("تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۳، ۴، ۷)

لے مولوی ظہور اللہ ولد مولوی محمد ولی ۱۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد اور چچا ملا حسن سے علوم مروجہ کی تحصیل کی نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں عہدہ افتاء پر فائز ہوئے کسی وجہ سے عہدہ سے معزول ہوئے مگر نواب غازی الدین حیدر نے پھر مفتی مقرر کر دیا اپنے عہد کے نامور علماء میں سے تھے بعض کتابوں پر تعلیقات و حواشی لکھے ہیں

تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۹

تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۸۰

صوفی عبدالرحمٰن لکھنوی :- مولوی عبدالرحمٰن صوفی[1] کی بھی زیارت کی وہ ایک ایسے شخص تھے جو بظاہر شریعت کے پابند تھے لیکن مسجد میں گھر کے طریقے سے رہتے تھے سماع بھی وہیں سنتے تھے اور جو کوئی مسئلہ وحدت الوجود .... میں ان کے اعتقاد کے خلاف ہوتا اس کو کافر سمجھتے تھے تیز فہم اور خوش تقریر آدمی تھے مجھکو بھی اپنے اعتقاد سے آگاہ کیا اور ایک رسالہ جو اس فن میں تصنیف کیا تھا مجھے خود عنایت کیا اور کہا کہ دیکھو اور اگر کہیں شک ہو تو پوچھو میں نے کہا یہ مسئلہ جب سے مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے لوگ تین طرح کے ہو گئے ہیں ایک اس کے ماننے والے یہ لوگ اگرچہ منکروں کو خطا پر سمجھتے ہیں لیکن کافر نہیں کہتے دوسرے منکران کے دو گروہ ہیں ایک وہ جو معتقدوں پر کفر کا حکم لگاتے ھیں دوسرے وہ جو معتقدوں کو خطا پر سمجھتے ہیں لیکن مسلمان شمار کرتے ہیں معتقدوں میں سے کسی نے منکروں کو کافر نہیں کہا یہ جناب ہی کی طبعزاد ہے اس بات کی طرف مطلق التفات نہ کیا۔

رامپور واپسی :- پھر میں وہاں (لکھنؤ) سے اپنے وطن رامپور کو چل دیا اور بریلی کے راستے سے اپنے شہر پہونچکر والد صاحب کے قدموں سے آنکھیں ملیں (خدا ان کی مغفرت کرے) مجھے دیکھ کر ان کے جسم میں تازہ جان آگئی بھائی بہنیں چاروں طرف سے چپٹ گئے گھر گھر سے احباب مبارکباد کے لئے آنے لگے سچ تو یہ ہے کہ یہ سب والد صاحب کی خوشدلی کا سبب تھا ورنہ میں اس وقت بالکل بے سروسامان پہونچا تھا والد صاحب کے انتقال کے بعد دو تین مرتبہ آسودگی اور مالداری

---

[1] مولوی عبدالرحمٰن صوفی کوٹ مخدوم عبدالحکیم تعلقہ مبارک پور (شکار پور سندھ) کے رہنے والے تھے باپ کا نام محمد حسن تھا ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے ۱۹ سال کی عمر تک اپنے والد سے تحصیل علم کی ۴ سال تک متوسطات کی تعلیم مولوی محمد فاضل سے خیرپور میں حاصل کی اس کے بعد قصبہ مہاروں میں مولوی اسد اللہ صاحب سے تحصیل علم کی پھر دہلی پہونچے اور وہاں سے رامپور آئے وہاں کچھ پڑھا پھر رامپور سے مولوی بحر العلوم عبدالعلی لکھنوی کی خدمت میں ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء بنگال پہونچے ایک سال قیام کر کے تمام علوم کی تکمیل کی ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں حج ادا کیا۔ ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں لکھنؤ پہونچے ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں انتقال ہوا صوفی صاحب کا رسالہ کلمۃ الحق بہت مشہور ہے

۱- انوار الرحمٰن لتنویر الجنان ص ۲۶ - ۲۸

۲- تذکرہ علمائے ہند ص ۲۹۴ - ۲۹۵

۳- تذکرہ غوثیہ مرتبہ مولوی گل حسن تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور ص ۶۸

کی حالت میں گیا مگر ایسا لطف و سرور گھر میں نہ پایا۔

مولانا جمال الدین کی خدمت میں حاضری:۔ پھر مولانا جمال الدین[۵۱]، مولوی رستم علی[۵۲] اور مولوی شرف الدین[۵۳] کی خدمت میں قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا۔ مولانا جمال الدین کی خدمت میں حاضری کے وقت جبکہ میں حالات سفر بیان کر رہا تھا، ڈھاکہ سے رخصت کے وقت احباب کے آبدیدہ ہونے سے اپنا آزردہ خاطر ہونا یاد آگیا اور وہ بات جواب سے برسوں پہلے جناب مولانا جمال الدین نے مثل کے طور پر بیان فرمائی تھی خیال میں آگئی۔ وہ بات یہ تھی۔

کسی نے مولانا صاحب سے پوچھا کہ نیک لوگ کامیاب زندگی سے زیادہ عالم جاودانی کی آرزو رکھتے ہیں حتیٰ کہ آسمانی کتابوں میں بھی ہے اس کے باوجود مرتے وقت افسردگی اور آزردگی کے آثار دکھائی دینے لگتے ہیں فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے باپ کی اجازت سے بنگال پہونچا کچھ عرصے وہاں قیام کیا اور وہاں کے باشندوں سے برادرانہ دوستی کے تعلقات ہو گئے اس وقت اس کو اپنے والد کے دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی باپ نے بھی حکم بھیجا کہ بہت جلد آجاؤ جدائی کے وقت دوستوں کو آبدیدہ دیکھ کر اس کا افسردہ اور غم زدہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں حالانکہ مقصد جُدائی ہے اور کسی کا جبر نہیں۔

اور مجھے یہ بھی یاد آیا کہ (اسی محفل میں) ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا کہ عقبیٰ کی بہبود پر دنیا کی لذتوں کو چھوڑنا نقد کو اُدھار پر بیچنا ہے اور لوگوں کے کہنے سے موجود کو معدوم کی اُمید پہ ہاتھ سے دے دینا عقل پسند نہیں کرتی۔ گویا میرا یہ شعر اس کی زبانی ہے۔

---

[۵۱] مولانا جمال الدین ابن مولوی کفایت علی نے علوم عقلی و نقلی حدیث، تفسیر دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے تحصیل کئے مولانا فخر الدین صاحب سے بیعت کی رامپور میں مقیم ہو گئے نہایت منکسر المزاج اور حلیم الطبع تھے ہر شخص کے ساتھ بلالحاظ مذہب و ملت اخلاق سے پیش آتے تھے جنگی خاں (ساکن گکرار ضلع بدایوں) ان کے بہت معتقد تھے ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء میں انتقال ہوا۔

تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۹۱-۹۲

[۵۲] مولوی رستم علی کا حال صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ ہو۔

[۵۳] مولوی شرف الدین کا حال صفحہ ۷۸ پر ملاحظہ ہو۔

عشق خوباں کہ بامید جناں بگذارم — نقد زر بر طمع نسیہ چساں بگذارم
کیا ارم کی آرزو پر عشق بتاں کو چھوڑ دوں — کسطرح وعدوں پہ میں نقد عیاں کو چھوڑ دوں
بسخن ہائے پریشاں تو اے واعظ شہر — من نہ آنم کہ در پیر مغاں بگذارم
واعظا تیری نصیحت ہے پریشاں گفتگو — وہ نہیں ہرگز کہ میں پیر مغاں کو چھوڑ دوں

میں نے اس کو یہ جواب دیا کہ اگر کسی کو خارش ہو اور کھجانے میں لطف و آرام ملے مگر طبیب منع کرے اور سوائے پرانی باتوں اور اپنے تجربے کے اور کوئی ایسی دستاویز نہ ہو جس کو عقل تسلیم کرے، اب ایک گروہ کہتا ہے کہ کھجانے میں کوئی مضائقہ نہیں (بلکہ مزہ آتا ہے) دوسرا گروہ طبیب کی پیروی کرنے کو کہتا ہے لیکن یہ دونوں گروہ طبیبوں میں سے نہیں ہیں ایسی صورت میں عقلمند لوگ کیا کریں گے میرا یہ جواب سنکر اس شخص نے منہ پھیر لیا نہ معلوم اس نے کیا سمجھا مولانا جمال الدین صاحب نے فرمایا کہ یہی عیب تھا کہ جواب اس کے منشاء کے موافق نہ تھا۔

اس کے بعد ان رئیسوں کی خدمت میں گیا جن کے نان و نمک کا میں پروردہ ہوں مخدومی مولانا شرف الدین جنکو میری محبت اپنے فرزند سے بھی زیادہ تھی خوشی کے مارے اچھل پڑے اور جس طرح بھی ممکن ہوا ہر جگہ میرا تذکرہ پہونچایا۔

حکیم غلام حسین خاں کا یاد فرمانا:۔ حکیم غلام حسین[1] خاں نے کسی کے ہاتھ یہ پیام بھیجا کہ مجھکو دم بھر کی فرصت نہیں اگر بے تکلفی کا خیال کرتے ہوئے جب چاہیں مجھ سے ملنے چلے آئیں تو پرانی دوستی سے بعید نہیں میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ چلا گیا۔ میں اور حکیم غلام حسین ایک محلہ کے رہنے والے اور ہم سبق تھے وہ ان دنوں خوش نصیبی سے رئیس (نواب احمد علی خاں) کی نوازشوں کی بنا پر ریاست (رامپور) کے مختار کل تھے خدا ان کو بخشے اپنی دانست میں بہت زیادہ تعظیم کی مسند سے اٹھے، معانقہ کیا مسند پر اپنے پہلو میں جگہ دی مگر اس شوریدہ سر کو بہت گراں گزرا اول تو یہی کہ خود نہ آنا مجھے بلانا دوسرے تکیہ اور مسند تیسرے یہ کہ پہلے گفتگو میں "حکیم صاحب" کہا کرتے تھے۔ اب "خانصاحب" کہنا پڑا تاہم اس مجلس کو مصداق "کنج دارد مریز" آخر تک پہونچایا اور دوبارہ نہ گیا۔

---

[1] حکیم غلام حسین خاں کے حالات صفحہ (۱۰۲ح) پر ملاحظہ ہوں۔

نواب عنایت اللہ خاں کی خدمت میں حاضری:۔ ان ہی ایام میں اُمراء کے سلسلے میں عنایت اللہ خاں کی خدمت میں بھی آمد و رفت رہتی۔ ایک روز فرمایا کہ حکمائے یورپ زمین کی حرکت کے قائل ہیں اس کا خلاصہ کیا ہے میں نے کہا کہ یونان کے بعض عقلمندوں کی بھی یہی رائے ہے اسی گروہ نے اس کو پسند کیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ رات دن کے چکر کو زمین کی حرکت پر محمول کرتے ہیں[1] اور آفتاب کو ساکن سمجھتے ہیں۔ اور زمین کی حرکت مغرب سے مشرق کو کہتے ہیں اور مثال میں کہتے ہیں کہ کشتی میں بیٹھنے والے کنارے کو چلتا دیکھتے ہیں اور کہتے کہ چند فرسخ تک زمین کے ساتھ پانی اور ہوا گھومتے ہیں جیسے کہ کشتی سے ملی ہوئی ہوا کہ اگر ایک لکڑی اس جگہ ڈال دیں تو وہ بھی کشتی کے ساتھ ساتھ چلے گی اگرچہ پانی دوسری طرف کو بہہ رہا ہو۔ اس بنا پر جو کچھ لوگوں میں مشہور ہے اور کتابوں میں دیکھا جاتا ہے کہ اگر زمین رات دن میں چکر کرے تو جو تیر سامنے کو پھینک دیں وہ پس پشت آپڑے گا (یہ اعتراض) وارد نہ ہوگا کہ مخالف جانب کا تیر دور ملک میں جا پڑے گا کیونکہ ہوا بھی زمین کے ساتھ گھومتی ہے تیر بھی زمین کے ساتھ کشتی نشین کی طرح حرکت کرے گا زمین کی اس حرکت کو مرکز کے گرد قرار دیتے ہیں۔ زمین کی دوسری حرکت آفتاب کے گرد کہتے ہیں جس پر فصلوں کی تبدیلی کی بنیاد ہے اور اس کے دور کو بیضوی کہتے ہیں[2]

---

[1] زمین اپنے محور کے گرد مغرب سے مشرق کی طرف ایک لٹو کی طرح برابر گھومتی رہتی ہے اس کا ایک چکر ۲۴ گھنٹے یا ایک دن رات میں پورا ہوجاتا ہے زمین پر کوئی مقام ہو وہ گھوم کر ایک دن میں ٹھیک اسی جگہ لوٹ آتا ہے۔ اس کو گردش محوری، روزانہ گردش یا حرکت یومیہ کہتے ہیں اس حرکت کے نتائج یہ ہیں (۱) دن رات پیدا ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے بعد ہمیشہ آتے رہتے ہیں (۲) مختلف مقاموں کے وقتوں میں فرق ہوتا ہے کہیں صبح ہوتی ہے تو کہیں شام ہوتی ہے ہواؤں اور سمندری لہروں کے رُخ میں تبدیلی ہوجاتی ہے (۳) زمین قطبین کے پاس چپٹی ہوگئی ہے۔

پاک جغرافیہ از قاضی سعید الدین (تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۵۱ء) ص ۲۰ - ۲۳

[2] زمین اپنے محور پر روزانہ گھومنے کے علاوہ سورج کے چاروں طرف بھی چکر لگاتی ہے یہ ایک چکر سال بھر میں پورا ہوتا ہے اس کو گردش دوری یا سالانہ گردش کہتے ہیں جس راستے پر زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے اس کو مدار ارضی کہتے ہیں مدار ارضی کی شکل بیضوی ہے اس کی حرکت کے نتائج یہ ہیں (۱) دن رات کا سال کے مختلف حصوں میں گھٹنا بڑھنا (۲) موسموں کا تغیر و تبدیل ہونا

(پاک جغرافیہ ص ۲۴ - ۲۸)

چاند کو بھی زمین جیسا سمجھتے ہیں لیکن اس سے بہت چھوٹا اور اس میں بھی آبادی خیال کرتے ہیں. اسی طرح دوسرے سیاروں میں اور کہتے ہیں کہ ہماری زمین، چاند کی زمین کا، چاند ہے اور وہاں بھی پورا باریک، درمیانی چاند دیکھا جاتا ہے یہ تمام احتمالات سال، مہینہ، چاند گرہن، سورج گرہن اور ضبط حرکات کے حساب میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ایسی یقینی عقلی دلیل جس سے یقین پیدا ہو جائے نہ جمہور یونانیوں کی ہیئت پر ہے نہ اس رائے پر. اگرچہ وہ لوگ (یونانی) چند طبعی مقدما تسلیم کرکے اس کو یقینی سمجھتے ہیں اور یہ لوگ (یورپ والے) مثالوں اور دوربینوں کے ذریعے مشاہدات عینی تصور کرتے ہیں اس کے بعد ایک دوست کی فرمائش سے ایک صفحہ پر اس کی تصویر بھی کھینچ دی ہے.

مشتری
زحل
مریخ
عطارد
زمین
آفتاب
زہرہ
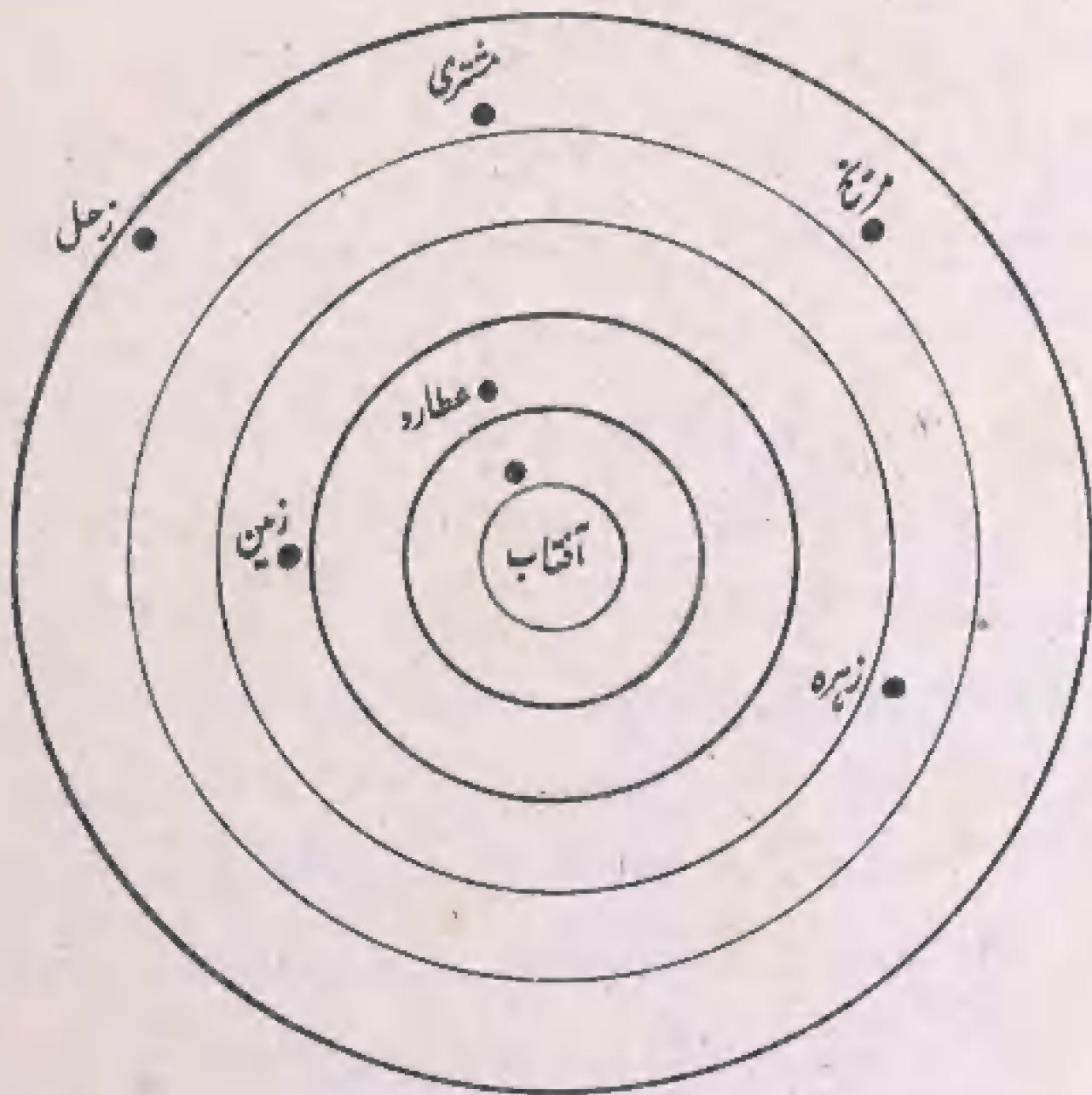
باب سوم

دہلی روانگی :- چند مہینے گذرے کہ دہلی سے ویلدر صاحب کا خط سفر خرچ کے ساتھ پہونچا خط کا مضمون یہ تھا کہ "میں نے سُنا ہے کہ بنگال سے تم گھر پہونچ گئے ہو اور جو کچھ اس مدت میں فراہم کیا تھا وہ چوری ہو گیا یہاں پر (دہلی میں) ایک نوکری کی صورت ہے اگر تمہارا دل چاہے تو رہ جانا ورنہ پھر گھر پہونچا دیا جائے گا ایک دفعہ خود کو ہمارے پاس پہونچا دینا چاہیئے۔" یکم رمضان ۱۲۳۰ھ[1] کو میں (عبدالقادر) دریائے جمنا پر پہونچ گیا۔ ویلدر صاحب کا ملازم ہجو نامی مجھے دریا کے کنارے لینے آ گیا اس نے شہر میں لیجا کر ایک جگہ ٹھہرا دیا۔ خود بدولت (ویلدر صاحب) شہر سے باہر شالیمار باغ میں تشریف رکھتے تھے عدالتی کام کے لئے شہر میں آتے تھے چونکہ دن تھوڑا رہ گیا تھا ملاقات کو کل پر رکھا شام کو آقا کے خانساماں شیر علی نے جو جونپور کا باشندہ اور نیک آدمی تھا، میرے پاس آ کر کہا کہ (ویلدر صاحب کے پاس) ماتم کے سیاہ کپڑے بھیجکر آیا ہوں۔ ولایت (انگلینڈ) سے خط ملا ہے اس کو دیکھکر صاحب کے چہرے پر غم کے آثار ظاہر ہو گئے۔ مٹکاف[2] صاحب کا کہنا ہے کہ صاحب کو

---

[1] اگست ۱۸۱۵ء　　[2] سر چارلس تھیافلس بیرن مٹکاف ۱۷۸۵ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۰۰ء میں کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوئے ہلکر اور بھرت پور کے مقابلہ میں جو جنگ ۱۸۰۵ء میں ہوئی تھی اسمیں لارڈ لیک کے لشکر کے ساتھ یہ پولیٹیکل افسر تھے اور ڈیگ میں گولہ باری کے وقت فصیل کے شگاف پر سب سے پہلے یہی پہونچے ۱۸۰۶ء میں دہلی کے رزیڈنٹ کے مددگار تھے ۱۸۰۸-۹ء میں رنجیت سنگھ کے پاس سفیر بنا کر بھیجے گئے ۱۸۱۱-۱۹ء تک دہلی کے رزیڈنٹ رہے اور دوبارہ ۱۸۲۵-۲۷ء پھر دہلی کے رزیڈنٹ رہے ۱۸۳۲ء میں آگرہ کے گورنر ہوئے ۱۸۳۵-۳۶ء میں گورنر جنرل کے قائم مقام رہے ۱۸۳۶-۳۷ء میں گورنر ممالک مغربی و شمالی رہے ۱۸۴۵ء میں لارڈ بنائے گئے ۱۸۴۶ء میں فوت ہوئے۔ مٹکاف کے خاندان کا دلی سے نصف صدی تک تعلق رہا۔ مٹکاف ہاؤس کا بانی ان کا چھوٹا بھائی تھا ان کی مکمل سوانحعمری انگریزی زبان میں دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم ص ۲۸۱ (۲) تذکرہ مولوی ذکاء اللہ از سی۔ ایف۔ اینڈریوز مترجم ضیاء الدین برنی تعلیمی مرکز کراچی ۱۹۵۲ء ص ۶۱-۶۲

LIFE AND CORRESPONDENCE OF CHARLES LORD METCALFE BY JOHN WILLIAM KAYE

2 VOL (LONDON, 1858)

اپنے والد کے مرنے کی خبر ملی ہے غالباً تین روز تک ملاقات نہ ہو، میں نے توقف کیا۔
ویلڈر صاحب سے ملاقات:- تیسرے روز خود بدولت نے مجھے بلایا میں گیا میرے حالات پوچھے اور تفریحاً فرمایا کہ پہلی ملاقات بھی رمضان میں ہوئی تھی اور دوبارہ بھی اسی مہینہ میں اتفاق ہوا ڈرتا ہوں کہ اس مرتبہ بھی پھر نہ بھاگ جاؤ۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ تین گھنٹے تک ٹھہرا پھر ارشاد ہوا کہ یہاں پر فوجداری کے انتظام کے لئے شہر سے باہر ایک نیا عہدہ "عدالت دورہ" کے نام سے مقرر ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے ماتحت اور متعلق ہوگا۔ نیا عملہ اس کے لئے مقرر ہوگا۔ اور سررشتہ داری تمہارے نام کرنی چاہتا ہوں، میں رخصت ہو کر شہر چلا آیا اگلے دن خود بدولت شہر میں آئے اور مجھے بلا کر فرمایا کہ گارنر صاحب جو مجھ سے پہلے تھا اور کسی کام کی وجہ سے یہاں سے چلا گیا تھا واپس آ گیا ہے اب لامحالہ وہی اس کام پر جائے گا اور عملے کی تجویز بھی اس کے اختیار میں ہے غیب کی مجھے خبر نہ تھی بلا وجہ میں تمہاری دردسری کا باعث ہوا میں نے کہا کہ عنایت سابقہ کا حق مجھ پر اس سے زیادہ ہے کہ اس کو میں گراں سمجھوں۔ فرمایا کہ کل یہاں پھر آنا اس وقت جو کچھ مناسب ہوگا ہو رہے گا چنانچہ میں گیا۔ فرمایا کہ شہر کے تھانے میرے اختیار میں ہیں اور باؤلی کا تھانہ خالی ہے یہاں سے بہت قریب ہے تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ ہے تمہارے بھائی غلام باسط کے نام کر دوں گا لیکن اس کے واقف ہونے تک نگرانی اور ڈھنگ پر لگانا تمہارے ذمے ہوگا تیس روپیہ تم کو علیحدہ دوں گا دو خدمتگاروں کو رکھو کہاروں کو رخصت کر دو کیونکہ یہاں کہاروں کی ضرورت نہیں ہے صرف بھائی کی سواری کا ایک گھوڑا کافی ہے، کرائے کے مکان کی بھی ضرورت نہیں میں نے کہا بہتر ہے میں پہلے تیس روپیہ پر راضی ہو گیا تھا اب ساٹھ روپیہ میں کیا عذر ہو سکتا ہے نیز فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس فرصت میں کتاب شاہنامہ سے واقفیت حاصل کر لوں پھر میں رخصت ہو کر شہر پہنچا کہار ایک ماہ کا مطالبہ پیشگی لے چکے تھے لہذا سردست ان کو رخصت کرنا ضروری نہ سمجھا۔
گارنر صاحب سے ملاقات:- ویلڈر صاحب نے تیسرے دن پھر یاد فرمایا اور کہا کہ گارنر صاحب نے مجھ سے کہا ہے کہ دو تین مہینے میں بہر صورت مجھے کسی دوسرے کام پر جانا پڑے گا تم نے عبدالقادر کو جس کی تعریف میں نے مراد آباد میں سُنی ہے۔ سررشتہ داری کا اُمیدوار کر کے وطن سے بلایا ہے اور کوئی ایسا شخص کہ جس کو میں یہ عہدہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے ماتحتوں میں نہیں ہے بہتر ہو کہ وہی

شخص میرے ساتھ رہے لہذا میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں چلے جاؤ میں نے کہا کہ میں تو حکم کا تابع ہوں نہ مجھے اس کی خوشی کہ میں سررشتہ دار ہو گیا نہ اس کا رنج کہ بیکار رہ کر کچھ پاؤں مجھے تو روٹی چاہیئے اور آقا کی نظروں میں عزت، کیونکہ اس سے بڑھکر کوئی مرتبہ نہیں کہ آقا کا دل ہاتھ میں آجائے یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ گارنر صاحب کا انگریزی خط خود بدولت کے نام پہونچا، پڑھا اور مجھ سے فرمایا کہ صاحب یہاں آرہا ہے کچھ وقت بھی نہ گزرا تھا کہ (گارنر صاحب) آگئے میں آداب بجالایا اور باعزت بیٹھ گیا۔ فرمایا کہ میں پرسوں یہاں سے نریلہ[1] جاؤں گا میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ میں نے کہا کہ نہ تو گھر یہاں ہے اور نہ کچھ عرصہ سے یہاں رہنا سہنا ہے ابھی تک مسافروں کی طرح کمربستہ ہوں جس وقت بھی حکم ہو سوائے بہت اچھا کے کوئی جواب نہیں، بالآخر مقررہ دن پر ایک مختصر سا خیمہ خرید کر لشکر کے ساتھ ہولیا اور نریلہ پہونچا بارش اتنی شدت سے ہوئی کہ آگ جلانی روٹی پکانی دشوار تھی۔

کیفیت سونی پت:- ہم نریلہ میں تھے کہ دوسرے روز ہوا اور ابر موقوف ہوا پھر کوچ کرکے سونی پت پہونچ گئے یہ پرانا شہر اور ایک پختہ کارواں سرائے ہے جس کی اونچی اور مضبوط دیواریں ہیں بہت بڑا دروازہ ہے اگر اس کو ایک چھوٹا سا قلعہ شمار کریں تو بیجا نہ ہو۔

ایک عجیب افسانہ وہاں کے ہر خاص و عام کی زبان پر ہے بلکہ دور دور مشہور ہے کہ دکھنی فوج کی شکست اور احمد شاہ درانی کی فتح کے ہنگامے میں[2] ایک دکھنی جو گھوڑی پر سوار تھا اور درانی سوار اس کے پیچھے تھے ایک جست میں سرائے کے دروازے پر پہونچ گیا مگر اوپر کے سیخچوں میں الجھکر مرگیا اگرچہ خداوند تعالیٰ کی کرشمہ نگاری کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سب باتیں آسان معلوم ہوتی ہیں، مگر عادت کے خلاف، چوپائے کا ہوا میں اڑ جانا سننے والے کو ضرور حیرت میں ڈال دے گا۔

---

[1] میر ابوالعلیٰ (ابن میر ابوالوفا) کے جد امجد میر عبدالسلام اپنے وطن سمرقند سے اکبر بادشاہ کے عہد میں مع عیال و اطفال ہندوستان میں تشریف لائے جب قصبہ نریلہ میں جو دہلی سے ایک منزل کے فاصلہ پر ہے پہونچے تو ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء میں اسی مقام پر ابوالعلیٰ پیدا ہوئے میر عبدالسلام وہاں سے فتحپور سیکری میں رونق افروز ہو کر سکونت پذیر ہوئے (مرقع اکبرآباد از سعید احمد مارہروی آگرہ ۱۹۳۱ء ص ۱۳۴) [2] پانی پت کی مشہور تیسری لڑائی مراد ہے جو احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان ۱۷۶۱ء میں ہوئی اور جس میں مرہٹے بری طرح ناکام ہوئے۔

وہاں پر سادات کثرت سے ہیں امامیہ مذہب رکھتے ہیں اہل کم بلکہ معدوم ہیں۔ بہت سوں کی معاش جاگیر ہے وہاں ایک قبر ہے جس کو امام ناصر الدین کا مزار کہتے ہیں دور دور سے لوگ اس کی زیارت کو آتے ہیں اور برکت حاصل کرتے ہیں جہلا چونکہ ہر جگہ نیکوں کی قبروں پر جمع ہوجایا کرتے ہیں اور ان بستر خاک میں سوئے ہوؤں سے مرادیں مانگتے ہیں جن کا پورا ہونا خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے یہاں بھی لوگ ایسا ہی کرتے ہیں. شہر کے ارد گرد بہت سے باغ ہیں آب وہوا اچھی ہے اسی دوران میں وہاں شدت کی بارش ہوئی تین روز تک رہنا پڑا چوتھے دن دھوپ کا مُنہ دیکھا۔ ایک روز اور ٹھہرے تاکہ خیمے خشک ہوجائیں اس کے بعد سنہالک پہونچے وہ چھوٹا سا قصبہ ہے اور وہاں سے چل کر دوسرے روز پانی پت میں قیام کیا۔

قیام پانی پت:۔ پانی پت میں صاحب بہادر نے عملے کی تجویز کی پچاس روپیہ تنخواہ سررشتہ دار کی جو بندہ (مولوی عبدالقادر) تھا چالیس روپئے مہینہ انگریزی نویس کے جو ایک بنگالی تھا بیس روپے ناظر اُمید سنگھ کے مقرر ہوئے میں نے اُمید سنگھ سے زیادہ زود نویس اب تک نہیں دیکھا۔ شاید اب احمد بخش خاں کے لڑکوں کے ساتھ ہے دو محرر تجویز ہوئے ایک بہاری لال جو لکھنے پڑھنے، حساب، اور تعمیر عمارات میں بہت چالاک اور خیمے کی کانٹ چھانٹ اور دوسرے کاموں میں دست رواں تھا اور میرے ناگپور سے آنے کے بعد ویلڈر صاحب کی نوازش سے وہاں کی رزیڈنسی کا منشی ہوگیا تھا دوسرا ہجے سکھ رائے کہ وہ بھی بہاری لال جیسی صفات رکھتا تھا ہر ایک کا مشاہرہ پچیس روپے تھا اور ایک محافظ دفتر بیس روپیہ کی تنخواہ کا طے ہوا مگر آدمی کی تجویز سررشتے دار کے متعلق رہی اور ایک داروغہ جیل خانہ بیس روپیہ پر مقرر کیا اور بیس پیادے (چپراسی) چار چار روپے ماہوار کے ناظر کے ماتحت ہوئے اور وہاں پر بہت سے لوگ ولیم فریزر کے قید کئے ہوئے تھے صاحب عدالت نے جملہ نظر بندوں کو مع مسل روداد، تجویز کے لئے طلب کرلیا جن لوگوں کی قید کے اسباب کاغذ میں ملے تحقیق فرماکر اپنی رائے کے موافق حکم دے دیا اور جن کا کوئی تذکرہ کسی کاغذ میں نہ پایا ان کو رہا کر دیا۔ اور حکم میں لکھدیا کہ اگر کوئی جرم ان کا ہوتا تو دفتر میں اس کا اندراج ہونا چاہیئے تھا دفتر سے اب تک یہ بھی واضح نہ ہوا کہ آیا حاکم کی اطلاع سے قید ہوئے ہیں یا کیونکر —— بے وجہ کسی کو ستانا کسی دین اور سلطنت میں دُرست نہیں ہے اس لئے رہا کردیئے جائیں، پانی پت میں کچھ عرصہ قیام کرکے برست کو روانہ ہوگئے۔

حالات پانی پت:- اب پانی پت کا حال لکھتا ہوں یہ شہر عرصہ سے آباد ہے[1] پانی پت کے میدان میں بابر بادشاہ نے سلطان ابراہیم لودھی کو قتل کیا[2]۔ اور اس کی جمعیت کو منتشر کر دیا تھا، احمد شاہ ابدالی نے بھاؤ کے لشکر کو شکست دی تھی[3] وہاں کے رئیس انصاری ہیں[4] بعض شیعہ ہیں اور بعض سنی ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی:- سنیوں میں قاضی ثناء اللہ[5]، علم فقہ، سیر، حدیث اور تفسیر میں بہت مشہور ہوئے ہیں شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہم عصر تھے اور ہمارے زمانے تک رہے انھوں نے تفسیر مظہری بہت مبسوط لکھی ہے جوان کے

---

[1] پانی پت ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے بیان کیا جاتا ہے کہ مہا بھارت کے زمانے سے بھی پہلے کا آباد شدہ ہے اور پانڈوں نے کوروں سے جن پانچ شہروں کا مطالبہ کیا تھا ان میں پانی پت بھی شامل تھا مہا بھارت کی لڑائی بھی پانی پت ہی کے میدان میں واقع ہوئی، پانڈوں اور کوروں کی فوجیں جب ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں تو انھوں نے نبرد آزمائی کے لئے جو مقام تجویز کیا وہ پانی پت سے تھانیسر تک پھیلا ہوا تھا　　"تاریخ پانی پت از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

(مشمولہ "حیات نو" "پانی پت" حالی سینٹری نمبر" ماہ جولائی ۱۹۳۶ء)

[2] جنگ پانی پت اول جو ۱۵۲۶ء میں بابر اور ابراہیم لودھی کے درمیان ہوئی۔

[3] جنگ پانی پت سوم ۱۷۶۱ء

[4] انصاریان پانی پت خواجہ ملک علی انصاری کی اولاد سے ہیں۔ پانی پت کی قابل فخر ہستی شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی بھی ان ہی کی اولاد میں تھے خواجہ ملک علی انصاری کا انتقال ۹ رمضان [illegible]ھ کو نوے سال کی عمر میں قصبہ پائل میں ہوا خواجہ ملک علی انصاری کی اولاد پٹنہ عظیم آباد، اورنگ آباد دکن اور فرید آباد میں بھی پائی جاتی ہے　(تاریخ پانی پت از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)

[5] قاضی ثناء اللہ شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی کی اولاد میں تھے سات سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فارغ ہوئے اور پندرہ سال کی عمر میں تمام علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے شاہ عابد سنامی سے بیعت ہوئے پھر حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ سے کسب فیض کیا اور اجازت وخلافت حاصل کی۔ مرزا صاحب نے "علم الہدیٰ" کا لقب عطا فرمایا اور حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی قاضی ثناء اللہؒ کو "بیہقی وقت" کہتے تھے شاہ ولی اللہؒ دہلوی سے علم حدیث حاصل کیا تفسیر فقہ، کلام تصوف میں ید طولیٰ رکھتے تھے صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں۔

"شیخ ثناء اللہ زبدہ علمائے ربانی ومقرب بارگاہ سبحانی دو علوم عقلی ونقلی وکمالات ظاہری و باطنی از ممتاز ان وقت بود و در فقہ وا صول برتبۂ اجتہاد رسیدہ وکتابے مبسوط در علم فقہ الموسوم بہ مالا بد منہ بروایات مذہب اربعہ ونیز تفسیرے طولانی جامع اقوال (باقی صفحہ ۱۷۰ پر)

متجیر ہونے کی دلیل ہے بعض نادر چیزیں بھی اس میں مل سکتی ہیں۔ تفسیر سورۂ فاتحہ میں لکھا ہے کہ عالمین کا مفرد عالم ہے عربی زبان میں فصحاء کے کلام میں مستعمل نہیں اور اس مشہور شعر کا کوئی جواب نہیں دیا۔

لیس علی اللہ بمستنکر　　ان یجمع العالم فی الواحد

خدا پر یہ دشوار ہرگز نہیں　　بھرے سارے اوصاف اک شخص میں

نیز طوفان نوح کی روایت میں ان کا میلان اس طرف ہے کہ وہ عام اور تمام عالم کو شامل نہ تھا اور نص قرآنی "ہر جانور کا جوڑا کشتی میں رکھنا" عموم پر دلالت کرتا ہے[1] اس کے علاوہ اور بھی کتابیں اور رسائے تصنیف کئے ہیں مرزا مظہر جانِ جاناں سے کہ جن کا نام مشائخ اور ہندوستان کے متاخرین شعراء میں مشہور ہے مشرب فقر میں بھائی بندی رکھتے تھے۔

شیعوں کی جماعت میں شیخ صادق علی تھے اگرچہ فاضل نہ تھے لیکن لیاقت کے حصہ دار تھے[2] ایک گروہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۹ پر)　قدمائے مفسرین و تاویلات جدید ارقام نمودہ است"

(۱) السیف المسلول (۲) تذکرۃ الموتی القبور (۳) تذکرۃ المعاد (۴) حقوق الاسلام (۵) رسالہ در حرمت و اباحت سرود (۶) رسالہ حرمت متعہ (۷) رسالہ شہاب ثاقب (۸) ارشاد الطالبین (۹) تفسیر مظہری (۱۰) مالا بدمنہ وغیرہ قاضی ثناء اللہ صاحب سے یادگار ہیں۔ ۱۲۲۵ھ؍۱۸۱۰ء میں انتقال ہوا۔ آخر الذکر تینوں کتابیں عام طور سے مطبوعہ ملتی ہیں تفسیر چھ جلدوں پر مشتمل ہے اور مالا بدمنہ کا اردو ترجمہ محمد نورالدین ولد محمد اشرف چاٹگامی نے ۱۲۱۲ھ؍۱۷۹۷ء میں کیا ہے، حقوق الاسلام مع رسالہ مزامیر ہم نے پاک اکیڈیمی (کراچی ۵) کی طرف سے ۱۹۶۳ء میں طبع کرا دیا ہے (۱) تذکرہ علمائے ہند ۳۸۳ (۲) خزینۃ الاصفیاء از مفتی غلام سرور لاہوری مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ص ۶۸۹-۶۹۰۔

[1] ملاحظہ ہو تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ پانی پتی جلد اول ص ۴، ۵ و جلد پنجم ۱۸۳-۱۳۰ مطبوعہ جید برقی پریس دہلی ۱۳۵۵ھ؍۱۹۳۸ء

[2] شیخ صادق علی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے جب پانی پت پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو انھوں نے یہاں ایک فوجی چھاؤنی قائم کی شہر کے معززین اور ذمہ دار حضرات نے چھاؤنی کے قیام کو پسند نہیں کیا اور جب لارڈ لیک اپنی فوج کے ساتھ ادھر سے گزرے تو شیخ صادق علی نے لارڈ لیک سے درخواست کی کہ چھاؤنی پانی پت سے اٹھالی جائے لارڈ لیک نے شیخ صاحب سے کہا کہ اچھا تم ہمارے ساتھ چلو ہم راستہ میں اس پر غور کریں گے شیخ صادق علی ساتھ ہو لئے جب کانپور کے مقام پر پہونچے تو پھر شیخ صاحب نے لارڈ لیک سے کہا اسے خیال بھی نہیں رہا تھا اب جو شیخ صاحب کو دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا کہ تم اتنی دور ساتھ آئے اور راستے میں نہ کہا شیخ صادق علی نے جواب دیا کہ میں سمجھا آپ غور فرما رہے ہوں گے لارڈ لیک نے کہا لاؤ میں اسی وقت حکم لکھ دوں مگر اس کے پاس قلم دوات وغیرہ موجود نہ تھا شیخ صادق علی نے عرض کیا کہ میرے پاس سب کچھ (باقی صفحہ ۱۷۱ پر)

افغانوں کا ہے اور ایک مُسلم راج پوتوں[1] کا اور ایک بو علی قلندرؒ کے مزار کے خادموں کا ـــ اس مزار کی عمارت نہایت عمدہ ہے[2] اس کے مصارف کے لئے چند گاؤں کی جاگیر وقف ہے جو لوگ عیال دار ہیں اور بچوں کی پرورش کی استطاعت نہیں رکھتے ہیں وہ اس آستانے پر پرورش پاتے ہیں نواب لطف اللہ خاں صادق[3] اور خواجہ عین الدین اس شہر کے انصاریوں میں سے تھے خواجہ علین[4] الدین نواب آصف الدولہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۰ سے آگے) موجود ہے اور یہ کہکر قلم دوات اور کاغذ لڑکے کو پیش کر دیا اور خود رکوع میں جُھک گئے کہ حضور میری پیٹھ پر رکھکر تحریر فرما دیں اس طرح یہ حکم شیخ صادق علی نے حاصل کیا اور چھاؤنی کرنال منتقل ہو گئی

(تاریخ پانی پت از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)

[1] پانی پت کے مُسلم راجپوتوں کے مورث امر سنگھ حضرت بو علی شاہ قلندر کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے ان کی اولاد محلہ راجپوتاں (پانی پت) میں رہتی تھی (دعوت اسلام (آرنلڈ) از عنایت اللہ دہلوی (علیگڈھ ۱۸۹۸ء) ص ۱۰۱ و تاریخ تبلیغ اسلام از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی (قادیان ۱۹۵۸ء) ص ۱۳۔ [2] بو علی شاہ قلندرؒ کی درگاہ نواب مقرب خاں کے بیٹے نواب رزق اللہ خاں نے عالمگیرؒ کے عہد میں نہایت شاندار بنوائی یہ درگاہ وسط شہر میں زیارت گاہ خاص و عام ہے نواب رزق اللہ خاں نے درگاہ میں دو ستون لگوائے جن کی نظیر نہیں ملتی۔ درگاہ کا اندرونی چوک، سنگ سرخ کی خوشنما مسجد، حوض اور کنواں بھی ۱۰۷۰ھ میں نواب رزق اللہ نے بنوایا

("تاریخ پانی پت از شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)

[3] نواب لطف اللہ خاں صادق کے حالات کے لئے دیکھئے (مآثر الامراء از صمصام الدولہ شاہنواز (کلکتہ ۱۸۹۱ء) جلد سوم ص ۱۷۷-۱۷۸)

[4] یہ شخص غلام حسین خاں بنگال والے کے رفقاء میں سے تھا امامیہ مذہب میں بہت غلو رکھتا تھا عشرہ محرم میں معمول تھا کہ عاشورہ کے دن تمام مال و متاع و نقد و جنس اور زن و فرزند بلکہ اپنی ذات کو بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام پر خیرات کر دیتا تھا۔ اور پھر اُدھار قرض سے زر نقد بہم پہونچا کر مول لے لیتا تھا۔ انتظام اچھا کرتا تھا جونپور کی عملداری پر مامور ہوا وہاں چوری کا بہت زور شور تھا حکم جاری کر دیا کہ کوئی شخص شب کو اپنے گھر کا دروازہ بند نہ کرے اگر نقصان ہوگا تو سرکار ادا کرے گی اگر کوئی چور پکڑا جاتا تو اس کو قتل کرا دیتا، ہاتھ کٹوانا تو ایک معمولی بات تھی، اس سبب سے چوروں کا نام نہ رہا، جس جگہ جاتا امام باڑہ اور مسجد کی بنیاد پہلے رکھتا اور اپنی قبر بنواتا تھا کہتا تھا کہ آخر ایک دن دنیا سے اُٹھنا ہے غربا کو اس کے لنگر سے کھانا اور جاڑوں میں لباس سرمائی ملتا تھا خواجہ عین الدین کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ابراہیم علیخاں بریلی میں کچھ دنوں عہدہ دیوانی پر مامور رہا جب ۱۸۰۱ء میں روہیلکھنڈ پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو تحصیلداری پر مامور ہوا۔

(تاریخ اودھ جلد سوم ص ۱۵۲، ۱۵۳)

کے زمانہ میں بریلی کے صوبیدار تھے اب بھی نواب لطف اللہ خاں صادق کا خاندان اس شہر میں دوسروں سے ممتاز ہے وہاں پر میں نے ایک شخص کو دیکھا جو روشن الدولہ[1] کے خاندان کا تھا یہ شخص دن بھر رندانہ وضع میں رہتا تھا اور رات زاہدانہ گذارتا تھا مسجد میں صوفیانہ گفتگو کرتا اور مے خانہ میں اطوار فاسقانہ رکھتا۔

خرقہ ام رہین بادہ وائی وائی عالمے توبہ کردہ بہ دستم

ایک بادہ پر مرا خرقہ رہن توبہ کی دنیا نے میرے ہاتھ پر

برست وہ قصبہ ہے جہاں کے سب رئیس اثناء عشری مذہب کے پابند ہیں اور روزہ نماز کے مسائل سے بقدر ضرورت واقف ہیں (ان میں) دو تین آدمی حرف آشنا بھی ہیں تھوڑے پر قناعت کرتے ہوئے دوسری جگہ بہت کم جاتے ہیں۔

ولیم فریزر:۔ برست میں جمنا کنارے صاحب عدالت کچھ عرصے رہے فریزر[2] صاحب کا خیمہ بھی پہونچ گیا اور چند روز

---

[1] روشن الدولہ حکومت اودھ کا وزیر تھا وزارت کے عہدہ پر ماہ نومبر ۱۸۲۷ء میں سرفراز ہوا نام محمد حسین خاں عرف مرزا نتھو اور خطاب روشن الدولہ منیر الملک محمد حسین خاں بہادر قائم جنگ تھا باپ کا نام اشرف علی خاں بن بندہ علی خاں روشن الدولہ معتمد الدولہ آغا میر کا سمدھی تھا جب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو نصیر الدین حیدر نے معزول و مقید کیا تو روشن الدولہ نے خلعت و قلمدان وزارت پایا روشن الدولہ نے اپنی وزارت کے استحکام اور گورنر جنرل کے یہاں ناموری حاصل کرنے کے لئے خوب جوڑ توڑ کئے روشن الدولہ کی وزارت کے زمانہ میں سلطنت اودھ کے ہر کام میں تباہی پڑی، خزانہ خالی ہوا۔ بادشاہ سخت ناراض ہوا مگر روشن الدولہ نے تقصیر معاف کرا لی۔ روشن الدولہ نے ملک کو تباہ کر کے دولت جمع کی اور جائز و ناجائز طریقہ کا ذرا خیال نہ کیا مرزا غالب نے جو قصیدہ نصیر الدین حیدر کے مدح میں لکھ کر بھیجا تھا اس پر پانچ ہزار روپئے بطور صلے کے ملنا تجویز ہوا تھا اس رقم میں سے تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار محمد حسن یہ روشن الدولہ کا کریکٹر تھا۔

تاریخ اودھ حصہ چہارم ص ۳۸۰ - ۴۸۳ - ۴۲۶ - ۴۲۷

یادگار غالب از مولانا حالی (مطبوعہ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۳۲ء) ص ۲۵

[2] ولیم فریزر ۱۷۸۴ء میں پیدا ہوا ۱۷۹۹ء میں کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوا ۱۸۰۵ء میں محاصرہ بھرتپور میں نمایاں خدمات انجام دیں ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۵ء تک رزیڈنٹ رہا فریزر نے ۱۸۳۰ء میں دہلی میں ایک عالیشان مکان بنوایا اس مکان سے سارا شہر دکھائی دیتا تھا فریزر کے قتل کے بعد اس کا مکان ہندو راؤ نے خرید لیا جو بیجا بائی (بیوہ مہاراجہ دولت راؤ سندھیا) کا بھائی تھا۔ مسلمان عمائد اور شرفا سے فریزر کے تعلقات (باقی صفحہ ۱۷۳ پر)

کے بعد وہ سپاٹو پہاڑ کی جانب جہاں جنگ ہوئی تھی چلا گیا۔ فریزر صاحب خوش خلق، دلیر، دریا دل، سیر چشم، رفیق پرور اور عقلمند ہے مگر خود رائے اور خود سر ہے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں شروع میں سرکاری قانون نہ تھے بلکہ سب رزیڈنٹ کی تجویز پر منحصر تھا اور فریزر نے جو کام اپنی عقل سے انجام کو پہونچایا اس میں کوئی قباحت پیدا نہ ہوئی گارنر صاحب اور مٹکاف صاحب کے بند و بست کو توڑ کر اضافہ کر دیا، ملک آباد رہا اور آنہ پائی سے بے باقی ہو گئی اس کے باوجود فریزر نے مناسب ترقی نہ پائی بلکہ کسی نے اس کو پوچھا بھی نہیں، فارسی، اُردو اور ہریانہ زبانیں اہل زبان جیسی جانتا تھا اور سب کام خود انجام کو پہونچاتا تھا، اس کے سامنے کوئی کارکن راقم کے قلم یا حاکم کی لاٹھی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا تھا سخت سے سخت کاموں کو ادنیٰ توجہ سے آسان سمجھ لیتا تھا بندہ (مولوی عبدالقادر) کا گمان ہے کہ اگر ایک مرتبہ ممالک محروسہ کی سیر کرے تو سرکاری روپیہ وصول کرنے کا موجودہ صورت سے بہترین طریقہ نکال سکتا ہے۔ عدالت کے کام، سزا کی تجویز جیسا کہ اس ملک کے دوسرے صاحبان باستثناء گارنر صاحب، فارنسکو صاحب اور لیور صاحب کرتے تھے وہ بھی کرتا تھا نیز چوری، رہزنی اور غارت گری کا بند و بست خوب کرتا تھا۔ رزیڈنسی نصیب نہ ہوئی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۲ سے آگے) خوب تھے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ سے کچھ پڑھا بھی تھا اس سلسلے میں نواب احمد بخش رئیس فیروز پور جھرکہ کے یہاں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ اس کا چال چلن مشتبہ تھا فریزر نے نواب شمس الدین خاں کی کسی رشتے کی بیگم سے ناجائز تعلقات پیدا کر لئے تھے، ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو فریزر کو کسی نے گولی سے ہلاک کر دیا۔ غالب اور فریزر کے بہت اچھے تعلقات تھے اور نواب شمس الدین خاں سے غالب کے تعلقات پنشن کی وجہ سے استوار نہ تھے لوگوں کا گمان یہ تھا فریزر کے قتل کی تفتیش کے سلسلہ میں مجسٹریٹ کو غالب نے بھی حتی الوسع امداد پہنچائی مجسٹریٹ سے بھی غالب کے ذاتی تعلقات تھے۔ غالب کے ساتھ ایک اور شخص فتح اللہ بیگ نے بھی تفتیش میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۳ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو نواب شمس الدین خاں کو کشمیری بازار کے باہر شارع عام پر پھانسی دی گئی عوام کی ہمدردیاں نواب شمس الدین کے ساتھ تھیں اور اس سلسلے میں غالب کے کردار کو لوگوں نے پسند نہیں کیا۔

(۱) کلیات نثر غالب ص ۹۱-۹۲ (نولکشور پریس ۱۸۸۵ء)

(۲) ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۱۶۴ (مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۸۹۶ء)

(۳) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول ۳ ۶۹ و جلد دوم ص ۲۸۰، ۲۹۲، ۴۹۳، ۴۹۳

۵ ولیم فریزر ۱۸۳۰-۳۵ء دہلی کا رزیڈنٹ رہا۔

جس سے اس کا حسن و قبح معلوم کیا جا سکتا جب تک کسی کی نیک نامی اور کارگذاری اس کے خیال میں نہ آ جائے اپنے قول و فعل سے اس کے رتبے کا لحاظ نہیں کرتا تھا اور ظاہرداری جو سفارت کے کاموں کے لئے ضروری ہے اس کی طبیعت کو پسند نہیں تھی۔

اسی بڑا اڈ پر کپتان لاہی صاحب انجینئر ڈیلدر صاحب کے ہمراہ پہونچ گیا اور پہاڑی علاقے کو روانہ ہوگیا، کم عمر، نوجوان خوش مزاج اور زود فہم تھا متعدد ہندوستانی اور انگریزوں کی زبانی سننے میں آیا ہے کہ پہاڑی علاقے کی فتح محض اس کے حسن تدبیر اور رہنمائی کی بنا پر ہوئی مگر موت نے مہلت نہ دی اور وہیں ختم ہوگیا اور اس کی کارگذاریاں جنرل آکڑلونی کے نامہ اعمال میں درج ہوئیں۔

یکے نامہ بنویسد و طے کند	دگر آید و مہر بروے نہد
لکھا گرچہ محنت سے نامہ کسی نے	لگائی ہے پر مہر اس پر کسی نے
ندانند مردم نویسندہ را	نپرسند کاں مرد باشد کجا
نویسندہ کو پھر نہ پوچھے کوئی	کدھر ہے کہاں ہے نہ جانے کوئی
بہ بینند نامے کہ اندر نگیں	شمارند، از وے نوشتہ ہمیں،
نگینہ میں کندہ ہے بس نام جس کا	سمجھتے ہیں یہ سب کہ ہے کام اس کا

زمینداران کھتورہ کی سرکشی:- اسی زمانے میں کھتورہ کے زمینداروں نے کھردالی کے تھانیدار سے سرکشی کر ڈالی صاحب عدالت نے علی محمد خاں ساکن لوہاری جلال پور کو ان لوگوں کے لانے کے لئے بھیجا علی محمد خاں اسکنر صاحب کے سواروں کا افسر تھا اور اس کو حکم دیا کہ اگر آنے میں بہانہ کریں اور مقابلے کے لئے آمادہ ہو جائیں تو وہیں ٹھہرنا اور ہمیں لکھ کر بھیجنا تاکہ یہاں سے مع سازو سامان پہونچکر ان کے کرتوت کی سزا دی جائے دوسرے روز علی محمد خاں کے سوار کھتورہ کے زمینداروں کے ساتھ واپس آ گئے اور کہا کہ یہ لوگ بلا کسی عذر کے ہمارے ساتھ آ گئے۔

بندے (مولوی عبدالقادر) کے نزدیک یہاں دو احتمال ہیں یا تو تھانیدار نے اپنا اقتدار دکھانے کے لئے فرمانبرداروں کو خود سر ظاہر کیا ہو یا افسران کے ہاتھوں سے اپنا منہ میٹھا کر کے اس معاملے میں سفارشی بن گیا ہو۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑی لوگوں نے تھانیدار کو سپاہی بچہ سمجھتے ہوئے اس کا مقابلہ کیا لیکن جب سوار پہونچے تو انجام کو سوچ کر ساتھ ہو لئے صاحب عدالت نے بعض کو ضمانت پر چھوڑ

دیا اور بعض کو دو مہینے کے لئے جیل خانے بھیجدیا پھر اس مقام سے لشکر کا کوچ کرنال کو ہوگیا۔

کرنال: کرنال میں محمد علی خاں کے لڑکے عشرت علی خاں وغیرہ تینوں بھائی علیحدہ علیحدہ صاحب عدالت سے ملنے آئے ان کی باتیں اور حرکتیں غیر مہذب دیہاتیوں کی سی تھیں۔ اگرچہ عرصے سے اعزاز و امتیاز رکھتے تھے گالی ان کا تکیہ کلام تھا جو معمولی گفتگو میں شمار ہوتا تھا رنجش کے موقع کے لئے گالی کو مخصوص نہیں سمجھتے تھے۔

مزار بو علی قلندرؒ: کرنال پرانا شہر ہے وہاں کی زبان اور رسم ورواج پنجاب سے ملتے جلتے ہیں۔ کرنال میں بھی بہت اونچے گنبد کا ایک مقبرہ بنا ہوا ہے اور اس کو بھی بو علی قلندرؒ کی قبر کہتے ہیں لوگ پانی پت والی قبر کو وہاں کے گور پرستوں کا فریب سمجھتے ہیں اور اپنے قول کی سند یہ بیان کرتے ہیں کہ بو علی قلندرؒ کا قیام مرتے دم تک بوڑھا کھیڑہ میں رہنا متفق علیہ ہے اور وہ جگہ یہاں سے تین کوس پر۔ ہے پانی پت بیس۲ کوس ہے قریب جگہ کو چھوڑ کر دور کیوں لے جاتے پانی پت والے کہتے ہیں کہ ان کے محبوب مبارز خاں کی قبر پانی پت والے مقبرے میں ہے قرینہ یہ ہے کہ ان کو بھی حسب وصیت یہیں لے آئے ہوں تاکہ مزار قلندر کے سبب سے بہت سے لوگ اس بے چارے کی قبر پر بھی مغفرت کی دعا کریں مگر پانی پت میں وہ سامان زیادہ ہے جو نیکوں کی قبروں پر مردہ پرست لایا کرتے ہیں یہ انجمن ہستی کا حیران (مولوی عبد القادر) کرنال والوں کی دلیل کو قوی سمجھتا ہے کیونکہ وہ بیوقوف لوگ جن کا کام قبرستانوں کی آرائش ہے ہمیشہ عقل سے خارج باتوں پر فریفتہ ہوجاتے ہیں۔

بوڑھا کھیڑہ میں ایک دیوار ہے کہتے ہیں کہ ایک روز خواجہ دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے سنا کہ کوئی بزرگ ان سے ملنے کے لئے سواری پر آرہے ہیں قلندر صاحب نے دیوار کو اشارہ کردیا کہ تو بھی گھوڑے کی طرح چل۔ دیوار چلدی لوگ اس کی بھی زیارت کرتے ہیں اور مجاور دیوار کو دکھاتے ہیں کہ یہاں سے ٹیڑھی ہے اور یہ نشان اسی رفتار کا ہے جوں ہی چند قدم چلی تھی کہ لوگ ڈر گئے قلندر صاحب نے اس کو چلنے سے روک دیا دیکھنے والے بیوقوفوں نے ہر نا سمجھ اور سمجھدار کے سامنے بیان کیا کہ ہم نے بچشم خود دیکھا ہے۔ کم فہم لوگ مشتاق ہوکر دیکھنے چلے آتے ہیں۔ گوشت اور دہی پکاکر ساتھ لیجاتے ہیں لوگوں کو کھلاتے ہیں اور اس کو قلندر صاحب کی روح کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس کھانے کا نام "سہ منی" رکھا ہے ایک زنجیر نما تاگہ چاندی کے دانے پروکر بچے کے پیر میں ڈال دیتے ہیں اور اس بچے کو قلندر صاحب کا غلام کہتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ بچہ یقیناً زندہ رہے گا۔ جوان ہونے پر اس

تاگے کو نکال ڈالتے ہیں گویا بچوں کی زندگی قلندر صاحب کے ہاتھ میں ہے اور پیر وجوان کی زندگی خدا کے اختیار میں ہے۔
اس قسم کی بیہودگیاں تمام ملک ہندوستان، بنگال، مارواڑ اور دکن کے جاہلوں میں رواج پا گئی ہیں۔

شاہ بوعلی قلندرؒ: حقیقت یہ ہے کہ بوعلی قلندرؒ[1] خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہم عصر تھے۔
علوم رسمیہ حاصل کرنے کے بعد محبت خداوندی کی کشش میں جو دلوں کی مقناطیس ہے، سب سے ترک تعلق کر کے آزادانہ زندگی گزار گئے دیوان اور مثنوی فارسی زبان میں یادگار ہیں جن میں کلمات عارفانہ اور اقوال دانشمندانہ بیان کئے ہیں ان کی ایک غزل بہت مشہور ہے

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم	گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم
ہے نظر سے اپنی غیرت رُخ نہ دیکھوں گا کبھی	بات تیری کان کو سننے نہ میں دوں گا کبھی
گر بدام دلِ من افتد آں عنقا باز	گرچہ صد حیلہ کند باز پریدن ندہم
آپھنسا گر جال میں دل کے کبھی عنقا صفت	سو جتن بھی وہ کرے ہرگز نہ چھوڑونگا کبھی

رند مشرب مے خانوں میں اور زاہد خانقاہوں میں اس سے تکلف اُٹھاتے ہیں۔
میں سمجھتا ہوں یہ افسانے حقیقت میں تو معقولیت رکھتے تھے مگر کم عقلوں نے اپنی سمجھ کے مطابق ان میں تصرف کر کے لوگوں میں شہرت دے دی ہے مثال اس کی یہ ہے کہ اس بزرگ (شاہ بوعلی قلندرؒ) کی خدمت میں کوئی شخص دور سے ملاقات کے لئے آرہا تھا استقبال کے لئے اپنے پاس سوائے دیوار کے کسی سواری کے نہ ہونے کا عذر کرنا اچھا نہیں معلوم ہوا اس لئے زبان مبارک سے فرمایا کہ اے دیوار تو ہی چل یعنی ہماری سواری میں

---

[1] حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر نے اول مروجہ علوم حاصل کئے پھر ریاضت و مجاہدہ کیا چشتی سلسلے میں بیعت تھے بعض خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کا اور بعض شیخ نظام الدین اولیاء کا خلیفہ بتاتے ہیں تصانیف رائقہ کے مالک تھے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے اولاد سے تھے ۱۳ رمضان ۷۲۴ھ / ۱۳۲۳ء میں انتقال ہوا۔ (۱) بزم صوفیہ ص ۲۳۵ تا ۲۷۰

(۲) خزینۃ الاصفیاء جلد اول ص ۳۲۷ - ۳۲۸

(۳) پانی پت اور بزرگان پانی پت از مولانا محمد میاں (دہلی ۱۹۶۲ء) ص ۳۰ - ۱۴۱

اختیار نہیں ہے نیک طینت اور خدا پرستوں کو یہی چاہیئے کہ جو شخص اُن کے پاس آئے، اس کو اپنے سے بہتر ظاہر کریں اور اس کی تشریف آوری پر مسرت ظاہر کریں، نادان معتقدوں نے (دیوار کے معاملے) کو دوسری طرح مشہور کر دیا یہی معاملہ سہ منی کا ہے کہ حضرت شاہ بو علی قلندر تنگ دستی کی حالت میں صرف ایک پیالہ دہی پر جو اس علاقے میں کثرت سے ہوتا ہے قناعت کرتے تھے جس سے بھوک اور پیاس دفع ہو جاتی تھی اگر کبھی کوئی گوشت پکا کر لے آیا تو اسے بھی اس پیالے میں ڈال کر کھا لیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب چیزوں کو چھوڑ دیا ہو یا کسی خاص کھانے کے پابند ہو گئے ہوں کیونکہ ان کو ایں و آں سے کیا واسطہ جو چیز آسانی سے میسر آ گئی اس سے بھوک روک لی اور جس چیز سے بدن چھپ سکے اس سے چھپا لیا۔ درویشوں کے لئے بوریا ریشم سے اور بھنے ہوئے گیہوں، خمیری اور روغنی روٹی سے بہتر ہیں۔

گارنر صاحب کا تبادلہ: کرنال سے پھر روانہ ہوئے اور ایک شب درمیان میں قیام کر کے واچور پہنچے آدھا دن گزرا ہو گا کہ ایک انگریزی خط بذریعہ اسپ ڈاک صاحب عدالت کے پاس پہونچا اس کو کھولا دیکھتے ہی حکم دیا کہ سب سفر کے لئے تیار ہو جائیں اور کل کرنال پہونچیں۔ ایسا ہی ہوا جب ہم کرنال پہونچ گئے تو اگلے دن بندے کو بلا کر فرمایا کہ چار آدمی ہمارے پرانے ملازم ہیں، بہاری لال انگریزی نویس، جے سکھ رائے اور دو نظارت کے چپراسی ان کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا پھر جب اُمید سنگھ نے خواہ مخواہ ساتھ رہنے کی خواہش کی تو فرمایا "یہ بھی" اور کہا کہ یہ واقعہ میں انگریزی کتاب میں لکھ دوں گا سر رشتہ کے کاغذات، زیر تجویز آسامی، برقنداز، قیدیوں کے محافظ اور نظارت کے چپراسی سب تمہارے پاس رہیں گے اس مضمون کا ایک روبکار فارسی میں لکھ لو میں اس پر دستخط کر دوں گا، نہ معلوم کون صاحب کب تک یہاں پہونچیں؟ جب تک دوسرا شخص یہاں نہ آئے تم یہیں رہو، لفافہ پولیس والوں سے کھلوانا اس کا جواب جو مناسب سمجھو سر رشتہ کے موافق لکھ دینا اگر کوئی مجرم آ جائے تو اس کو پہرہ داروں کے سپرد کر دینا اور اس کے اظہار لیکر پہلے اس کے پھر اپنے دستخطوں سے تکمیل کر کے مسل مرتب رکھنا جو قابل ضمانت ہو اس کی ضمانت لے لینا۔ اسی مضمون کا ایک پروانہ لکھ کر پولیس میں بھیج دیتا ہوں اور اس میں لکھتا ہوں کہ اگر ہنگامے کی صورت دیکھو تب بھی سر رشتہ دار کو لکھو اور شاہ جہاں آباد بڑے صاحب (ریذیڈنٹ) کو مطلع کرو جنگ یا دوسرے علاقے میں جانے کے سوا، جو کچھ سر رشتہ دار اپنے دستخطوں سے لکھے اس پر عمل کرو پھر فرمایا کہ اگر ویلڈر صاحب آ جائے تو اچھا ہے وہ تمہارا پرانا آقا ہے اور اگر دوسرا کوئی شخص آئے اور اس کے ساتھ رہنے کو تمہارا جی نہ چاہے تو رخصت لے لینا اور دہلی ہو کر مجھ تک پہونچ جانا میں اپنے پاس جگہ دوں گا۔

میں انگریزی میں لکھے دیتا ہوں کہ اس مدت میں سررشتہ دار نے ہمیں خوش رکھا ہے اب اگر ویلڈر صاحب یہاں پہونچیں تو اپنے نزدیک اس کو میرا سپرد کیا ہوا سمجھیں اور اگر کوئی دوسرا ہو تو اس سے نرمی اور آبرو کا خیال رکھتے ہوئے کام لے ورنہ اسکو رخصت کر کے مجھ پر اور اس پر احسان کرے، کیونکہ یہ شخص ہمارا یار شاطر ہے بار خاطر نہیں۔ ویلڈر صاحب کے خیال سے نیز کوئی دوسرا شخص نہ ہونے کی وجہ سے اپنے اوپر جبر کر کے اس شخص کو یہاں چھوڑتا ہے، لوگ سمجھ رہے تھے کہ شاید آقا جمنا کی طرف کلکٹر ہو گیا ہے اسی بناء پر اس کے ساتھ رہنے پر اصرار کر رہے تھے بندہ (مولوی عبدالقادر) اس خیال میں تھا کہ وہ کوہستان جا رہا ہے شام کے وقت صاحب سوار ہو کر جمنا کی طرف روانہ ہو گیا دوسرے روز ساتھی بھی چل دینے میں تنہا وہاں رہ گیا تین محرروں کا کام کرتا البتہ چھوٹا بھائی جو ساتھ تھا نقل کر دیتا تھا ایک محافظ تھا جو کچھ کام نہیں کر سکتا تھا۔

اب ذرا گارنر صاحب کا حال جو کچھ میں جانتا ہوں تحریر کرتا ہوں عدالتی معاملہ تو جیسا ہونا چاہئے ویسا ہی ہے نہ کسی پر غصہ نہ کسی کی حمایت جو کچھ مقدمے میں گواہوں، اقرار اور قرائن سے ثابت ہو جاتا اسی کے موافق حکم فرماتے سزا بھی جرم کے اندازے سے دیتے تھے اس عرصے میں کسی کو، اس سے زیادہ سزا کا حکم نہیں دیا کہ چھ مہینے کی قید اور اس کے بعد ضمانت اور اگر ضمانت نہ ملے تو چھ مہینے اور، اگر کسی جرم کی سزا اس سے زیادہ دیکھی تو اس کو بڑے صاحب (رزیڈنٹ) کی تجویز پر سونپ دیا۔ بخلاف دوسرے اسسٹنٹ صاحبوں کے کہ دس دس اور بیس بیس سال کی قید اور حبس دوام کو کار نمایاں سمجھتے تھے۔ صرف خون کا مقدمہ بڑے صاحب کے پاس بھیجتے تھے، سرکشوں کی تنبیہ بھی خوب کرتے تھے بے کار آدمیوں کا کام پر لگا دینا اسی کا کام تھا۔ اس ملک کی رعایا اس قدر اس سے خوش تھی کہ اس کا نام "اُتارن" یعنی ڈوبتے کو کنارہ پر پہونچانے والا رکھدیا تھا میں سمجھتا ہوں کہ برسوں اس علاقے میں اس کا نیک نام رہے گا۔

ویلڈر صاحب کا عدالت دورہ پر تقرر، گارنر صاحب کے چلے جانے اور پانی پت میں چند روز قیام کے بعد ویلڈر صاحب کا خط پہونچا کہ تنہا خود کو یہاں (دہلی) پہونچاؤ میں روانہ ہو کر اسی روز صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا پوچھا کہ وہاں (عدالت دورہ) پڑھے لکھے کتنے آدمی ہیں۔ میں نے کہا اس ناچیز کے سوا اور کوئی نہیں تین فارسی نویس اور ایک انگریزی نویس، ہمراہ چلے گئے فرمایا کیا استعفا دے دیا ہے میں نے کہا کہ صرف ایک شخص اُمید سنگھ نے استعفا دے دیا ہے جو ناظر تھا فرمایا اب بڑی مشکل پڑ گئی اگر بڑے صاحب کو لکھتا ہوں تو پہلے صاحب کی شکایت ہے جو مناسب نہیں اور نہ لکھوں تو مشکل۔ کام کیونکر چلے میں نے کہا کہ ابھی جیل خانے کا دارو غہ

کوئی مقرر نہیں ہوا بیس روپے مہینہ تین ماہ سے بچت میں جمع ہو رہے ہیں اور تھانہ بھون کے دو آدمی ایک کردری مل دوسرا گردھاری لال لشکر میں اُمیدوار ہیں امتحان کے طور پر ان سے کام لیا جائے اور نقل کے کام میں محافظ دفتر بھی مدد کرے نیز اٹھائیس تھانوں کے برقندازوں کی برطرفی اور بحالی کے سلسلے میں درمیانی ایام کی بچت بھی جمع ہے تین مہینے تک فارسی نویس کی تنخواہ کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گارنر صاحب روانگی کے وقت بڑے صاحب کو ماجرا لکھنا بھول گئے غالباً آج کل میں لکھ بھیجیں گے کہنے لگے کہ وہاں کے کثرت مشاغل کی بنا پر بھول جانا بھی بعید نہیں اور انگریزی نویس جو چالیس روپے تنخواہ پاتا ہے اس کی بجائے دوسرا آدمی رکھنا ضروری ہے اس کے لئے کیا کیا جائے میں نے کہا اگر مضائقہ نہیں ہو تو گارنر صاحب کو یہ مضمون لکھ بھیجیں کہ آپ کے انگریزی خط کی نقل جو یہاں سے روانگی کے وقت بڑے صاحب کو لکھا گیا تھا انگریزی نویس نے کتاب میں نہیں کی ہے مہربانی فرما کر اگر نقل آپ کے پاس ہو تو بھیجدی جائے تاکہ اس کے مطابق بڑے صاحب سے رخصت لینے والوں کی تنخواہ کی منظوری اور ان کے عوض میں تقرر کرنے کی یاددہانی کی جائے ویلڈر صاحب نے فرمایا کہ اس میں بھی تامل ہے ایسا نہ ہو کہ اس کو کنایہ خیال کر کے خفا ہو جائیں سردست انگریزی اصل نقل کی درستی میرے ذمے ہے اور فارسی تمہارے ذمے۔ اس سے زیادہ فارسی کام انجام دے سکو تو بہتر، میں نے تھانہ بھون کے دونوں اُمیدواروں کو سامنے بلا کر کہا کہ فی الحال امتحان کے طور پر ایک شخص روبکار نویسی اور پروانہ نویسی کرے اور دوسرا نظارت کا کام اور جیل خانہ کی داروغگی انجام دے خرچ کے لئے امداد کے طور پر پندرہ پندرہ روپے مہینہ ملیں گے بارہ روپے ان نظارت کے چپراسیوں کی تنخواہ کے۔ جو گارنر صاحب کے ہمراہ استعفاء دے کر چلے گئے تھے بچت میں تھے میں نے عرض کیا کہ ان کا کیا کیا جائے فرمایا کہ غلام باسط تمہارا چھوٹا بھائی ساتھ ہے اور عملے کے سفر خرچ کی مد سرکار میں نہیں ہے فی الحال یہ بارہ روپے اور تیرہ بچت میں سے ملا کر پچیس روپے اس کے نام مقرر ہو جائیں اور وہ (غلام باسط) روبکار لکھا کرے ان دونوں میں سے ایک محرر نظارت کا کام انجام دے پروانے لکھنا اور ان کی نقل کرنا اسی کے ذمے۔ دوسرا جیل خانہ کی داروغگی کرے اور روزانہ کی تقسیم خوراک اور زنجیر و چوب کا حساب لکھے محافظ دفتر بھی نقل لکھ لیا کرے اور فرمایا کہ جملہ اٹھائیس تھانوں سے ایک ایک برقنداز یہاں حاضر رہے ایک ماہ کے بعد دوسرا آجائے تاکہ تھانہ کی کیفیت اور تھانیداروں کی حالت بھی معلوم رہے میں نے عرض کیا کہ مجرموں کو دورے میں ساتھ رکھنے میں اگر سواری دی جائے تو خرچ زیادہ پڑتا ہے پابہ زنجیر منزل پر نہیں پہونچ سکیں گے اور بلا زنجیر بھاگ جانے کا احتمال ہے جب تک کوئی جگہ کچہری اور جیل خانے کے لئے تجویز ہو اگر رائے عالی مناسب خیال کرے تو میعاد

والوں کو پانی پت کے قلعہ میں یا رہتک کی تحصیل میں رکھا جائے اور خرچ خوراک کی فرد تھانہ کا مہر رکھکر بھیجدیا کرے اور تھانیدار مجرم کو تھانہ سے روانہ نہ کریں بلکہ اگر مقدمہ سنگین نہ ہو تو ضمانت لے لیں اور اگر مقدمہ سنگین ہو تو لشکر کے پہونچنے تک وہیں رکھیں اور عدالت کو کیفیت روانہ ہونے کے دن سے اس کو خوراک دیتے رہیں اور ہر تھانے کے سنگین مقدمات کا آخری حکم وہیں دیا جائے کہ سردست اسی میں سہولت ہے آئندہ جو مناسب ہو، اسی درمیان میں بڑے صاحب کا حکم پہونچا کہ گارنر صاحب کے عملے میں جو ملازمین گئے ہیں ان کی تنخواہیں صاحب موصوف کے نوشتے کے مطابق دی جائیں گی اور جن کو عوض میں نوکر رکھا گیا ہے ان کو بھی تنخواہیں ملیں گی۔

آقا (ویلڈر صاحب) نے پانی پت، کرنال اور واچپور کے مقامات پر مقدمات کی تجاویز شروع کر دیں۔ چند روز پانی پت میں قیام رہا۔ وہاں کا تھانیدار شیراں خان تھا جو شہباز خاں سے قرابت رکھتا تھا۔ شہباز خاں بریلی کے کوتوال کریم خاں کا لڑکا تھا کریم خاں سٹین صاحب کے زمانے میں بریلی کے کوتوال تھے۔ شاید شیراں خاں اسی وجہ سے پانی پت میں "نواب" کے نام سے مشہور ہوا اور ولیم فریزر صاحب کا مورد الطاف ہو کر اس عہدے پر پہنچا ہے۔

ولیم فریزر کی ظرافت کا نمونہ:۔ پھر ہم پانی پت سے اور لانہ کے تھانہ میں پہونچے۔ لطیفہ یہ ہے کہ وہاں پر خواجہ احسان علی تھانیدار، جمعدار اور محرر تینوں ہکلے تھے (ویلڈر) صاحب نے ایک کو بلایا جب اس کی زبان سے بات صاف نہ نکلی تو دوسرے کو طلب کیا وہ اس سے بھی زیادہ ہکلا تیسرے کو بلایا وہ ان دونوں سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ آخر رخصت کیا اور ہنسکر کہا کہ یہ سب فریزر صاحب کی ظرافتیں ہیں کہ سب ایک ہی رنگ کے جمع کر دئے ہیں وہاں پر ایک دن قیام کر کے رہتک گئے۔

سررشتہ دار عدالت (مولوی عبد القادر) کی ذمہ داری میں اضافہ: رہتک پہونچتے ہی مٹکاف صاحب کا خط آقا کے نام پہونچا کہ میں لارڈ مائرا گورنر جنرل بہادر کے لشکر میں جا رہا ہوں تم اپنے آپ کو بہت جلد یہاں پہونچاؤ۔ آقا وہاں روانہ ہو گیا اور مجھ سے فرمایا کہ میں تو یہاں سے گورنر جنرل کے لشکر میں جاتا ہوں وہاں اتنی فرصت نہ ہو گی کہ تھانوں کے کوائف جو وہاں پہونچیں ان کو دیکھوں اور ان پر مناسب حکم لکھوں۔ دوسرا کوئی ایسا شخص نہیں جو ساتھ لیجانے کے لائق ہو یا تنہا یہاں چھوڑا جا سکے بہتر ہو کہ کیفیت پڑھ کر اور غور کر کے جو کچھ حکم اس پر مناسب ہو ایک علیحدہ کاغذ پر لکھ کر کیفیت کے ساتھ ہمارے پاس روانہ کر دو اور ضرورت ہو تو پروانہ بھی لکھکر بھیجدیا کرو۔ وہ ملاحظے اور دستخط کے بعد تھانہ کو چلا جائے گا اور حکم، کیفیت کی پشت پر دستخط شدہ تمہارے پاس پہونچ جائے گا اس سے کتاب میں پروانے کی نقل کر لینا دشوار نہ ہو گا اور یہ کہ مجرم کو اس کے جرم، حیثیت اور احتیاط پر

نظر رکھتے ہوئے اپنی رائے سے پابہ زنجیر یا بچوب کرسکتے ہو، ضمانت بھی لے سکتے ہو۔ جو صورت اختیار کی جائے اس کی تحریر بھیج دی جائے۔

پانی پت کا ایک واقعہ: پانی پت کا سابق تھانیدار مبارک شاہ فرزند حیرت شاہ خاں تھا جس نے تھیکسپیر صاحب سپرنٹنڈنٹ و مہتم امور لشکر نواب گورنر کی توجہ سے میرٹھ کی کوتوالی کے دورے میں نیک نامی کی بنا پر منصف کا عہدہ حاصل کرلیا تھا اور بعد کو اس کی خرابی اس حد تک پہونچ گئی کہ صدر تک اطلاع ہوگئی اس شخص نے ایک عرضی لکھی کہ ایک شخص بازار کے عام راستے میں اپنا مکان بنا رہا ہے اور ایک دیوار کی بنیاد اپنی حد سے گز بھر نشانہ بازار کی جانب بڑھا کر کھود رہا ہے جس سے بازار تنگ ہوتا ہے اور زبانی ممانعت سے باز نہیں آتا۔ یہاں سے حکم گیا کہ ہرگز بنیاد نہ رکھنے دیں جب تک اس مقام کا نقشہ شہر کے سربرآوردہ حضرات کا دستخط شدہ یہاں نہ آجائے اور یہاں سے اس پر حکم نہ ہو جائے۔ اگر خود سری کرے تو جواب دہی کے لئے پولیس کے سپاہیوں کے سپرد کر کے یہاں بھیجدیں اور اس عرصے میں اس حکم کے پہنچنے سے پہلے کچھ دیوار بن گئی ہو تو اس کو خاک برابر کردیں۔ نہ معلوم وہ شخص کیونکر طامس صاحب کا پروانہ جس کو شہر سے باہر والی پولیس کے مقدمات سے کوئی سروکار نہ تھا تعمیر کی اجازت کے متعلق تھانیدار کے نام لے آیا تھانیدار نے ڈیلڈ صاحب کو لکھا صاحب موصوف نے تھانیدار کو لکھا کہ تم کو یہاں کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے، دوسرے صاحبان جو کچھ لکھنا چاہیں گے ہمیں لکھیں گے اور وہ پروانہ ہمارے پاس بھیجدو تھانیدار نے پروانہ یہاں سے بھیجدیا اس میں یہ تھا کہ یہ شخص عمدہ عمارت جس سے بازار کی رونق ہو جائے تعمیر کراتا ہے اور تھوڑی سی جگہ بازار کی جس میں سوائے سرکار کے کسی کا حق نہیں ہے، اپنے مکان میں شامل کرتا ہے اور بغیر شامل کئے ہوئے اس کی تعمیر ناقص رہتی ہے لہٰذا اس میں رکاوٹ نہ ڈالنی چاہیئے۔ اس پر صاحب کے دستخط اور عدالت دیوانی کی مہر بھی تھی صاحب نے اس کو واپس کردیا اور حکم لکھا کہ پروانہ غالباً سہو سے مزین بمہر و دستخط ہو گیا ہے کیونکہ یہ مقدمہ دیوانی کے متعلق نہیں اور یہاں کی فوجداری کا تعلق دورہ کی عدالت سے ہے نیز یہاں سے ممانعت کے حکم کے بعد بڑے صاحب کی اجازت کے سوا دوسرے کو اجازت دینے کا حق نہیں ہے لہٰذا پروانہ واپس ہوتا ہے تھانیدار پہلے حکم کی تعمیل کرے تھانیدار نے عدالت دورہ کا حکم ثانی پہنچنے پر اس کی گز بھر اونچی دیوار کو جڑ سے اکھڑوا دیا اور حکم سے مطلع کردیا قصہ ختم ہوگیا۔

ڈیلڈ صاحب شاہجہاں آباد گئے وہاں پر اُمید سنگھ ناظر گارنر صاحب کا سفارشی خط لاکر پھر نوکر ہوگیا اور صاحب کے ہمراہ رہا بندہ حسب الحکم کام انجام دے رہا تھا مثلاً پولیس والوں کی یہ رپورٹ پہونچتی کہ فلاں گاؤں اور فلاں

مکان میں رات کے وقت نقب لگا اور اس قدر مال چوری ہوا تو یہاں سے اس عبارت کا پروانہ ہوتا کہ یہ نہیں لکھا کہ دیوار مٹی کی ہے یا اینٹ کی نقب کا طول و عرض کس قدر ہے؟ اس مکان کے چاروں طرف کس کس کے مکان ہیں؟ نقب کی جانب کس کے مکان کا صحن ہے؟ شاہراہ، سربند گلی، عام گلی، خانہ ویران یا کسی کی کھیتی ہے پھر جانے نقب سے راستہ کدھر کو جاتا ہے؟ اور وہ راستہ جہاں سے آرہا ہے وہ کیسا مقام ہے؟ شب کو لوگ وہاں رہتے ہیں یا نہیں۔ لوگوں نے اس دیوار کو بے نقاب کب دیکھا تھا؟ سب سے پہلے کس وقت اور کس نے نقب دیکھا جب دیکھا تو کیا کیا اور کتنے آدمیوں کو دکھایا؟ اس وقت نقب کے قریب کسی کے پیر کا نشان پایا گیا یا نہیں اور پایا گیا تو رفتار بھی ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو وہاں کی زمین کیسی ہے؟ اور رفتار کیوں نہیں، چوری سے پیشتر کسی نے اس چیز کو اس گھر میں دیکھا تھا یا نہیں، اور وہ شخص لوگوں کا مقروض ہے یا نہیں۔ اس رات اس گاؤں میں کوئی نو وارد بھی تھا یا نہیں اگر تھا تو صبح کو وہ شخص گاؤں میں رہا یا نہیں، چوری سے پہلے کوئی اجنبی شخص اس کے گھر میں آیا تھا یا نہیں، گاؤں کا چوکیدار اس کا کیا جواب دیتا ہے؟ اور اس کی چوکیداری کے زمانے میں اس گاؤں میں کتنی مرتبہ چوری ہوئی؟ چوکیدار اسی گاؤں کا باشندہ ہے یا دوسرے گاؤں کا۔ جس کے گھر میں چوری ہوئی ہے وہ کب سے اس گاؤں میں آیا ہے یا وہیں کا قدیم باشندہ ہے یا دوسرے گاؤں کا اس شخص کی گاؤں میں کسی سے مخالفت ہے یا نہیں اس گاؤں کے باشندے دوسرے گاؤں کے باشندوں سے کوئی نزاع رکھتے ہیں یا نہیں آس پاس کے دیہات نیک نام ہیں یا بدنام مال کے مالک کا کسی پر شبہ ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو کیوں؟ یہ سب باتیں لکھ کر بہت جلد بھیجیں، چوکیداروں کو بھی روانہ کریں اور آئندہ ان سب باتوں میں کوئی فروگذاشت نہ کیا کریں۔

کچھ دن یوں ہی گذر گئے۔ اچانک حکم پہونچا کہ کل شام تک میں پہونچتا ہوں وہ تمام مقدمات جو حکم کے امیدوار ہوں مرتب کر کے رکھو اور سفر کے لئے تیار رہو دوسرے دن صاحب عدالت تشریف لائے اور تمام مقدمات مرتب دیکھے فرمایا ایک حکم لکھو تاکہ اس کی ایک نقل بڑے صاحب کی خدمت میں اور ایک پانی پت کے تھانیدار کے پاس بھیجدی جائے۔ بڑے صاحب نے عدالت دورہ کے سامنے ارشاد فرمایا کہ نواب گورنر جنرل بہادر کے لشکر سے واپسی کے وقت جب رات کو میں پانی پت پہونچا تو ایک بہت معزز اور محترم دکاندار دیکھنے میں آیا جس نے واویلا کرتے ہوئے راستہ روک لیا کہ تھانیدار نے میرا کئی ہزار روپے کا نقصان کرادیا۔

کہ میری وہ عمارت جس سے بازار بلکہ شہر کی رونق تھی اس بہانے سے کہ شاہراہ پر بن رہی ہے مسمار کرادی اور دہلی کے صاحب عدالت دیوانی کا حکم دیکھا لیکن اس پر عمل نہ کیا۔ میں نے پالکی سے سر نکال کر دیکھا تو واقعی شاہجہان آباد کے مکانوں کی طرح عالیشان مکان مسمار شدہ نظر آیا۔ اگرچہ دیوار شاہراہ میں تھی۔ لیکن اس سے چنداں نقصان بھی نہ تھا۔ اس بے چارے پر بہت ظلم ہوا، اس بنا پر ضروری ہے کہ تھانیدار اس کی جواب دہی کرے کہ اس دیوار کو اتنا بلند ہی کیوں ہونے دیا گیا کہ اس پر بڑی عمارت قائم ہو سکے اور ہزاروں روپیہ خرچ ہو گیا اس مکان کے مسمار ہونے میں اس شخص کا کافی نقصان ہو گیا۔ بانیٔ عمارت اگر چاہے تو اپنے نقصان کی نالش عدالت دیوانی میں تھانیدار کے نام کر سکتا ہے چونکہ شاہراہ میں سب رعایا اور سرکار کا حق ہے جب تک سب چلنے والے دیوار بنانے کی رضامندی نہ دے دیں صرف سرکار اجازت نہیں دے سکتی۔

یہ حکم تھانیدار کے پاس پہونچا اس نے لکھا کہ دیوار کا نشان باقی ہے اور معمار موجود ہیں اس مکان کی وسعت تعمیر مال کثیر کا مصرف نہیں رکھتی۔ اینٹ اور مٹی ابھی تک موجود ہے۔ سب دوکاندار اور شہری لوگ سمجھتے ہیں کہ پانچ چھ روپے سے زیادہ نقصان نہیں ہوا مجھے منظور ہے کہ بانیٔ عمارت میرے نام دیوانی میں نالش کرے اگر فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے اور عمارت کی لاگت پچاس روپے بھی ثابت ہو جائے تو میں سنگین سزا کا مستحق ہوں یہاں سے حکم گیا کہ یہ انتہائی گستاخی ہے کہ بڑے صاحب کے معائنے کو خلاف واقعہ ظاہر کر رہے ہو روبکاری کے وقت اس کی بھی سزا پاؤ گے بانیٔ عمارت نے نالش نہیں کی لیکن تھانیدار معزول ہو گیا اور گستاخی کے عوض جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ برست کا تھانیدار میر محمد یوسف اس کی بجائے مقرر ہوا حقیقت یہ ہے کہ اگر اس ملک میں قانون جاری ہوتا تو بانیٔ عمارت کی اس قدر جلد دادرسی ممکن نہ تھی مگر بڑا صاحب بھی ایسا ہی تیز نظر چاہیئے کہ رات کے وقت میں سرسری نگاہ ڈالتے ہی معاملہ کی حقیقت کو ایسا پہنچا کہ رات دن کے دیکھنے والے بھی اس معاملے میں حیران ہیں اور عقلمند بھی ایسا کہ اپنے حکم کی تعمیل کے مشاہدے کو اپنے اور تمام لوگوں کی ملاقات سے زیادہ سمجھتا ہے ان ہی وجوہ کی بنا پر دہلی، اجمیر اور جے پور کے صاحبان انگریز فرماتے ہیں کہ اس ملک کے لئے قانون کی ضرورت نہیں اور حسن اتفاق کہ تینوں مقامات کی برکت نے صاحبوں کی استعداد اتنی بڑھادی ہے کہ باوجود کم سنی کے دیوانی کی لاتعداد رقموں کے فیصلے اور مجرموں کو حبس دوام تک کی سزائیں بلا اطلاع صدر اور بغیر کسی دوسرے کی شرکت کے تجویز کر سکتے تھے۔

گورنر جنرل کے لشکر کے لئے حفاظتی تدابیر۔ آقا نے فرمایا کہ بڑے صاحب خود تو دہلی رہیں گے اور مجھے نواب گورنر جنرل بہادر کے لشکر کے ساتھ کر دیا ہے تاکہ چوری نہ ہو کیونکہ بڑے صاحب کی ہمراہی کے دنوں میں لارڈ صاحب کے توشک خانے تک میں چوری ہو گئی اور فرمایا ہے کہ اگر پاسبان زیادہ درکار ہوں تو نئے ملازم رکھ لئے جائیں تنخواہ کی رقم سرکاری خرچ میں محسوب ہو جائے گی اور اگر فیض طلب خاں (رئیس نارنول) کو وہاں سے لکھ کر طلب کر لیں تو کوئی مضائقہ نہیں میں نے عرض کیا کہ بڑے صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس میں دم مارنے کی جگہ نہیں وہ سب کا افسر ہے انگریزی سرکار میں مرتبے کی ترقی عقل کی مناسبت سے ہوتی ہے آقا نے فرمایا کہ اس تعریف سے کوئی فائدہ نہیں اگر کوئی تدبیر تمہارے خیال میں آئے تو کہو کہ اب آفت میرے سر پر ہے میں نے عرض کیا کہ تھانیداروں کو پروانے لکھدیئے جائیں کہ شب کے وقت لشکر کی حفاظت گرد و پیش کے زمینداروں کے ذمے ہے اور سفر کی حالت میں بر سر راہ دیہاتیوں کے ذمے ہے لہذا لشکر جس تھانے میں پہونچے زمینداروں سے مچلکے لکھوا کر جائے قیام اور راہ کوچ کی حفاظت ان کے ذمے کر دیں اور لشکر کے مہتمم کو لکھ دیا جائے کہ بیرونی چوری کی حفاظت تو میں کر سکتا ہوں لشکر میں تاکید کر دی جائے کہ چوری کی اطلاع کوچ سے پیشتر دے دیں تاکہ زمیندار تدبیر کر سکیں اور جو کوئی لشکر سے علیحدہ ہو کر گیا ہو اس کو پکڑیں اس کا سامان دیکھیں فرمایا بہتر ہے لکھدو دیکھا جائے گا کامیابی ہوتی ہے یا نہیں اور آقا نے امید سنگھ کو محکمے کے متعینہ عملہ پر چھوڑ کر فرمایا کہ جس قدر کاغذات آئیں لشکر میں بھیجدیا کرو۔

میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی (غلام باسط) اور امروہہ کا باشندہ امانت علی کنبوہ تھا جو نوکری کی امیدواری میں آکر سابقہ شناسائی کی بناء پر ہم میں شامل ہو گیا تھا آقا، اسکے مکان پر اترے، اصالت خاں تحصیل دار نے بھی اپنا خیمہ لشکر میں نصب کرایا تاکہ حکم کی تعمیل میں دیر نہ ہو وہاں کا تھانیدار انور علی تھا جو کارگزاری کے اعتبار سے باتیں زیادہ بناتا تھا، آقا (ولیدر صاحب) کے حضور میں آیا اور کہا خداوند نعمت زمیندار لوگ مچلکا لکھنے سے انکار کرتے ہیں اور وہ حق بجانب بھی ہیں لشکر کی حفاظت زمینداروں سے کیسے ہو سکتی ہے آقا نے مجھے علیحدہ لیجا کر فرمایا کہ وہ (انور علی) پرانا آدمی ہے تم ہمیشہ ایسی راہ چلتے ہو جدھر کو کبھی کوئی نہ گیا ہو میں نے عرض کیا کہ بندہ لکھنے پڑھنے کی تنخواہ پاتا ہے وہ پچاس روپیہ سے زیادہ نہیں یہ میری نادانی ہے کہ میں محرر کا کام کر رہا ہوں اسکے علاوہ محافظت کے انتظام کی تدبیر بھی بتا دی ٹھیک نکل آتی تو انعام کچھ بھی نہ تھا مگر سر دست الزام تو ہے ہی یہاں سے کلکتہ تک کسی سر رشتہ دار نے تھانے کا بندوبست نہیں کیا ہے اب مجھکو جو ارشاد ہو لکھدوں یا اس بیہودہ گوئی کی سزا دے دیں یا آئندہ کیلئے مچلکہ لے لیں یا دہ پڑا تا (تجربہ کار)

سررشتہ داری پر رہے اور بندے کو تھانے میں بھیجدیں مسکرا کر فرمایا اگر تم طلب نہ جانتے ہوتے تو یقیناً ڈاکٹر کے پاس بھیجنا ضروری ہو جاتا تھوڑی دیر ٹھہر و اور اپنے حواس درست کر لو ان ہی پریشان جملوں سے جو تم نے کہے میں نے تدبیر نکال لی تعجب تو یہ ہے کہ اس تغیر مزاج میں تدبیر تم سے ضائع نہیں ہوئی میں ابھی لوگوں کے سامنے کہوں گا کہ یہ تمہاری تدبیر تھی لہٰذا تم ہی تھانے جاؤ اور اس کو انجام دو اور انور علی خاں یہاں پر تمہارے کام کو انجام دے کیونکہ وہ خوشخط اور جہاندیدہ ہے اگر کام انجام کو پہونچ گیا تو انور علی خاں پھر تھانے نہیں جائے گا تمہاری تجویز سے دوسرا شخص وہاں رہے گا اور تم اپنے کام پہ آ جاؤ گے اگر یہ کام انجام کو نہ پہونچا تو اپنے گھر کا راستہ لینا، میں نے خوش ہو کر کہا بسم اللہ، آقا بظاہر غضب آلود ہو کر باہر آیا اور اسی تجویز کے مطابق فرمایا۔

مولوی عبدالقادر کا ہانسی کا تھانیدار مقرر ہونا اور زمینداروں کے مچلکے لینا: میں سلام کر کے تھانے چلا گیا وہاں مسند اور تکیہ دیکھا میں نے ان چیزوں کو اُٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ یہ چیزیں پاگلوں کے زمانے کی یادگار ہیں۔ انگریزی سرکار میں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر نیچے اُترا، زنجیریں پڑی ہوئی دیکھیں، مزدوری دیکر سب کو آقا کے پاس بھیجدیا۔ اور کہلا بھیجا کہ چار اور زنجیریں جو موجود نہیں ہیں لوہاروں کو بلا کر اسی وقت فراہم کرتا ہوں زمیندار بیٹھے ہوئے تھے پوچھنے لگے کہ زنجیروں کا کیا ہوگا میں نے کہا معلوم نہیں۔ صاحب عدالت اسکنر صاحب کے مکان پر ہیں جو تمہارے رویے سے واقف ہیں اور فریزر صاحب نے بھی وہ سختی جو اس قوم کے لوگوں کے لئے مناسب ہے اسی طرح سیکھی ہے نہ معلوم آئندہ کیا ہوگا آج آقا نے جو گفتگو ہم سے کی ہے کبھی نہیں کی تھی پھر میں نے کہا کہ پہلے تم سب لوگ ہمارے ساتھ آؤ اور صاحب کے سامنے جو کچھ کہنا ہو کہہ لو دیکھا جائے کہ آج ہزاروں آدمیوں کے سامنے کہ لارڈ صاحب کا لشکر بھی آ رہا ہے ہمارے اور تمہارے لئے کیا ہوتا ہے زمیندار میرے ساتھ ہو لئے میں نے کہا اگر مچلکے نہ لکھو گے اور نگہبانی نہ کرو گے تو یقیناً لشکر میں چوری کثرت سے ہوگی۔ اور لشکر کا مالک (گورنر جنرل) کہ جس سے بڑا ہندوستان میں کیا نہیں ہے تم کو فسادی سمجھے گا۔ پیشتر بھی اس ملک کی سرکشی سُن چکا ہے اور بھوانی کی لڑائی تو مشہور ہے اگر جلاوطنی کا حکم دے دیا تو کیا کرو گے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے ہو اور اگر رکھتے ہو تو اس سے بہتر کیا ہے میں تمہارا نوکر ہوا جاتا ہوں مجھے اپنا سامان دکھلاؤ وہ کہنے لگے ہمارا زور تو فریاد ہے اگر ہماری فریاد نہ سُنی گئی تو پھر اسی کے کہنے پر عمل کریں گے (یعنی مچلکے لکھ دیں گے) میں سمجھ گیا کہ ٹھیک ہے میرے پہونچتے ہی صاحب باہر آ گئے اور پوچھا کہ کیا مچلکے لکھ دئے میں نے کہا ان کو کوئی عذر نہیں صاحب نے کہا کہ میں ایک صاحب سے ملنے جا رہا ہوں

جلد واپس آتا ہوں مچلکوں پہ دستخط کر رکھیں واپس آؤں گا تو دستخط اور تصدیق کر کے پہونچا دیئے جائیں گے امانت علی کو تھانے بھیجدیں تاکہ بہت جلد زنجیریں پہونچیں اور بروقت حکم، دیر نہ لگے، یہ فرما کر چلے گئے، سب نے بلا عذر دستخط کر دیئے اور رخصت چاہی تاکہ جا کر بند و بست کی تدابیر کریں میں نے آقا کو اطلاع کی، وہ آئے اور دستخط کر کے سب کو رخصت کیا میں نے ان زمینداروں کے سامنے ہی عرض کیا کہ اگر حفاظت قابل اطمینان کی گئی تو انعام کے مستحق ہوں گے، آقا نے فارسی میں فرمایا کہ انعام کہاں سے دیا جائے گا میں نے عرض کیا کہ حضور کی مہربانی سے ان کو راضی کرنے کا بہت سامان رکھتا ہوں آقا کے سامنے میں نے ان سے پوچھا کہ انعام چاہتے ہو یا لارڈ صاحب کی نوکری جیسے اسکنر صاحب کے سواروں نے کی ہے کہنے لگے کہ انعام کیا ملے گا میں نے کہا کہ جو ملک کا دستور ہے یعنی ایک ایک پگڑی کہنے لگے اور ملازمت، میں نے کہا یہ میرے ذمے ہے

گورنر جنرل کی تشریف آوری:- لارڈ صاحب (گورنر جنرل لارڈ ماٹرا) تشریف لائے اسکنر صاحب کے سوار دو طرفہ صف بستہ کھڑے تھے کہ لارڈ صاحب ظاہر ہوئے سب آداب بجا لائے امیر کبیر (گورنر جنرل) سر سے ٹوپ اُتار کر دائیں اور بائیں دونوں صفوں کے درمیان سلام کا جواب دیتے ہوئے گزر گئے اور خیمہ گاہ میں پہونچکر گھوڑے سے اُترے [1]

ایک فقیر، ساز ہاتھ میں لئے ہوئے بیٹھا تھا اس نے فقیرانہ اور مسافرانہ راگ گانا شروع کر دیا دریا دل امیر نے اشارے سے اس کو بلایا اور اس کا ساز لیکر دیکھا پھر واپس دے دیا اور چند اشرفیاں مرحمت فرمائیں، اسکنر صاحب کرنیل کے رتبے پر سرفراز ہو گئے [2] لیکن سواروں میں ایک اجنٹن اور بڑھ گیا کرنیل کے دل کا حال تو وہ خود جانے اس کے افسران دوست اجنٹن کے آنے سے اس گروہ میں تہا نے نظم کی برہمی سمجھے، لشکر کا مقام تو نہیں رہا مگر خود بدولت (گورنر جنرل) شکار کو چلے گئے [3] اور چار سو روپیہ ہانسی کے مسکینوں کی تقسیم

---

[1] لارڈ ماٹرا ۱۳ جنوری ۱۸۱۶ء کو ہانسی پہونچے اسکنر نے تین ہزار سواروں سے گورنر جنرل کا استقبال کیا۔ PRIVATE JOURNAL OF THE MARQUESS OF HASTINGS VOL. I P. 290 (LONDON, 1858)

[2] کیپٹن اسکنر کمپنی کی حکومت سے چنداں خوش نہ تھا گورنر جنرل نے تالیف قلوب کے لئے لفٹنٹ کرنل کا عہدہ دیا (PRIVATE JOURNAL VOL. I. P. 293-294)

[3] ۱۵ جنوری ۱۸۱۶ء گورنر جنرل شکار کے لئے تشریف لے گئے۔ شیر اور چیتے کا شکار کیا اپنے شکار کے حالات بڑی وضاحت سے گورنر جنرل نے لکھے ہیں۔ PRIVATE JOURNAL VOL. I P. 301- 310

کے لئے ویلدر صاحب کے سپرد کیا ویلدر صاحب نے بندہ کو حکم دیا بندہ سمجھا کہ :-

گدایاں نیا بند اندر شمار ‌ ‌ ‌ بدیں مشت زر چوں شوم رستگار
فقیروں کی ہرگز نہ گنتی رہے گی ‌ ‌ ‌ یہ مٹھی رقم کی کہاں تک چلے گی

ہر آن کو نیا بد نہ بستایدم ‌ ‌ ‌ نیا بد بد شنام پیش آیدم
ملا کر کسی کو نہ اچھا کہے گا ‌ ‌ ‌ نہ ملنے پہ آخر وہ گالی ہی دیگا

میں نے کہا بہتر یہ ہے کہ آقا کے سامنے خدمتگار کے ہاتھ سے فقراء پالیں اور شام کے وقت تقسیم ہو تاکہ جب لارڈ صاحب کی سواری اس طرف سے گزرے تو دعاؤں کا شور امیر کے کان میں پڑے اور فقیروں کا ہجوم نظر سے گذرے چنانچہ ایسا ہی ہوا آخر شام ہوگئی - اس کے بعد فقیروں نے بخشش کی جو یہ خبر سنی تو بندہ کے خیمے کے گرد اگرد جمع ہو گئے اور نقدی کی اُمید میں تعریفیں کرنے لگے جب صاف جواب ملا تو آدھی رات تک اپنی پاک زبان کو اس گناہ گار کی بدگوئی سے آلودہ کیا - اور خدا کے فضل سے لشکر میں اس مقام پر چوری نہیں ہوئی صبح کے وقت میں زمینداروں کو لے کر امیر (گورنر جنرل) کے راستہ پر کھڑا ہو گیا - کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ جب وہ کچھ آدمیوں کو سلام کا منتظر دیکھتا ہے تو ٹوپ سر سے اُتار کران کے قریب سے گزرتا ہے اور سلام کے اشارے پر سر ہلا دیتا ہے جوں ہی وہ نکلا سب نے سلام کیا اور بندے نے بھی - نیز میں نے کہا کہ یہ لوگ ہانسی کے زمیندار ہیں - یہ سنکر حسب دستور کار فرما ہوا - وہ زمیندار اتنے خوش ہوئے کہ شاید وعدے کے تنگنے انعام پر بھی نہ ہوتے اس کے بعد جا بجا زمیندار حفاظت کرنے لگے - ایک روز شکسپیر (مہتمم لشکر گورنر جنرل) کی طرف سے لارڈ صاحب کا اونٹ گم ہونے کی اطلاع ملی شام کے وقت زمینداروں نے صاحب ممدوح کے شترخانہ پر پہونچا دیا شکسپیر صاحب نے شترخانے کے داروغہ کو تنبیہ کی -

لشکر میں ایک دھوکے باز کی گرفتاری اور فرار :- اسی سفر میں ایک شخص گرفتار ہوا جو مصنوعی روپے سو لوگوں کا مال خرید کرے جاتا تھا آقا (ویلدر صاحب) نے یہ تذکرہ شکسپیئر صاحب سے کر دیا اس (شکسپیئر) نے فرمایا کہ اس کو یہاں بھیجدو تاکہ شاید میں اس سے یہ پتہ لگا سکوں کہ روپیہ کہاں بنایا جاتا ہے آقا (ویلدر صاحب) نے اس کو وہاں بھیجدیا اور کہا کہ صاحب (شکسپیئر) کے ساتھ سررشتہ دار ایسا ہوشیار شخص ہے جو عجب نہیں کہ اس شخص سے اس فریب کی اصلیت معلوم کرے میں نے کہا کہ میں نے اس شخص (شکسپیئر کے سررشتہ دار) کو دیکھا ہے خوبصورت جوان ہے جلال الدین نام ہے زود نویس اور ہوشیار ہے بنگال کا رہنے والا ہے اس کے منہ سے ابھی تک دودھ کی بُو آتی - ہے ایسے شخص سے کیسے کام نکلے گا مگر کسی کا نصیبہ ہی بے یار و مددگار ہو اور نشانہ ہی

کود کر تیر کے سامنے آجائے تو اور بات ہے دو روز کے بعد شیکسپیر صاحب کی طرف سے روبکار پہونچا کہ سفر میں وہ شخص دھوکا دے کر بھاگ گیا مقام گرفتاری کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً وہ اسی ملک کا باشندہ ہے روبکار کی نقل ڈیلدر صاحب کے پاس بھیجی جائے تاکہ عملۂ پولیس کے ذریعے سے اس کو پھر گرفتار کریں بندے نے عرض کیا کہ شاید دانشمند مہتمم (شیکسپیر صاحب) کے ملازم نے خفیہ نوکر کے ہمراہ سکہ سازوں کے مقام کی نشان دہی کے لئے بھیجا ہوگا آقا نے فرمایا کہ تم کسی پر طعنہ زنی سے درگزر نہیں کرتے۔ اس سے کیا فائدہ ہے میں نے کہا کہ اس خیال سے تو مجھے یہ کہنا چاہئے کہ اگر مقام گرفتاری بود و باش کا قرینہ ہے تو وہ لشکر میں گرفتار ہوا تھا وہیں تلاش ضروری تھی اور چونکہ وہ ہمارے پہرہ داروں سے گم نہیں ہوا ورنہ ایک حلیم کے غصے سے ہم پر بلاء عظیم نازل ہو جاتی اس شکر ہے ہیں، میں نے نیک گمان کیا ہے اب اگر حکم ہو تو تھانیدار کے نام اس کی تلاش کا پروانہ لکھ دوں فرمایا ٹھہر جاؤ۔

گورنر جنرل کا نواب فیض محمد خاں کی جاگیر میں ورود اور فوج کا ہنگامہ:۔ گورنر جنرل کا لشکر چلتے چلتے نواب فیض محمد خاں بہرمیج (رئیس نارنول) کی سرحد پر پہونچا اور فیض طلب خاں (مختار کار فیض محمد خاں) کے ایلچی میرے آقا ڈیلدر صاحب کے پاس آئے تاکہ فیض محمد خاں کے مکان پر لارڈ صاحب کی تشریف فرمائی، فوج کی موجودات کا معائنہ اور لشکر کی دعوت منظور کرائیں۔ آقا نے فرمایا کہ مکان پر تشریف لے جانے کے متعلق تو میں کچھ نہیں سکتا البتہ قلعہ کا معائنہ، فوج کے ملاحظے اور دعوت کی منظوری کے متعلق عرض کر دوں گا۔ ایلچی نے کہا کہ لارڈ لیک صاحب نواب فیض محمد خاں کے مکان پر تشریف لائے ہیں آقا نے فرمایا کہ اس بات کو دوسرے سپہ سالار کے سامنے جب آوے تو کہنا چاہیئے[1]

---

[1] لارڈ لیک ۱۷۴۴ء میں پیدا ہوا ۱۴ برس کی عمر میں فوج میں داخل ہوا جرمن امریکہ وغیرہ میں کام کیا اور جب اوائل ۱۷۹۸ء میں آئرلینڈ میں بلوہ ہوا تو کمان اسی کے ہاتھ میں تھی لوگوں نے اس کی غیر معمولی سختی اور بدنظمی کی شکایات کی ۱۸۰۰ء میں ہندوستان میں سپہ سالار فوج (کمانڈر انچیف) ہو کر آیا شمالی ہند میں اسی نے مرہٹوں کی زبردست طاقت کا قلع قمع کرنے میں بڑا نام حاصل کیا ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے سندھیا کو شکست دی، ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم ثانی نے لارڈ لیک کو "صمصام الدولہ اشجع الملک خاں دوراں خاں بہادر سپہ سالار فتح جنگ" کا خطاب دیا تھا۔

واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۳۵۸

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد سیزدہم ص ۵۹۹

رات کے وقت بیجا نامی آقا (ویلڈر صاحب) کا چوبدار میرے پاس آیا کہ نواب احمد علی خاں رئیس رامپور اور نواب فیض محمد خاں کے مرتبے میں جو کچھ فرق ہو یا نہ ہو لکھ کر بھیجیے میں نے کہا نواب احمد علی خاں کے مورث ..... نواب علی محمد خاں[1] اپنی قوت سے کٹھیر کے مالک ہوئے ان کے بعد احمد علی خاں تک پشت بہ پشت اپنے

---

[1] اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد جب دہلی کی مرکزی حکومت کو زوال ہوا تو صوبیداروں نے خودسری اختیار کی اسی زمانے میں ایک روہیلہ سردار داؤد خاں نے کٹھیر میں آکر قسمت آزمائی کی اور اپنی بلند حوصلگی اور اولوالعزمی سے جمعیت بہم پہنچا کر زمینداروں کی نوکری کا سلسلہ شروع کر دیا ان ہی لڑائیوں کے سلسلے میں داؤد خاں کو موضع بانکولی متعلق پرگنہ کابر تحصیل بہیڑی ضلع بریلی سے ایک بچہ ملا جس کو نواب نے مثل اولاد کے پرورش کیا اور نہایت توجہ سے مروجہ تعلیم اور شہسواری و تیر اندازی وغیرہ جملہ فنون سپہ گری کی تعلیم دلائی یہ لڑکا نواب علی محمد خاں کے نام سے مشہور ہوا اور کٹھیر میں روہیلہ حکومت کا بانی ہوا۔ ۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء میں داؤد خاں مارا گیا تو داؤد خاں کے مشیروں اور کارپردازوں نے علی محمد خاں کو متفقہ طور سے سردار تسلیم کر لیا جب نواب محمد علی خاں نے آنولہ کے زمیندار ہرنند سنگھ کو قتل کر کے آنولہ پر قبضہ کر لیا اُس وقت سے اس کے کام کو خوب ترقی ہوئی وزیر اعظم قمر الدین خاں سے تعلق پیدا کر لیا۔ صفدر جنگ کی وجہ سے محمد شاہ بادشاہ دہلی ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء میں نواب علی محمد خاں کی تادیب کے لئے روہیل کھنڈ پہونچا نواب علی محمد خاں نے مقابلے کے بعد اطاعت اختیار کر لی محمد شاہ بادشاہ نواب علی محمد خاں کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ اور اس کو سرہند کی چکلہ داری پر مامور کیا۔ نواب نے بڑی بہادری سے پنجاب کے سرکش راجاؤں کو مطیع کیا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں جب احمد شاہ درانی نے ہندوستان کا رُخ کیا تو نواب علی محمد خاں کو روہیل کھنڈ آنے کی اجازت مل گئی تو اب نے روہیل کھنڈ پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۳ شوال ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء کو نواب علی محمد خاں کا آنولہ میں انتقال ہوا۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا کاظم علی خاں شیدا نے "ہے ہے افغان" مادۂ تاریخ کہا ہے نواب علی محمد خاں کے انتقال کے بعد حکومت روہیل کھنڈ کے سربراہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں مقرر ہوئے ۱۱۸۸ھ میں روہیل کھنڈ کی تقسیم کی رو سے رامپور و شاہ آباد وغیرہ کا علاقہ نواب علی محمد خاں کے فرزند نواب فیض اللہ خاں کو ملا۔ ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیل کھنڈ کی مسلم ریاست کو ختم کر دیا نواب فیض اللہ خاں دامن کوہ میں چلے گئے آخر ایک معاہدہ کی رو سے رامپور کی ریاست نواب فیض اللہ خاں کو ملی ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۴ء میں نواب فیض اللہ خاں فوت ہوئے نواب فیض اللہ خاں کے بعد نواب محمد علی خاں مسند آرائے ریاست ہوئے جن کی سخت گیر طبیعت کی وجہ سے ان کے بھائی غلام محمد خاں نے ان کو تخت سے اتار دیا نواب محمد علی خاں سخت زخمی ہوئے تھے کہ چل بسے نواب آصف الدولہ نے یہ خبر سُنکر انگریزوں کی مدد سے پھر رامپور پر فوج کشی کی جس کے نتیجہ میں نواب غلام محمد خاں بنارس پہنچے اور نواب احمد علی خاں مسند آرائے حکومت ہوئے ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں احمد علی خاں رئیس ہوئے مگر کم سن ہونے کی وجہ سے نیابت پر نواب نصر اللہ خاں پسر نواب عبداللہ خاں مقرر ہوئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اخبار الصنادید جلد اول ص ۱۹۶ انتخاب یادگار ص ۹-۶۰۔

ملک کے مالک رہے ہیں۔ ایک مرتبہ نواب شجاع الدولہ نے سرکار (انگریزی) کی مدد سے ان کا بہت سا ملک لے لیا[1] اور دوبارہ آصف الدولہ[2] نے۔ اب جو کچھ وہ رکھتا ہے فیض محمد خاں کی جاگیر سے بہت کم ہے البتہ مرہٹوں، صوبہ اودھ اور سرکار انگریزی کی نوکری نہیں کی اور ابھی تک کسی کے سامنے طمع زر کی التجا نہیں کی البتہ دفع شر کی وجہ سے چاپلوسی کی ہے اور کرتے ہیں۔

نجابت علی خاں کا گزشتہ حال سرجان میلکم صاحب[3] نے خود لکھا ہے اور سرکار کی جانب سے جاگیر عطا ہونے کی وجہ بھی خوب روشن ہے اور چونکہ قومیت دونوں کی بھڑایچ[4] ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدم اور نوح کی اولاد

---

[1] ۱۷۷۴ء کی جنگ روہیلہ کی طرف اشارہ ہے جو شجاع الدولہ اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے درمیان میراں پور کٹرہ کے میدان میں ہوئی۔ شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیل کھنڈ کی ریاست کو ختم کیا۔ حافظ الملک شہید ہوئے۔

تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ (۱) اخبار الصنادید جلد اول ص ۳۶۴، ۵۶۱ (۲) حیات حافظ رحمت خاں ص ۱۹۳، ۲۴۹

(۳) تاریخ اودھ جلد دوم ص ۲۰۰ تا ۲۵۵

HASTINGS AND THE ROHILLA WAR BY SIR JOHN STRCHEY (LONDON, 1892)

[2] ۱۷۹۴ء کی جنگ دوجوڑہ کی طرف اشارہ ہے جس کے تفصیلی حالات باب اول میں درج ہیں

[3] ۱۷۶۹ء میں ایک کسان کے گھر میں پیدا ہوا ۱۷۸۱ء میں فوج میں بھرتی ہو کر مدراس پہنچا مختلف ذمہ دار عہدوں پر رہا ۱۷۹۹ء میں ویلزلی نے رزیڈنٹ حیدرآباد دکن کا مددگار مقرر کیا ۱۸۰۰ء میں ایران سفارت کے مشن پر گیا ۱۸۰۱ء میں واپس ہوا جنگ مرہٹہ کے بعد ہلکر اور سیندھیا سے بعض اہم معاہدے ہوئے ۱۸۰۸ء میں پھر دوبارہ ایران گیا ۱۸۱۲ء میں انگلینڈ واپس ہوا اور دو جلدوں میں تاریخ ایران (HISTORY OF PERSIA) مرتب کی ۱۸۱۷ء میں انگلینڈ سے واپس ہوا اور حیدرآباد دکن میں پولیٹکل ایجنٹ مقرر ہوا۔ آخر میں گورنر بمبئی ہوا ۱۸۳۱ء میں ہندوستان چھوڑا اور ۱۸۳۳ء میں انگلینڈ میں فوت ہوا (انسائیکلوپیڈیا برٹانکا جلد ۱۴ ص ۷۲۳-۲۴)

[4] نواب علی محمد خاں روہیلہ سردار داؤد خاں (بھڑایچ) کے جانشین تھے لہٰذا روہیلہ مشہور ہوئے اور ان کی اولاد نوابان رامپور بھی روہیلہ کہلائے نیز ریاست رامپور "رامپور افغانان" کے نام سے مشہور ہوئی۔ نواب علی محمد خاں کی تاریخ وفات کاظم علی خاں شیدا نے "ہے ہے افغان" سے نکالی قدرت اللہ شوق ساکن قاضی ٹولی پرگنہ کابر (ضلع بریلی) طبقات الشعراء میں نواب علی محمد خاں کی اولاد کو افغان لکھا ہے مولوی عبد القادر مولف کتاب ہذا بھی نوابان رامپور کو بھڑایچ (روہیلہ) لکھتے ہیں بعض مورخوں نے موضع باکھولی (تحصیل بہیڑی ضلع بریلی) کے ایک جاٹ کا بیٹا لکھا ہے۔ نواب کلب علی خاں کے زمانے سے نوابان رامپور نے "سید" ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد ریاست کی طرف سے یا ریاست کے اثر و امداد سے جو تاریخیں (مثلاً گلشن فتوت از کلب علی خاں، منتخب العلوم از خلیفہ غیاث الدین، انتخاب یادگار (باقی صفحہ ۱۹۱ پر)

بس سے رہیں۔

صُبح کے وقت جب ہم داوری[1] پہنچے تو تمام فوج شہر سے باہر سلام کے لئے صف بستہ کھڑی تھی۔ پلٹن کے ایک سپاہی نے لارڈ صاحب کے سامنے تنخواہ نہ ملنے کا شکوہ کیا افسر نے اس کو سپاہیوں کے سُپرد کر دیا، تمام فوج برہم ہو گئی اور سرکشی کی صورت اختیار کر لی اور کہا کہ ہم اسی وقت اپنی تنخواہیں لیکر جائیں گے نواب گورنر جنرل بہادر کا وکلاء بھرٹیچ (فیض محمد خاں) کو حکم ہوا کہ ہمارے آتے ہی فوج کا ہنگامہ بے جا ہے جس طرح بھی ہو سکے بہت جلد ان کو راہِ راست پر لاؤ فیض طلب خان نے ہر چند کوشش کی مگر کارگر نہ ہوئی ویلڈر صاحب نے افسرین کو بُلا کر فرمایا کہ اس وقت اپنے اپنے کام پر چلے جائیں[2] لارڈ صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد تمہاری باقی تنخواہ

(حاشیہ صفحہ ۱۹۰ سے آگے) از منشی امیر احمد مینائی، تاریخ بدیع از منشی امیر اللہ تسلیم، تاریخ ریاست رامپور از مولوی اکرم عالم بدایونی سفرنامہ مخلص از ڈاکٹر اظہر علی وغیرہ وغیرہ) مرتب و شائع ہوئیں ان میں نوابانِ رامپور کو "سید" لکھا گیا اور جانشینوں کے شیعہ سادات نے نوابان رامپور کے لئے ایک شجرہ نسب بھی مرتب کر دیا تاکہ کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ حکیم نجم الغنی خاں رامپوری نے اخبار الصنادید کے پہلے ایڈیشن (مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۱۸ء) میں نوابان رامپور کے نسب پر مورخانہ انداز میں بحث کی تھی نواب حامد علی خاں رئیس رامپور (ف ۱۹۳۰ء) نے حکیم نجم الغنی خاں سے جواب طلب کیا اور اخبار الصنادید کے پہلے ایڈیشن کو تلاش کر کے ضائع کیا گیا، اس ایڈیشن کا ایک نسخہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (کراچی) کی لائبریری میں موجود ہے، اخبار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۹ء میں ریاست رامپور کی مدد سے شائع ہوا جس میں نواب حامد علی خاں کی منشاء کے مطابق نوابانِ رامپور کو "سید" لکھا گیا۔ اتفاق کی بات کہ نواب حامد علی خاں کا انتقال ہو گیا اور حکیم نجم الغنی خاں زندہ رہے زمانہ بدل چکا تھا۔ حکیم نجم الغنی خاں نے نوابان رامپور کے متعلق ایک کتاب "مختصر تاریخ ریاست رامپور" ترتیب دیدی اور انھوں نے ان کے نسب کے متعلق اپنی پہلی رائے سے جو اخبار الصنادید کے اول ایڈیشن (۱۹۱۸ء) میں لکھی تھی رجوع کر لیا مختصر تاریخ ریاست رامپور کا حکیم نجم الغنی خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ منشی ظہور الحق خاں مراد آبادی کے پاس موجود ہے اور اس کا ٹائپ شدہ نسخہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

[1] ۱۰ جنوری ۱۸۱۴ء کو گورنر جنرل داوری پہونچے نواب فیض محمد خاں، اپنے چچا فیض طلب خاں اور اپنے دو بھائیوں کے ہمراہ گورنر جنرل سے ملے اس کے بعد ہنگامہ ہو گیا گورنر جنرل نے لکھا ہے میں نے اسکنر کو اشارہ کیا کہ وہ معاملے کو سلجھائیں

[2] ۱۹ جنوری ۱۸۱۴ء کو نواب گورنر جنرل بہادر حسین گنج پہونچے یہ مقام بھی فیض محمد خاں کی جاگیر میں تھا کیمپ کا پڑاؤ حسین گنج سے ایک میل تھا نواب گورنر جنرل حسین گنج تشریف لے گئے نواب فیض محمد خاں نے ملاقات اور استقبال کا بار (باقی صفحہ ۱۹۲ پر)

میرے ذمے ہے۔ سب یک زبان ہو کر کہنے لگے کہ (ویلز) صاحب سے ہمیں کوئی سروکار نہیں اسکنر صاحب اگر ذمہ لیں تو ہمیں منظور ہے۔ چار و ناچار ویلز صاحب۔ اسکنر صاحب کو اپنے ساتھ لے گئے۔

اسکنر صاحب:- اس کارنمایاں سے سادہ دل لوگوں کو گمان ہوا کہ یہ ہنگامہ اسکنر[1] صاحب کے اشارے سے ہوا ہے کیونکہ وہ فیض علب خاں سے رنجیدہ تھا اس نے چاہا کہ امیر کبیر (گورنر جنرل) کے سامنے اس کا نالائق ہونا ظاہر ہو جائے اور جو سوار کہ بھرطرح کے ذمے ہیں ان کا انتظام ہمارے سپرد ہو جائے کیونکہ فیض محمد خاں اس وقت تک خود مختار نہ تھے البتہ ذی عقل لوگ جنہوں نے اسکنر صاحب کو دیکھا ہے جانتے ہیں کہ وہ متواضع، باہمت بردبار اور دور اندیش ہے دوست دشمن کے ساتھ اس طرح بسر کرتا ہے کہ دوسرے نہیں کر سکتے سوائے سٹین صاحب اور جنرل اکٹرلونی[2] صاحب کے جو کوئی حاکم دہلی وہاں گیا اس کا ثنا خواں رہا خاص طور سے اگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۱ سے آگے) معقول انتظام کیا تھا۔ گورنر جنرل نے لکھا ہے کہ نواب فیض محمد خاں کی عمر ۱۹ سال ہے، بہادر، شریف اور خوبصورت ہے میں خود نواب کے ہمراہ اس کے جائے قیام پر گیا ایک قیمتی تلوار، جواہرات کی کشتی اور دوسرے قیمتی تحائف میرے لئے اور میری وغیرہ لیڈی کے لئے نذر کئے (PRIVATE JOURNAL, VOL. P. 313-314)

[1] جیمس اسکنر ۱۷۷۸ء میں ہندوستان میں پیدا ہوا اس کی ماں راجپوت نسل سے تھی اول مرہٹوں کی فوج میں DE BOIGNE کے تحت ملازم رہا جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں اور مرہٹوں سے جنگ ہوئی تو اسکنر نے اپنی قوم کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا اور وہ لارڈ لیک کا شریک ہو گیا سواروں کی ایک رجمنٹ اسکنر کے تحت مقرر ہوئی جو اسکنر ہارس (SKINNERS HORSE) کے نام سے مشہور تھی حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی کا معتقد تھا اسکنر ہانسی میں ۴ دسمبر ۱۸۴۱ء کو فوت ہوا۔ (۱) انسائیکلو پیڈیا جلد بستم ص ۵۵، (۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۲۹۳ (۳) ملفوظات شاہ عبد العزیز ص ۱۶۴

[2] اکٹرلونی ۱۷۵۸ء میں ... پیدا ہوا ۱۷۷۷ء میں ہندوستان آیا لارڈ لیک کے ماتحت کول علیگڑھ اور دہلی میں لڑا ۱۸۰۳ء میں دہلی کا ریذیڈنٹ مقرر ہوا شاہ عالم بادشاہ نے اس کو نصیر الدولہ معز الملک وفادار خاں بہادر ظفر جنگ کا خطاب دیا ۱۸۱۴ء میں میجر جنرل ہو گیا۔ جنگ پنڈاری ۱۸۱۷ء میں اکٹرلونی کو کامیابی ہوئی ۱۸۱۸ء میں راجپوتانہ میں ریذیڈنٹ مقرر ہوا ۱۸۲۵ء میں میرٹھ میں انتقال کیا۔ سر سید احمد خاں کے نانا دبیر الدولہ سے اکٹرلونی کے بہت اچھے تعلقات تھے۔

(۱) سیرت فریدیہ از سر سید احمد خاں مرتبہ حکیم محمود احمد برکاتی (۲) پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۶۴ء ص ۱۱۲-۱۱۳

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ۵۰۱ (۴) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ششم ص ۰۱

کسی دن کوئی ہانسی کی طرف کسی کام کے لئے چلا گیا تو اس کی محبت میں گرفتار ہو ہی گیا۔

اس کا چھوٹا بھائی ہر کام میں بڑے بھائی (اسکنر صاحب) کے مقابلہ پر تھا کہ پہلے اپنی بیوی کو اور اس کے بعد خود کو مار ڈالا اس کے سواروں کے قواعد کے الفاظ فارسی ہیں اور اس انداز سے قواعد ہوتی ہے۔

افسر نے کہا :- تیغ علم۔	سب نے نیام سے تلواریں نکال لیں۔
پھر کہا :- بر کتف۔	سب نے کاندھوں پر رکھ لیں۔
کہا :- پیش رو۔	آگے کو چل دیئے۔
کہا :- دست راست	سب داہنے ہاتھ کو چل دیئے۔
کہا :- یک دست	سب نے تلواریں نیام میں کر لیں۔

اس زمرے (اسکنر کے سواروں) میں زیادہ تر مسلمان یعنی ہریانہ کے افغان، مغل اور تھوڑے سے شیخ اور سید بھی تھے ہر ایک کی خبر گیری وہ خود کرتا تھا رسالدار اور جمعدار پر کام نہیں چھوڑتا تمام فوج اس سے ایسی مانوس تھی کہ خود کو اس کی جیب خاص کا نوکر سمجھتی تھی وہ بھی ان کی شادی وغمی اور رنج وراحت کا شریک رہتا تھا اور اپنے لشکر کے ساتھ مربیانہ برتاؤ رکھتا تھا اگر تنبیہ کرتا تو پدرانہ اور شفقت کرتا تو برادرانہ۔

پادری طامسن اور تبلیغ عیسائیت :- میں نے اس سفر میں دیکھا کہ اتوار کے دن جس وقت پادری طامسن صاحب اپنے خیمے سے عبادت کے خیمے کی جانب روانہ ہوتے تو جو لوگ اتوار کی بھی تعطیل نہیں مناتے تھے بھاگتے دوڑتے نماز کے لئے چلدیتے تھے۔

دوتا می شوی تا کہ دانا خدا بود	کہ ایں مرد راہ است بے رنگ و ریو
جھکائی کمر ہے کہ سمجھے امیر!	کہ یہ مرد حق ہے نہ جعلی فقیر
چہ کار آیدت ایں نماز ریا	کہ بہر شہ است ایں نہ بہر خدا
بھلا کس کرت کی ہے ایسی نماز	دکھاوے کو لوگوں کے کردیں دراز
چہ خوش گفت شیرازی راست گو	کہ دارو بگفتار نام نکو!
سنو بات کیسی یہ سعدی کہے	سدا نام نیکوں میں اس کا رہے
کلید در دوزخ ست آں نماز	کہ در چشم مردم گزارند دراز!
وہ دوزخ کی کنجی ہے ایسی نماز	کہ لوگوں کی نظروں میں لادیں دراز

پادری طامسن اُردو اور عربی دونوں بولتا ہے متواضع اور خلیق ہے علم کا شوق بھی رکھتا ہے جواد نامی عرب سے بے حد ربط و ضبط رکھتا ہے یہ عرب بنارس میں سُنّی ڈھاکہ میں شیعہ اور کلکتہ میں اپنے آپ کو عیسائی ظاہر کرتا تھا اور عیسائیت کے بعد پھر اس نے اسلام کا دعویٰ کیا میں اس (جواد) کو رامپور میں اُس وقت سے خوب جانتا ہوں جبکہ اس کے پر و بال بھی نہ تھے[1] اور مولوی ضیاء النبی[2] صاحب کے دولت خانے پر ہماری نشست و برخاست رہتی تھی لیکن شاید طامسن لوگوں کی روباہ بازی سے واقف نہ تھا کہ ایسے زردوست شخص پر اعتماد کر لیا اور اسی طرح اکبر آباد میں منصور نامی عیسائی کو پاک نفس سمجھ کر دیا۔ صاحب سے اس کے سالے عبد اللہ کے لئے نوکری کی سفارش کر دی۔

بندہ سمجھتا ہے کہ طالب حق کو اسلام اختیار کرنے کے لئے سلطان روم کی خدمت میں اور عیسوی طریقہ حاصل کرنے کے لئے شاہ لندن کے حضور میں اور بُت پرستی کے شوق میں رانا اودے پور کے سامنے جانا کیا ضروری ہے جدھر دل میں پختگی معلوم ہو اس پر کاربند ہو جائے۔ یہ سب روٹیوں کا دھندا ہے نہ کہ خدا اور ایمان کی خاطر ایسا کرتے ہیں واعظ، پنڈت، اور پادری کو نو آموزوں کے نام لکھ کر اپنے ہم مذہبوں کی تعداد کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے خدا تو جانتا ہے لوگ اگر نہ جانیں تو کیا نقصان ہے۔ قصہ مختصر چلتے چلتے لشکر زریلہ میں پہونچ گیا۔

بیگم ثمرو :- زریلہ ثمرو صاحب کی بیگم[3] میرے آقا کے خیمے میں آئی سوئنٹن صاحب اس کے استقبال کو گئے اور میرے

---

[1] جواد عرب کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۴ [2] مولوی ضیاء النبی کے حالات صفحہ ۹۰ پر ملاحظہ ہوں

[3] بیگم میرٹھ ضلع کے ایک مسلمان کی لڑکی تھی ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئی بیگم صاحبہ نے ایک سیاح والٹر رین ہارڈٹ (WALTER REIN-HARDT) سے شادی کر لی تھی جو ثمرو کے نام سے مشہور تھا ثمرو کا انتقال آگرہ میں ہوا جاگیر داد کی مالک یہ بیگم ہوئی۔ ۱۷۸۱ء میں بیگم ثمرو نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا ——— بیگم ثمرو کا ۸۰ سال کی عمر میں ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۶ء میں انتقال ہوا اس کی یادگار سردھنہ کا ایک گرجا ہے چاندنی چوک دہلی میں ثمرو کی عالیشان کوٹھی ہے "داغے بر دل" سے بیگم ثمرو کی تاریخ وفات نکلتی ہے ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۶ء ملاحظہ ہو۔

(۱) تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ جلد نہم ص ۳۳۵ مطبع انسٹیٹیوٹ علیگڈھ ۱۹۱۹ء (۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۲۰۹، ۲۱۰

THE HISTORY OF THE REIGN OF SHAH-AULUM, PP, 194 - 202.

آقا کے ساتھ نواب گورنر جنرل کے خیمے میں نہایت احترام کے ساتھ اس طرح لے گئے کہ وہ پالکی میں تھی اور دونوں امیر اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے ابھی تک سرکار میں اس کا مرتبہ روز افزوں ہے لارڈ کمبر میر سپہ سالار تھے والدہ کا خطاب اس کے لئے لکھا ہے اور کپتان میکن بہادر نے اس کو ہمشیرہ لکھا ہے اور شاہ دہلی کے دربار میں بھی اس کا لقب فرزند عزیزہ ہے اگرچہ آفتاب لب بام ہے، مگر چراغ سحری کی طرح گھر روشن کر رکھا ہے:-

سپاہ دکشاد رز و بازار گاں !	ہمہ خوش دل و خرم ثناخواں
سپاہی، کسان اور تاجر بھی	خوشی سے کریں ثنا سبھی
کند مرزا خود شناسی بجاں	نہ بگذارد ایں کار را بر سگاں
وہ رکھتی ہے خود سب پہ اپنی نظر	بھروسہ نہ کتوں پہ ہے کارگر
بدن شیر مردو بہ پیکر زن ست	بلشکر گہ دشمن آتش زن ست
بدن شیر مرد و بہ جسم زناں،	ہے دشمن کے لشکر پہ آتش فشاں
نژادش چہ پرسی کہ آں خود نکو ست	میاں نکویاں ورا آبرو ست
نہ پوچھو نسب اس کا وہ نیک ہے	کہ نیکوں میں یکتا وہی ایک ہے
تو شیرینی شہد را خواہ بس	چہ پرسی ز زنبور و نیش مگس
مزہ بس شہد کا تجھے چاہیئے	مگس کی حقیقت پہ کیوں جایئے

یہ خاتون ثمرو کے مرنے کے بعد نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے زمانے میں سپاہ ثمرو کی سربراہ ہوگئی تھی

لہ مرزا نجف خاں ایرانی نسل سے تھا ۱۷۳۳ء میں اصفہان میں پیدا ہوا اور اپنی بہن کے ہمراہ ہندوستان آیا جو کہ مرزا محسن (برادر صفدر جنگ) کی بیوی تھیں اول مرزا کوچک (محمد قلی خاں) کی ملازمت میں رہا جو الہ آباد کے قلعہ کا شاہی داروغہ تھا۔ محمد قلی خاں کے خاتمے کے بعد نجف خاں بنگال چلا گیا اور نواب قاسم علی خاں سے تعلق پیدا کیا ... اس نے تین لاکھ روپیہ فوج کی فراہمی کے لئے دیا وہاں مرزا نجف نے کئی لڑائیوں میں شرکت کی جنگ بکسر کے بعد نجف خاں نے انگریزوں کی خدمات انجام دیں فروری ۱۷۶۵ء میں انگریزوں کا الہ آباد پر قبضہ ہوا اور لارڈ کلائیو نے مرزا نجف خاں کی دو لاکھ روپئے سالانہ کی پنشن مقرر کی اور بادشاہ کی طرف سے کوڑے کا فوجدار بنایا۔ منیرالدولہ نے نجف خاں کو اس عہدہ سے .... علیحدہ کر دیا مگر جب ۱۷۷۱ء میں بادشاہ دہلی گیا تو نجف خاں کو انگریزوں نے بادشاہ کے ساتھ سپہ سالار فوج کی حیثیت سے بھیجا۔ یہ بڑا الخطاط کا زمانہ تھا امراء سازشوں اور عیش کوشیوں (باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

اور اپنے اس لڑکے کو[۱] جس نے خود سری اختیار کرلی تھی فراموش خانۂ نیستی میں بھیجدیا تھا اور نجف خاں کے بعد نشیب و فراز میں غلام قادر خاں اور مرزا اسمٰعیل کی شورشوں میں، جنوبیوں (مرہٹوں) کے تسلط میں اور پیرن صاحب کی مختاری میں سلامت روی سے اپنے مرتبے پر قائم رہی اور تخت نشین دہلی کی خانہ زادگی اور اطاعت کا دم بھرتی رہی اور اس خاندان پر دل و جان سے فدا رہی باوجودیکہ اس بیوہ کو بادشاہ کی طرف سے زور روز میسر نہ ہوا برخلاف دوسروں کے کہ کوئی ایران کی دوکانداری سے اور کوئی توران کی گدائی سے خانی اور ترخانی کے مرتبے پر پہونچکر اپنے گزشتہ زمانے کو فراموش کر بیٹھے حتیٰ کہ خاندان تیموری کی خانہ زادگی کو بھی اپنے لئے ناپسند کرنے لگے۔

کسے کو نخستیں نوازد ترا	میان سران سرفرازد ترا
کرے تجھکو پہلے کوئی ارجمند	سروں میں کرے پھر تجھے سربلند
نشاید کہ استیزہ باوے کنی	وگرمی کنی بیخ خود می کنی

---

(۱) (حاشیہ صفحہ ۱۹۵ سے آگے) میں مصروف تھے مرزا نجف خاں نے بہت سی لڑائیاں لڑیں جاٹوں کی خوب سرکوبی کی اور ان کے زور کو توڑا اگر مرزا نجف خاں روہیلوں کا ہمیشہ مخالف رہا۔ اور اس کے لئے وہ مرہٹوں سے بھی اتحاد کرلیتا تھا مرزا نجف خاں کے عہد میں شیعیت کو خوب فروغ ہوا حضرت مرزا جانجاناں کی شہادت اسی کے دور میں ہوئی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ دہلی سے خارج البلد ہوئے آخر زمانہ میں مرزا نجف خاں شراب نوشی اور عیش و عشرت میں مصروف ہوگیا جس کے نتیجہ میں مختلف امراض کا شکار ہوا اور اپریل ۱۷۸۲ء میں فوت ہوا۔
(1) FALL OF THE MUGHAL EMPIRE BY SIR JADAUNATH SARKAR VOL III (CALCUTTA 1952) (2) THE HISTORY OF THE REIGN OF SHAH-AULUM PP. 50 - 55)

سلہ منظفر الدولہ ممتاز الملک نواب ظفریاب خاں بہادر صاحب تخلص تھا میر سوز کا شاگرد تھا۔ خوشخطی میں کمال حاصل تھا موسیقی اور نقاشی میں بھی مہارت رکھتا تھا دہلی میں اس کے مکان پر مشاعرے ہوتے تھے جن میں اس وقت کے مشہور شعراء شریک ہوتے تھے عین عالم جوانی میں ۱۸۰۳ء میں انتقال ہوا — (خطبات گارساں دتاسی، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۲۵؛ گلستان بے خزاں از حکیم قطب الدین باطن مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ، گلشن بے خار از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ صفحہ ۱۲۳ یادگار شعراء صفحہ ۱۲۴

مناسب نہیں جنگ اس سے کرو	اُکھاڑ دیگے جب اپنی گر تم لڑو
مشو خیرہ بہرام چوبینہ دار	کہ برگشت ناگہ از و روزگار
تو بے ہودہ بہرام چوبیں نہ بن	کہ ناگہ پھرے تجھ سے سارا زمن
گرت داستانِ کہن نیست یاد	نگہ کن بہ انجام کار عماد
کہن داستاں گر نہیں تجھکو یاد	ذرا دیکھ آخر نتیجہ عماد

اس کی فوج میں جب کوئی مرجائے تو اس کا بیٹا باپ کی جگہ پر مستقل ہوجاتا ہے اور اگر اس کی بیوہ کے نان ونفقہ یا اس کی لڑکی کی شادی کا کوئی بندوبست نہ ہو تو بیگم ثمرو اپنے ذمہ لے لیتی ہے شاہ جہاں آباد میں ایک ایسا باغ لگایا ہے جو برسوں اس کی یادگار رہے گا کہتے ہیں کہ اس نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کو اس سے کوئی سروکار نہیں اس کا مقصد کامیاب زندگی بسر کرنا ہے مسلمانوں میں قرآن خواں ہے اور عیسائیوں میں انجیل داں، یہودیوں کے سامنے ان دونوں سے انکار اور گروہ ہنود میں سب سے بیزار ہے پارسیوں کے نزدیک آتش پرست ہے تو سکھوں کے سامنے گرنتھ ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی مجلس وعظ میں شرکت:۔ القصہ بیگم ثمرو یہاں سے اپنے ملک کو واپس ہوگئی اور لارڈ صاحب ہوڈل کو روانہ ہوئے، ان کی خاتون، سٹین صاحب اور ان کے ہمراہ آقا بھی شاہ جہاں آباد پہونچے پہلا مقام سرائے باڈلی میں ہوا۔ وہاں سے ہم مہابت خاں ریتی پہونچے۔ ان ایام میں آقا (ویلڈ صاحب) نعوذ گورنر جنرل کی بیگم کے ہمراہ شہر کی عمارتیں دیکھنے چلے جاتے اور بندہ بزرگان شہر کی زیارت اور مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کی مجلس وعظ میں جاتا۔ خدا ان کے علم و عمل کی پوری پوری جزا عطا فرمائے۔ میں نے منشی کاظم علی خاں کو اور ان کے ہمراہ اپنے ہموطن مولوی حیدر علی[۵] کو بھی دیکھا لیکن اس روز وہاں مجھے نہ کسی نے دیکھا اور نہ پوچھا کیونکہ سب لوگ منشی کے سامان اور شان و شوکت کے دیکھنے میں ہمہ تن مصروف تھے اور منشی کاظم علی خاں نے سو روپے سے زیادہ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کی نذر کئے تھے وہ عالی ہمت مرد تھا کہ پچاس روپے ماہوار علاوہ خوراک و پوشاک کے مولوی حیدر علی کو دیتا تھا اور غرباء و فقراء کی بھی روپئے سے امداد کرتا تھا اور اس کے یہاں مہمانداری کا سلسلہ بہت رہتا تھا اپنی اور ساتھیوں کی خوراک و پوشاک امیرانہ رکھتا تھا اور فرش و

---

[۵] مولوی حیدر علی کے حالات صفحہ ۲۶۹ درج ہیں پر ملاحظہ ہوں

ظروف بھی دولتمندانہ تھے بلا تبہ لوگ کہتے ہیں کہ قرض ایک پائی نہیں ہے۔ مولوی حیدر علی اسکے لڑکے کے استاد ہیں اور مولوی صاحب متقی، پرہیزگار، واعظ اور نکوکار ہیں اور مجھ جیسے آوارہ و تباہ روزگار نہیں ہیں جو ان کی پاکدامنی کو عیاں کر رہا ہوں۔ اس وقت میں سمجھ رہا تھا کہ منشی کاظم علی خاں ہزار روپیہ ماہوار رکھتا ہے مگر جب چوتھائی حصہ بھی نہیں معلوم ہوا تب مجھے یقین ہوا کہ اس کی حسن نیت کی برکت ہے کیونکہ بنکوں کی خرق عادات تمام مذاہب میں منقول ہیں۔

اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی اور گورنر جنرل لارڈ ماٹرا۔ لارڈ صاحب گورنر ماٹرا کے شاہجہاں آباد تشریف نہ لانے کا سبب لوگ یہ ظاہر کرتے تھے کہ صاحب ممدوح بادشاہ (اکبر شاہ ثانی) کی برابر کرسی پر بیٹھنا چاہتا ہے[1] اور بادشاہ نہیں چاہتا لیکن اس کے اخلاق بے تکلفانہ پر نظر رکھتے ہوئے جو میں اپنی آنکھوں سے کلکتہ میں اور اس سفر میں دیکھ رہا تھا مجھکو تعجب ہوا کیونکہ اگر وہ خود نمائی کا پابند ہوتا تو حسب دستور وکیل یا شاہزادوں کے ذریعہ (بادشاہ یا طبقاؤں) سے مراسلت جاری کرتا اور بارہ لاکھ روپیہ سالانہ جو صرف دنیا میں نیک نامی کے لئے ہیں اتنے آسان کام میں کیوں برباد کرتا۔ بالادست زبردست کے سامنے جتنی بھی عاجزی کرے گا اس کی بزرگی کی دلیل ہے اگر اکبر شاہ ثانی زور و زر اکبر اول کی طرح رکھتا تو سب لوگ ایسی آرزو کو اچھا سمجھتے اب تو یہ حال ہے کہ فیض محمد خاں بھرت پور بھی اس سے زیادہ طاقت ور ہے اگر نواب گورنر جنرل بہادر کہ ہندوستان کے تمام سرکش اس کے

---

[1] مؤلف (مولوی عبدالقادر) انگریزوں کے نہایت مداح ہیں۔ گورنر جنرل کے اس مطالبے کو کہ وہ اکبر شاہ ثانی کے برابر کرسی پر بیٹھے مولوی عبدالقادر اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں حالانکہ یہاں معاملہ سیاسی حقوق کا ہے اکبر شاہ ثانی کا خیال تھا۔ کہ گورنر جنرل شاہ انگلستان کا نائب ہے لہٰذا اس سے مساوی درجے پر ملاقات نہیں کی جا سکتی اس کو نذر پیش کرنی چاہیئے اور درباری آداب و رسوم کے مطابق دربار شاہی میں حاضر ہونا چاہیئے مگر گورنر جنرل یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ دہلی کمپنی کا وظیفہ خوار ہے لہٰذا اس کی فوقیت کا کیا سوال ہے اس لئے یہ ملاقات نہ ہو سکی بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ گورنر جنرل نے بادشاہ دہلی کے مقابلہ میں اودھ کے نواب وزیر غازی الدین حیدر کو بادشاہ بنا دیا اور اس طرح اکبر شاہ ثانی سے انتقام لیا ۱۸۱۹ء میں بڑی دھوم دھام سے غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کی تقریب ہوئی ناسخ نے اس واقعے کی یہ تاریخ کہی:۔ بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید غازی الدین حیدر کے وزیر معتمد الدولہ آغا میر ہوئے جن کا زمانۂ اقتدار تاریخ اودھ کا ایک نہایت "تاریک باب" ہے۔

قیصر التواریخ صفحہ ۲۴۳ - ۲۴۵، تاریخ اودھ جلد چہارم صفحہ ۱۳۹ - ۱۴۶

سامنے سرنگوں ہیں اگر اس سے بالاتر بیٹھیں تو ظاہر بینوں کی نظر میں شاہ کی عزت کم ہو جائے گی مگر لارڈ صاحب کا مرتبہ کیا بڑھے گا چونکہ اس خبر کی صداقت پر میرا گمان غالب نہیں اس لئے انگریز صاحبوں سے اس کے متعلق دریافت کرنے کو اپنی نادانی سمجھتا ہوں۔

نواب گورنر جنرل کی بیگم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں تشریف فرما ہوئیں۔ پھر نواب گورنر جنرل کے لشکر میں شامل ہو گئیں۔ میرا آقا چونکہ شہر میں کوئی بڑا صاحب نہ تھا اس لئے دار الحکومت میں رہا۔ عموماً بادشاہ (اکبر شاہ ثانی) کا قیام کبھی شہر میں رہتا اور کبھی شالیمار باغ میں۔

انگریزی حکام کی من مانی:۔ اس عرصے میں بہاری لال جو گارنر صاحب کے لشکر سے آیا تھا مجھ سے آکر ملا میں بہاری لال کا ذکر پیشتر آقا سے کر چکا تھا میں نے اطلاع کی فرمایا "بلالو"، میں لے گیا، دو تین روز اس کی لکھائی پڑھائی دیکھی اور پسند کی اس کے بعد گارنر صاحب بہادر کا خط آقا کے پاس اس (بہاری لال) کی شکایت کا پہونچا مجبوراً آقا (ویلڈر) نے اس کو رخصت کر دیا شکوہ بس اتنا تھا کہ سفر کوہستان میں اس شخص نے بیوفائی کر کے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا یہ خبر اگرچہ یقینی ہے مگر گارنر صاحب کی خوش طبعی اور نکو کاری سے کوسوں دور ہے کیوں کہ محرر کا یہ شکوہ کہ جنگ میں ساتھ نہ دیا بندے کی سمجھ میں نہیں آتا نیز یہ قصور ایسا بھی نہیں جس کی وجہ سے نوکری نہ مل سکے باوجود یکہ اس سے پیشتر ہمدانی خاں میواتی کی رشوت ستانی کی نالش پر کہ یہی اس کا ذریعہ آمدنی تھا بڑے صاحب نے موقوفی کا حکم دے دیا اور انتہائی خفگی کی بنا پر روبکار کی نقل بھی نہیں دی بلکہ چند روز کے بعد غلام حسین سررشتہ دار کے روبرو مسمی مذکور سے فرمایا کہ تمہاری موقوفی صدر سے بھی آگئی ہے اب بحالی کی اُمید نہ رکھو۔ پروردہ نواز صاحب (گارنر صاحب) نے اسکو گھر سے بُلا کر دورہ کی عدالت میں ملازم رکھ لیا سچ تو یہ ہے کہ اس ملک میں کوئی قانونی گرفت نہ ہونے سے صاحب لوگوں کی طبیعت کو پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا ہے اسی طرح سے منشی خلیل اللہ جو ملسٹن صاحب کا رفیق تھا اس کی سفارش سے آقا (ویلڈر صاحب) کے پاس آیا دو تین روز تک اس سے لکھنے پڑھنے کا کام لیکر لشکر میں بھیجدیا تاکہ وہاں سے کاغذات مرتب کر کے بھیجتا رہے۔

باب چہارم

دھلی:- اب اس شہر اور بزرگان شہر کے حالات سُناتا ہوں، ہندوؤں کی مستند کتب مثلاً مہا بھارت اور ترنگنی میں ہے کہ دہلی کی آبادی جدھشٹر کے زمانے سے پہلے کی ہے جس کو پانچ ہزار سال ہوتے ہیں اس وقت بھی یہ تخت گاہ تھی اور یہاں کے حاکم کو دیگر مقامات کے حاکموں سے ہمیشہ اعلیٰ سمجھا گیا ملک حکومت اگرچہ چنداں وسیع و فراخ نہ تھا کیونکہ متھرا میں اگر سین اور اس کے لڑکے کنس کا اقتدار تھا اور ہستنا پور میں پانڈو[1] کی حکومت تھی جس کے تین لڑکے جدھشٹر، ارجن اور بھیم اس کی رانی مسماۃ کنتی کے بطن سے تھے[2] اور کنپلا[3] میں جو فرخ آباد کے قریب ہے دروپد تھا جو اس دروپدی کا باپ تھا جو کچھ دنوں جدھشٹر وغیرہ پانچوں[4] بھائیوں کی بیوی رہ چکی تب زمانہ کی گردش سے حکومت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں چلی گئی اور پرتھی راج تنور جس کی یادگار وہ مضبوط ستون ہے جس کو کیلی[5] کہتے ہیں وہ بیلدیو چوہان کے ہاتھ سے مارا گیا جس کے نام کا اجمیر

---

[1] اس علاقے کے راجا کا نام چتر دیریہ تھا اس کے دو بیٹے دھرتراشٹر اور پانڈو تھے دھرتراشٹر پیدائشی اندھے تھے ان کے ایک سو ایک بیٹے تھے جن میں سے سب سے بڑا دریودھن تھا پانڈو کے پانچ لڑکے تھے جدھشٹر، ارجن، بھیم، نکل اور سہدیو تھے ان کے مفصل واقعات مہابھارت میں موجود ہیں۔ واقعات دار الحکومت دہلی (جلد اول) از مولوی بشیر الدین دہلوی شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء) ص ۴، ۱۸

[2] دوسری بیوی کے بطن سے نکل اور سہدیو تھے، واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول ص ۱۸

[3] کنپلا ایک قدیم بستی اور ضلع فرخ آباد کے ایک پرگنہ کا صدر مقام ہے وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کپل منی نے یہاں تپشیا کی تھی ان کے نام سے یہ آبادی مشہور ہوگئی۔ (تاریخ ضلع فرخ آباد از پنڈت دیبی پرشاد مطبوعہ گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۸۵۹ء)

[4] جدھشٹر، ارجن، بھیم، نکل اور سہدیو جن کا حوالہ نوٹ ۱ میں موجود ہے۔

[5] کیلی کے لئے ملاحظہ ہو: آثار الصنادید از سید احمد خاں باب اول مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۶ء ص ۵۹-۶۱۔ یادگار دہلی از سید احمد ولی اللٰہی ص ۲۲۵

میں بیلا تالاب مشہور ہے اس کے بعد چوہانوں کی حکومت ہوگئی۔ یہاں تک کہ راجا سمیر کی نوبت آئی اس کا لڑکا پرتھی راج چوہان (رائے پتھورا) ہوا ہے جو نہر رائے پرہار مارواڑ کے راجا کو زیر کر کے اس کی لڑکی کو پکڑ لیا اور اس سے تعلق کر لیا اور قندھار پر بھی یورش کی اس وقت بھولا بھیم سولنکی حاکم گجرات نے دہلی پر چڑھائی کر کے راجہ سمیر کو قتل کیا پرتھی راج اس کا تعاقب کرتا ہوا وہیں پہونچا اور اس کو اس کی بداعمالی کی سزا دی، سات مرتبہ معزالدین سام کو شکست دی، قید کر لیا اور پھر چھوڑ دیا ہے چند راٹھور حاکم قنوج کی لڑکی سنجوگتا پکڑ لی اور خوب جنگ کی بالآخر معزالدین سام کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا اور مارا گیا اس کے بادخواں چند نامی نے راسا نام کی ایک کتاب میں اس کی رزم و بزم کے حالات لکھے ہیں[1]۔ اس وقت سے دہلی کے تخت کو مسلمانوں نے رونق دے رکھی ہے۔

معزالدین سام خود تو اپنے ملک کو چلا گیا[2] اور اپنے غلام قطب الدین ایبک کو یہاں چھوڑ گیا

---

[1] پرتھی راج اور معزالدین سام کے سلسلے میں مؤلف نے راسا کا حوالہ دیا ہے مشہور ہے کہ پرتھی راج راسا پرتھی راج کے بھاٹ چند کی لکھی ہوئی ہے اسی لئے اس کتاب کو تاریخی ماخذ سمجھا گیا مگر اب تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب جعلی ہے اس سلسلے میں پروفیسر محمود خاں شیرانی مرحوم نے ایک مفصل و مدلل تنقید و تبصرہ سپرد قلم فرمایا ہے، اور داخلی و خارجی دلائل و شواہد سے ثابت کیا کہ یہ کتاب پرتھی راج کے زمانے کی نہیں ہے بلکہ بہت بعد میں لکھی گئی ہے اور تاریخی اعتبار سے اس کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی کا یہ تحقیقی و تنقیدی مقالہ "پرتھی راج راسا" (مطالب و تنقید و تبصرہ) کے عنوان سے ۱۹۲۰ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے شائع ہو چکا ہے حقیقت یہ ہے کہ نہ کبھی پرتھی راج نے قندھار پر یورش کی اور نہ سات مرتبہ معزالدین سام کو شکست دی یہ سب افسانوی خیال آرائیاں ہیں واقعہ یہ ہے کہ سلطان معزالدین سام کی زندگی میں ہندوستان کا دروازہ ۵۷۱ھ میں کھلتا ہے وہ ملاحدہ سے ملتان لیتا ہے ۵۷۵ھ/۱۱۷۹ء میں پشاور پر قبضہ کرتا ہے ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں لاہور فتح کرتا ہے۔ ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء میں پرتھی راج کے مقابلے میں ناکام ہوتا ہے اور ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں ترائن کے میدان میں پرتھی راج سے مقابلہ کرتا ہے پرتھی راج مارا جاتا ہے سلطان معزالدین سام فتح پاتا ہے۔ (۱) پرتھی راج راسا از پروفیسر محمود خاں شیرانی مطبوعہ مفید عام پریس لاہور ۱۹۴۲ء

(۲) تاریخ ہندی قرون وسطیٰ جلد دوم انصاری محمد بشیرالدین پنڈت ۱۹۵۳ء مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ ۱۹۴۹ء) ص ۱۹۹-۲۰۴

(۳) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد اول از سید ہاشمی فرید آبادی مطبوعہ ادبی پریس کراچی ۱۹۵۳ء ص ۱۴۵-۱۵۰

[2] آخری مرتبہ ۲۰ اکتوبر ۱۲۰۵ء میں معزالدین سام کھوکروں کی تادیب کے لئے پشاور پہونچا اور آگے بڑھ کر جہلم اور چناب کے درمیان کھوکر قوم کو مطیع بنایا ۲۵ فروری ۱۲۰۶ء کو لاہور میں داخل ہوا یہاں پہونچ کر اس نے اپنے فوجی سپاہیوں (باقی صفحہ ۲۰۲ پر)

ایبک چھ انگلی والے کو کہتے ہیں اس کے بعد اس کا غلام شمس الدین التتمش قائم مقام ہوا جس کا صدقہ جاریہ حوض شمسی اور خواجہ قطب الدین کاکی کے مزار کے قریب بلند منارہ (قطب مینار) اس کے نام کو بلند کر رہا ہے التتمش سورج گرہن کو کہتے ہیں گرہن کے وقت اس کی پیدائش ہوئی تھی اسی لئے اس کو التتمش کہتے ہیں وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا سچا مرید تھا اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی خواجہ معین الدین چشتی کے مرید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱ سے آگے) کو گھر جانے کی اجازت دیدی اور خود بھی وطن کی طرف مراجعت فرمایا ہوا ۳ شعبان ۶۰۲ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۲۰۶ء کو جب سلطان لاہور سے دمیک میں پہونچا تو ملاحدہ نے سلطان کو شہید کر دیا صاحب طبقات ناصری نے اس کی تاریخ شہادت یہ تحریر کی ہے :-

شہادت ملک بحر و بر معز الدین　　کز ابتدائے جہاں شہ چو او نیامد یک
سوم ز غرہ شعبان بسال ششصد و دو　　فتاد در رہ غزنین بمنزل دمیک

سلطان معز الدین سام کا مقتل ایک روایت کے مطابق موضع دھمک (دمیک) ضلع جہلم میں بیان کیا جاتا ہے دھمک کے بالکل قریب ایک راستہ "غوروں کی پھڑ" کے نام سے مشہور ہے۔ تاریخ ہندی قرون وسطیٰ صفحہ ۲۰۶، ۲۰۷ - نیز ملاحظہ ہو عہد اسلامی کا ہندوستان از ریاست علی ندوی (ادارۃ المصنفین پٹنہ ۱۹۵۰ء) ص ۱۲۲ - ۱۲۹)

۱؎ ایبک ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "چاند کا سردار" ہے ترکوں کے ایک قبیلہ کا نام بھی، ایبک تھا مرزا غالب بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں :-

ایبکم از جماعۂ اتراک　　در تمامی ز ماہ دہ چندیم

قطب الدین ایبک کا عہد حکومت ۱۲۰۶ء سے ۱۲۱۰ء تک رہا۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات از خلیق احمد نظامی صفحہ ۸۳ مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی ۱۹۵۸ء ص ۴۲۔ یادگار غالب از مولوی الطاف حسین حالی مطبوعہ عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۳۰ء ص ۱۲

۲؎ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہندوستان کے اولیائے کبار اور حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے اجل خلفاء میں سے ہیں حضرت خواجہ اجمیری نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں خوب کام کیا ہے حضرت خواجہ اجمیری کا وصال رجب ۶۳۳ھ/۱۲۳۶ء میں ہوا تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو (۱) خزینۃ الاصفیا از مفتی غلام سرور لاہوری جلد اول لکھنؤ ۱۹۱۴ء ص ۲۵۶ - ۲۶۷، (۲) سفینۃ الاولیاء از شہزادہ دارالشکوہ (اردو ترجمہ محمد علی لطفی مطبوعہ نفیس اکیڈیمی کراچی ۱۹۵۹ء ص ۱۲۸، ۱۲۹ (۳) بزم صوفیہ از صباح الدین عبدالرحمن اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء ص ۳۵، ۲۰، ۴۲ (۴) سیر الاولیاء (از محمد مبارک العلوی مطبع محب ہند دہلی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء (۵) سیرۃ العارفین صفحہ ۴، ۱۰ (۶) اخبار الاخیار فی اسرار الابرار صفحہ ۲۲ - ۲۹ (۷) مونس الارواح از جہاں آرا بیگم ص ۱۲ -، قلمی مملوکہ محمد ایوب قادری) نیز ملاحظہ ہو سوانح عمری خواجہ معین الدین اجمیری از وحید احمد مسعود (کراچی ۱۹۶۱ء)

ہیں۔ اور ان کے نامور مرید شیخ فرید گنج شکر اجودھنی ہیں جن کا مزار پٹن (پنجاب) میں ہے[1] ان کے مرید نظام الدین بدایونی ہیں جو نظام الدین اولیاء کے نام سے مشہور ہیں۔ دہلی میں ان کا مزار لوگوں کی زیارت گاہ ہے ان کے مرید امیر خسرو دہلوی ہیں جو سلطان الشعراء ہیں[2] ان کا مزار پیر کے قدموں میں ہے دوسرے مشہور مرید و خلیفہ نصیر الدین چراغ دہلوی ہیں ان کی خواب گاہ اس وقت ویرانہ میں ہے[3] چشتی نظامی سلسلہ ان ہی سے جاری ہے۔

---

[1] حضرت شیخ فرید الدین مسعود عام طور سے بابا فرید گنج شکر کے لقب سے مشہور ہیں ولادت باسعادت ۵۶۹ھ / ۱۱۷۵ء میں قصبہ کھوتوال (ضلع ملتان) میں ہوئی والد کا نام شیخ جمال الدین تھا سلسلۂ نسب خلیفہ دوم سیدنا عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے قصبے میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لئے ملتان گئے ملتان میں حضرت خواجہ قطب الدین کاکی سے بیعت کی۔ حضرت شیخ فرید الدین نے مختلف دیار و امصار میں علمائے کرام سے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل و تکمیل کی۔ ایک مدت تک سیاحت فرمائی پھر خواجہ کاکی کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے مرشد نے خلافت سے ممتاز فرمایا مغربی پاکستان میں ان کے ذریعے اسلام کی خوب اشاعت ہوئی پاک پٹن کے اطراف کی بہت سی ہندو قومیں مسلمان ہوئیں ۶۶۴ھ / ۱۲۶۵ء میں وصال ہوا ان کے مشہور خلفاء میں شیخ نظام الدین اولیاء بدایونی (دہلی) شیخ علاء الدین احمد صابر (کلیر) شیخ جمال الدین قطب (ہانسی) بہت مشہور ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ (۱) بزم صوفیہ ص ۱۴۲ - ۱۵۴ (۲) سیر العارفین صفحہ ۳۱ - ۵۹ (۳) خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۲۸۷

(۴) سیر الاولیاء ص ۵۷ - ۹۱ (۵) اسرار الاولیا از بدر اسحاق (مطبع نولکشور کانپور ۱۹۱۰ء) (۶) اخبار الاخیار ص ۵۲ - ۵۴

(۷) جواہر فریدی از محمد علی اصغر چشتی (اردو ترجمہ اللہ والے کی قومی دوکان لاہور)

(۸) مونس الارواح صفحہ ۹۳ - ۱۰۰ (۹) آب کوثر صفحہ ۲۳۲ - ۲۵۵

(۱۰) سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر از وحید احمد مسعود (پاک اکیڈیمی کراچی ۱۹۶۵ء)

[2] حضرت امیر خسرو کے والد سیف الدین سرداران لاچین سے تھے امیر خسرو ۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء میں قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ (یو، پی) میں پیدا ہوئے مروجہ علوم و فنون نہایت توجہ سے حاصل کئے شاعری کی طرف شروع ہی سے میلان تھا چنانچہ فن شاعری میں کمال حاصل کیا۔ امیر خسرو شہزادہ محمد شہید اور دوسرے سلاطین کے دربار سے وابستہ رہے امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیاء کے ممتاز خلفاء میں سے تھے ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء میں فوت ہوئے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں دفن ہوئے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔ (۱) سوانح حیات امیر خسرو از پروفیسر محمد حبیب مترجم حیات اللہ انصاری (ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۱۹۳۹ء) (۲) حیات امیر خسرو از خان بہادر نقی محمد خاں (کراچی ۱۹۵۷ء) (۳) شعر العجم حصہ دوم از مولانا محمد شبلی نعمانی اعظم گڈھ ۱۹۶۲ء ص ۹۲ - ۱۰۵ ، (۴) سیر الاولیا صفحہ ۳۰۱ - ۳۰۵

[3] نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کے والد شیخ محمود یحیٰی لاہور میں پیدا ہوئے اور پھر اودھ میں منتقل ہو گئے (باقی صفحہ ۲۰۴ پر)

شاہ عالم بادشاہ تک جس نے ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء بروز سہ شنبہ آخر شب میں ۴۸ سال ۴ ماہ ۷ یوم سلطنت کرکے اس خاکدان کو چھوڑا اور خواجہ قطب الدین کاکی کے جوار میں ابدی آرام گاہ اختیار کی (۵۹) بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے۔

جد ہشتم کے زمانے سے شاہ عالم کی وفات تک ہر ایک بادشاہ کی مدت حکومت اور ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں سلطنت کے منتقل ہونے کے حالات کو میں نے ایک ہشت ورقی رسالے میں لکھدیا ہے شاید میرے ساتھ ہو یا گھر چھوڑ آیا ہوں اسی طرح اور بھی بہت سے دفتر سیاہ کئے ہیں اور کر رہا ہوں۔

تالیفات مولوی عبدالقادر مؤلف کتاب ہذا :

(۱) رسالہ ہشت ورقی[۱]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۴ سے آگے) شیخ محمود یحییٰ پشمینے کے تاجر تھے نصیرالدین محمود کی پیدائش اودھ میں ہوئی والدہ نے نہایت اہتمام سے تعلیم و تربیت فرمائی ۴۳ سال کی عمر میں حضرت نظام الدین اولیاء بدایونی کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ حضرت چراغ دہلوی کے تعلقات سلطان محمد تغلق کے ساتھ خوشگوار نہیں رہے۔ ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ میں رحلت فرمائی۔ حضرت کے ملفوظات کا مجموعہ خیرالمجالس بہت مشہور ہے جس کو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ابھی حال میں بڑی محنت سے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔

(۱) بزم صوفیہ صفحہ ۳۰۹ - ۳۴۹

(۲) خیرالمجالس مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی (علی گڑھ ۱۹۵۹ء)

(۳) سیرالعارفین صفحہ ۹۱ - ۹۷

(۴) اخبارالاخیار صفحہ ۸۰ - ۸۶

(۵) تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عفیف کلکتہ ۱۸۹۱ء

(۶) سیرالاولیاء صفحہ ۲۳۶ - ۲۴۷

(۷) مونس الارواح صفحہ ۱۱۰ - ۱۱۹

(۸) سوانح عمری شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلوی (مطبوعہ دہلی)

(ISLAMIC CULTURE HYDERABAD DECCAN, APRIL, 1946

[۱] مؤلف نے جس رسالہ کا سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔

(۲) تعلیقات بر جامع البرکات شیخ عبدالحق دہلوی
(۳) شرح حکم مرتضوی در منافع امر و نہی مصطفوی
(۴) سہو اقلام علماء اعلام
(۵) ترجمہ رسالہ حسن العقیدہ شاہ ولی اللہ دہلوی [1]
(۶) شرح رسالہ عقائد شاہ عبدالعزیز دہلوی
(۷) رسوم اسماء معبودانِ ہنود
(۸) شرح میزان البلاغت شاہ عبدالعزیز دہلوی
(۹) تعلیقات بر شمائل ترمذی
(۱۰) کشف حقیقتِ دعا و اجابت
(۱۱) رسالہ قبلہ نما۔ اس رسالہ سے صحیح مذہبی راستہ معلوم ہوسکتا ہے
(۱۲) رسالہ عروض۔ مختصر و مفید۔
(۱۳) قواعد زبانِ اُردو۔ جو ڈیلدر صاحب کے پاس رہ گئی۔
(۱۴) حکایات بزبانِ اُردو۔ اس کتاب میں ۶۰ حکایتیں ہیں جن میں بازاری، تاجر، مزدور، فوجی، علماء، مشائخ اور دفتری لوگ غرض کہ ہر طبقے کے محاورات کہانیوں کے انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی ڈیلدر صاحب کے پاس ہے۔
(۱۵) امثال ہندی و فارسی۔ دونوں زبانوں کی وہ مشہور امثال جن کا مطلب ایک ہو۔
(۱۶) تاریخ احوال اجمیر و مارواڑ۔ اس کی نقل ڈیلدر صاحب نے سر جان مالکم صاحب کے پاس بھیجدی اس کے مسودے پڑے ہوں گے۔
(۱۷) رسالہ شطرنج۔ یہ وہ رسالہ ہے جس کے مطالعے سے شطرنج باز کو تہذیب و اخلاق، منطق و حکمت، طبعی و الٰہی کلام، طب، ہندسہ، فقہ اور اصول وغیرہ علوم کا شوق پیدا ہوسکتا ہے

---

[1] حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے رسالہ الحسن العقیدہ کا اُردو ترجمہ متعدد بار شائع ہوچکا ہے۔ ہمارے پیش نظر حسن العقیدہ کا مطبع احمدی دہلی کا مطبوعہ نسخہ ہے۔

ہے کیونکہ میں نے اس میں ہر فن کے نمونے کھیل کی شکل میں بیان کئے ہیں۔

(۱۸) رسالہ آداب نکاح۔ اِس رسالہ میں نکاح سے متعلق احکام شرعیہ کے اسرار عقلی طور پر ظاہر کئے ہیں۔

(۱۹) رسالہ فوائد صوم۔ نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے

(۲۰) برہان۔ جس میں رمل، نجوم، جفر، شانہ بینی، سر دوا، فال، قرعہ، استخارہ وغیرہ کا بطلان نیک بختی و بدبختی کے متعلق عقلی و نقلی دلائل، تسخیر اور ٹونا کا باطل ہونا اور جادو کی حقیقت صاف صاف بیان کر دی ہے۔

(۲۱) رسالہ امکان خرق عادات۔ عقلی طور پر اس کی حقیقت کی تشریح کر دی گئی ہے۔

(۲۲) تربیت و تعلیم علوم و تربیت اطفال۔

(۲۳) طریق انتظام ملک۔

(۲۴) رسالہ طرز تحریر۔ جس میں احکام، اخبار، عرضیاں، ترجمہ، علمی مطالب، معاملات شوقیہ، تعزیت، تہنیت، سفارش کے لکھنے کا فرق اور رزیڈنسی اور ایجنسی کی تحریر کی وضع بیان کی گئی ہے نیز میں نے وہ طریقہ بھی لکھدیا ہے جس سے طویل مطلب کو مختصر اور مختصر کو ایسا طویل کرنا کہ گراں نہ گزرے، معلوم ہو جائے۔

میرے بعد جس کے بھی ہاتھ یہ رسائل لگیں اگر اپنے ہی نام سے شائع کر دے تب بھی ہم خوش ہیں اور اگر کسی نالائق کے ہاتھ پڑ گئے تو دوا فروشوں کے حوالے کر دے گا۔[1]

---

[1] افسوس کہ مؤلف کی جملہ تصنیفات کے وجود کا اب تک کہیں علم نہیں ہے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نواب صدیار جنگ بہادر (مرحوم) کی معارف پروری کی بدولت کتاب ہذا "وقائع عبدالقادر خانی" دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گئی تذکرہ کاملانِ رامپور کے مؤلف حافظ احمد علی خاں شوق نے اس فہرست کتب میں "پند نامہ فارسی" کا اور اضافہ کیا ہے شوق صاحب لکھتے ہیں:-

"آپ (مولوی عبدالقادر) کی تصنیفات میں سے ایک پند نامہ فارسی کا پتہ چلا ہے اور ایک روزنامچہ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا جناب محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس حبیب گنج کے پاس ہے روزنامچہ کی نقل راقم نے منگا کر داخل کتب ریاست (رامپور) کر دی ہے پند نامہ فارسی کے اشعار یہ ہیں:- شکم سیر کن باد نانِ جوین ۞ بپے پوشش تن گلیمے گزین
بہ گرما درسایہ زیر درخت ۞ بسر کن کہ نے مایہ داری نہ رخت

(باقی صفحہ ۲۰۷ پر)

قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں :۔ اس شہر (دہلی) میں شاہجہاں بادشاہ کا بنوایا ہوا قلعہ[1] ہے جس کا دروازہ ہی بتارہا ہے کہ یہ بادشاہوں کے رہنے کی جگہ ہے اس کے اندر دیوان عام ہے دیوانِ خاص ہے شاہ برج ہے، ساون بھادوں ہے ہر ایک میں دلبران پری وش کی سی دل کشی ہے۔ رعب جمشیدی ہے محاورات وہاں کے جداگانہ ہیں روپیہ بھی علیحدہ ہے۔

بادشاہ کسی کے سر پر ہاتھ نہیں رکھتا اور حسب مراتب علماء و زہاد کے علاوہ کوئی بیٹھ نہیں سکتا مگر خدام کو خدمت کی غرض سے اجازت ہے

اصطلاحات قلعہ :۔ شاہی حجام کو خاص تراش، خدمت گار کو خواص، ناظم آداب دربار کو نواب ناظر، مہتمم جریب کو مردہہ، چابک سوار کو ملک پیڑا، فیلبان کو فوجدار، قلیان کو بھنڈہ، نیند کو سکھ۔ غلاموں کو قلار، کھانے کو خاصہ، وہ خوان جو کسی کو عطا ہوا ولش، مستعمل کپڑا کو ملبوس خاص، فرزندانِ شاہ کو صاحب عالم، جانشین شاہ کو ولیعہد، خاتون کو نواب صاحبہ محل، اور دوسری بیگمات کے لئے لفظ نواب مخصوص ہے، بادشاہ کی ماں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶ سے آگے) چہ حاصل زر و سیم داری بگنج چو باشی زبے آبروئے بہ رنج

اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے غمگین تخلص تھا اردو کلام کا نمونہ انتخاب یادگار اور گلستانِ سخن قادر بخش صابر میں ہے کہتے ہیں بھاکا اور مرہٹی میں نظم لکھتے تھے۔" (تذکرہ کاملانِ رامپور صفحہ ۲۳۵)

[1] قلعہ معلیٰ کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔

(۱) رہنمائے قلعہ دہلی مرتبہ ظفر حسن اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۲۳ء

(۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم مطبوعہ شمسی مشین پریس آگرہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۱-۹۰

(۳) آثار الصنادید باب دوم صفحہ ۲ - ۲۴

(۴) یادگار دہلی صفحہ ۵۶ - ۷۰

(5) DELHI Its MONUMENTS AND HISTORY By T. G. P. SPIAR (BOMBAY 1945) P 1-5

(6) LIST OF MOHAMMADAN AND HINDU MONUMENTS (CULCTTA 1916) Vol I, P 1-28 -

نواب قدسیہ، اور بادشاہ کے بھائی شہزادے کہلاتے ہیں، تیمور کی اور اولاد نیز دوسرے رشتہ دار سلاطین کہلاتے ہیں، رنڈیوں کو ارباب نشاط، نقال کو دعاگو، بادشاہ کو زندہ کرامات کہتے ہیں، قلعہ و تخت کے ساتھ سب لوگ لفظ "مبارک" ملاتے ہیں اور لفظ بادشاہ کی بجائے غیبت و حضور میں لفظ "جہاں پناہ"۔ اور "حضور والا" بولتے ہیں بادشاہ کی بات کو "ارشاد" کہتے ہیں جب کوئی خواص خوان یا تحفہ بادشاہ کے حضور سے لاوے تو لوگ کھڑے ہو کر اور سر پر ہاتھ رکھ کر شاہی آداب بجا لاتے ہیں اور اس کو انعام دیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ آداب و کورنش پہونچا دینا۔ اسی طرح اگر دریافت حال کے لئے آئے تو بھی اسی انداز سے شاہی آداب بجا لاتے ہیں۔ اگر فرمان یا عرضی خاص بادشاہ کے دستخط سے مزین جو پنسل سے ہوتے تھے لاوے تو اس کو لانے والے کے ہاتھ سے کھڑے ہو کر لیتے ہیں پھر سر اور آنکھوں سے لگا کر کھولتے ہیں اور اگر کوئی عرضی بادشاہ کے حضور میں بھیجیں تو سادہ کاغذ پر لکھتے ہیں اور لفافہ پر سوائے لفظ عرضی کے کچھ نہیں ہوتا اور بادشاہ عرضی کی پیشانی پر صرف دستخط کر دیتا ہے دوسرے لوگ عرضیوں کی پشت پر حکم لکھدیتے ہیں اور قلعہ مبارک میں بادشاہی دفتر میں عدالتی مہر کے لئے کاغذ نہیں بھیجتے بلکہ بندگان شاہی اپنی دستی مہریں لگا دیتے ہیں جو پروانہ اور روبکار نہیں ہوتا بلکہ خط ہوتا ہے۔

حضور شاہی میں شرف ملازمت کے آداب: جب کبھی بادشاہ کی ملاقات کے لئے جاتے ہیں تو اس مقام سے جہاں ایک سرخ رنگ کا پردہ ہے اور جس کو لال پردہ کہتے ہیں پا پیادہ جاتے ہیں حتی کہ چھڑی بھی نہیں لے جا سکتے مقام تسلیم میں پہونچکر جھکتے ہیں اور سر پر ہاتھ رکھتے ہیں چوبدار اس مجرائی کا نام اسی امتیاز سے لیتا ہے جس کی بادشاہ کے حضور سے اجازت حاصل ہو سکتی ہے اور کہتا ہے "جہاں پناہ! مہابلی سلامت" اس کے بعد آگے بڑھ کر جیسا مرتبہ ہو روپیہ یا اشرفی آستین یا رومال پر رکھ کر نذر پیش کرتے ہیں پھر اس کے علاوہ کچھ سونا چاندی بادشاہ کے سر پر بطور تصدق گھما کر نثاری داروغہ کو دے دیتے ہیں۔ قبولیت نذر کے بعد پیچھے ہٹ کر آداب بجالاتے ہیں پھر حسب اشارہ علیحدہ جگہ پر چلے جاتے ہیں وہاں پر خلعت پہنتے ہیں جس کے بہت سے مراتب یعنی تین، پانچ، سات، گیارہ، اور اکیس کپڑے ہیں۔ خلعت پہن کر پھر بادشاہ کے حضور میں آتے ہیں اس وقت خلعت کی نذر پیش کرکے آداب بجالاتے ہیں اور کچھ دیر کھڑے ہو کر رخصت ہو جاتے ہیں پھر ولیعہد کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں وہاں کلی مثل دستور حضور بادشاہ عمل میں لاتے ہیں وہاں سے اسی لباس میں اپنے گھر تک آتے ہیں۔ شاہی خدام

کو حسب معمول خلعت اور انعام دیتے ہیں اور دستور ہے کہ اگر گھوڑا مرحمت ہو تو زین پوش کاندھے پر رکھتے ہیں اور اگر ہاتھی ہو تو انکس ہاتھ میں دیتے ہیں اور اگر نالکی پالکی ہو تو اس کا پایہ ہاتھ میں پکڑا جاتا ہے۔

نذر کی اشرفی یا روپے پر شاہ متوفی کا سکّہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ اُسی بادشاہ کا سکہ ہوتا ہے اور گفتگو میں بادشاہ کی ملاقات کو "ملازمت" کہتے ہیں اور بادشاہ کے سامنے کسی کے نام کے ساتھ لفظ "صاحب" نہیں کہتے بلکہ بہادر، خان یا جو خطاب حضور سے ملا ہو اس کے زبان پر لانے میں مضائقہ نہیں ہے اور لفظ "مسٹر" اگرچہ صاحب کے معنی میں ہے مگر بادشاہ اس سے واقف نہیں اس لئے اپنے قلم سے بھی انگریز صاحبوں کو لکھتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کا کہنا جائز ہے چند آدمیوں کے نام ہرگز وہاں نہیں لئے جاتے غازی الدین خاں عماد الملک جس کی قبر کالپی میں ہے اور اس نے شاہ عالم ثانی کے باپ کو قتل کیا ہے اس کو نمک حرام اول کہتے ہیں [1]

دوسرے غلام قادر خاں خلف نواب ضابطہ خاں خلف نواب نجیب الدولہ، اس کو نمک حرام دوم کہتے ہیں [2] تیسرے والیِ اودھ نواب آصف الدولہ [3]

---

[1] عماد الملک نے احمد شاہ بادشاہ دہلی کو معزول کرکے قید کیا اور اس کے بعد بادشاہ اور اس کی والدہ کو بصارت سے محروم کر دیا عماد الملک کو ہمیشہ اس بات کا اندیشہ رہتا تھا کہ اگر احمد شاہ ابدالی آگیا تو نجیب الدولہ کا مرتبہ بڑھ جائے گا اور مجھے میری بدکاریوں کی سزا ملے گی چنانچہ اس نے خیال کیا کہ عالمگیر ثانی کو ختم کر دینا چاہیئے تاکہ یہ اندیشہ ہی نہ رہے بادشاہ عالمگیر ثانی فقراء اور درویشوں کا نہایت معتقد تھا عماد الملک نے مہدی علی خاں کشمیری کو سکھا پڑھا کر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ فیروز شاہ کے کوٹلے میں ایک درویش ٹھیرے ہیں جو زیارت کے لائق ہیں۔ بادشاہ اس کشمیری کے فریب میں آگیا اور فقیر باکرامت کی زیارت کو روانہ ہو گیا۔ بادشاہ جیسے ہی فیروز شاہ کے کوٹلے پہونچا۔ تلوار اس سے لے لی گئی اور دو تین ازبکوں نے بادشاہ کا کام تمام کر دیا اور بادشاہ کے جسم بے سر کو جمنا کے ریت میں پھینک دیا۔ یہ واقعہ ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء کا ہے کئی روز کے بعد بادشاہ کی لاش ہمایوں کے مقبرے میں دفن ہوئی چونکہ عماد الملک نے بادشاہ عالمگیر ثانی کو قتل کرا دیا اس لئے اس کو نمک حرام اول کہتے ہیں۔ (۱) تاریخ ہندوستان از ذکاء اللہ جلد نہم صفحہ ۲۹۳-۲۹۷ ۳۰۱-۳۰۲ (۲) مجمع الاخبار از ہرسکھ رائے ولد جیون داس کھتری (قلمی مخزونہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی لائبریری) ورق ۴۵۸

[2] غلام قادر خاں نے شاہ عالم ثانی کو بینائی سے محروم کر دیا تھا۔

[3] والیِ اودھ نواب آصف الدولہ نے شاہان دہلی کے حضور میں کوئی گستاخی نہیں کی بلکہ شاہ عالم ثانی کے دربار (باقی صفحہ ۲۱۰ سے).

بادشاہ کی سواری کے وقت پیادہ اور اسپ سوار اسی حالت میں آداب بجالاتا ہے البتہ گاڑی اور پالکی سوار نیچے اُتر کر آداب بجالاتا ہے۔ ہاتھی سوار یا نیچے اُترے یا ہاتھی بٹھلائے اور خود کھڑا ہو جائے۔ بادشاہ اگر تخت ہوادار پر سوار ہو تو ہندوستانی اُمرا ہوں یا صاحبان انگریز سب پیدل دوڑتے ہیں البتہ ہاتھی کی سواری کے وقت خود کو پیچھے رکھتے ہیں لیکن سر پر چھتری نہیں رکھتے ان آداب میں شاہزادے بھی دوسروں کے برابر ہیں۔

روایات ولوازمات شاہانہ: خواصی میں خادم بادشاہ پر چھتری لگائے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے اگر وہ پانی طلب کرے تو فوجدار (یعنی فیلبان) اپنے ہاتھ سے پیش کرتا ہے۔ خاصے کے پانی کو آبحیات کہتے ہیں، قلعے کے محاورات میں سے یہ بھی ہے کہ جب بادشاہ قضاء حاجت انسانی کے لئے جائے تو کہتے ہیں کہ صحت خانہ میں تشریف فرما ہیں اور جس جگہ علماء و زہاد سے ملاقات ہوتی ہے اس کو تسبیح خانہ کہتے ہیں اور جب یہ کہنا ہو کہ فلاں بادشاہ کو قید کر دیا تو یوں کہیں گے کہ داخل سلاطین کر دیا اور بادشاہوں کے جیل خانے کو عبادت خانہ کہتے ہیں۔

تمام اولادِ تیموری کی علامت یہ ہے کہ جب قلعے سے باہر جائیں گے تو ایک خواص کے ہاتھ میں مکھی اُڑانے کے لئے طاؤسی پنکھا ہوتا ہے اور قلعہ مبارک سے شاہی سواری برآمد ہوتے وقت اکیس توپیں چلتی ہیں اور جب شہر کے دروازے سے گزریں گے تو اتنی ہی انگریزی توپیں چلیں گی اور قلعے کا صدر دروازہ بادشاہ کی واپسی تک بند ہو جاتا ہے اس کے بجائے دوسرا کھل جاتا ہے اور ولیعہد قلعہ مبارک میں رہتے ہیں۔ عیدین اور جشن سالگرہ پر پہلے ولیعہد نذر پیش کرتا ہے اس کے بعد شاہزادہ پھر رزیڈنٹ اور جو کچھ وہاں عنایت ہو دامن یا رومال میں لیتے ہیں اور آداب بجالاتے ہیں اور جو کچھ بادشاہ کے صرفِ خاص کے لئے شہر کے باہر سے آتا ہے اس پر محصول نہیں لیا جاتا اور پرگنہ کوٹ قاسم جو بادشاہ سے متعلق ہے اس میں سرکار انگریزی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۹ سے آگے) سے آصف الدولہ کی درخواست پر ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں اس کو خلعت وزارت مع جواہر، قلمدان طلائی مرصع اور فیل واسپ ملا اور نواب آصف الدولہ نے دو لاکھ روپے نقد، دس گھوڑے اور کئی ہاتھی جن پر سونے اور چاندی کی مطلا عماریاں تھیں یورپ کی بہت سی عمدہ چیزیں اور ہر قسم کے تحف و ہدایا اور اسباب و سامان مع چتر اور تخت رواں کے مرزا خلیل اللہ نیاز علی خاں کی معرفت بادشاہ کے حضور میں بھیجے (تاریخ اودھ جلد سوم صفحہ ۸۹-۹۱)

البتہ غازی الدین حیدر نواب وزیر کی بجائے بادشاہ دہلی کے مقابلے پر بادشاہ بن بیٹھا یہ ایک صریح گستاخی تھی ممکن ہے کہ مولوی عبدالقادر سے سہو ہوا ہو اور غازی الدین حیدر کی بجائے آصف الدولہ کا نام لکھ دیا ہو۔

احکام جاری نہیں ہوئے

صفر کے آخری چہار شنبہ کو بادشاہ کی جانب سے طلائی انگوٹھی اور چھلے تقسیم ہوتے ہیں اور بقر عید پر عیدگاہ میں اونٹ، گائے اور بکریوں کی قربانی ہوتی ہے۔ ایک ایک جانور بادشاہ خود اپنے ہاتھ سے نحر و ذبح کرتا ہے باقی دوسرے لوگ ذبح کرتے ہیں اور وہیں کباب بھونے جاتے ہیں اور ہر شخص کو دیئے جاتے ہیں چاہے مسلمان ہو یا نہ ہو۔

سلونوں پر جو ہندوؤں کا ایک خاص دن ہے ایک ہندو بادشاہ کے ہاتھ پر راکھی باندھتا ہے اور بادشاہ دوسرے ہندوؤں کے ہاتھ پر باندھتا ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ اکبر اول نے ہندوؤں کو ملانے کے لئے ایسے بہت سے کام کئے تھے تاکہ ہندو اس کو اپنے عقیدۂ تناسخ کی بنا پر کنہ برہم جاری سمجھنے لگیں جس نے کاشی میں بادشاہت کی امید میں اپنے جسم کو آرہ سے کٹوایا اور اپنے خیال میں دوسرے جسم میں ہو گیا تھا اور کہتے ہیں کہ اسی روز اکبر نے امر کوٹ (سندھ) میں عالم ہستی میں قدم رکھا بندہ (مولوی عبدالقادر) کہتا ہے مشہور تو یوں ہے ورنہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق بھی یہ خبر صحیح نہیں ہے کیونکہ بچے میں جان اس کے پیدا ہونے سے بہت پہلے پڑ جاتی ہے اگر پیدائش کے دن ہی جان پڑتی ہوتی تو تناسخ ماننے والے ایسا گمان کر سکتے تھے گائے کو شہر سے باہر مذبح میں لے جا کر ذبح کرتے ہیں حکومت کی جانب سے بھی سوائے بقر عید کے دنوں کے شہر میں ذبح کرنے کا دستور نہیں ہے ہر چاند رات کو توپیں چلتی ہیں اور رمضان شریف میں ایک مرتبہ افطار اور ایک مرتبہ سحری کے وقت توپ سر کرتے ہیں

جامع مسجد[1] میں دائرہ ہندی: ۔ اس شہر کی وہ عمارتیں جنکو لوگ دیکھنے جاتے ہیں قلعۂ مبارک ہے جو سنگ سرخ کا ہے اور جامع مسجد ہے اور اس میں حوض کے کنارے پر ظہر اور عصر کا وقت معلوم کرنے کے

---

[1] دہلی جامع مسجد کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو۔

(۱) آثار الصنادید باب سوم صفحہ ۲-۱۱ (۲) یادگار دہلی صفحہ ۲۰۰-۴ (۳) واقعات دار الحکومت دہلی جلد دوم صفحہ ۱۱۳

LIST OF MUHAMMADAN AND HINDU MONUMENTS VOL I

VOL 1, / P 142 - 148

لئے ایک دائرہ ہندی بنا دیا ہے جس میں معمولی خطوں سے ایک خط زائد ہے جس کی وضع اس وقت خیال میں نہیں رہی۔ اس فن سے جاننے والوں نے بھی ٹھیک بیان نہیں کیا معمولی دائرہ ہندیہ کی شکل یہ ہے جو اکثر بڑے شہروں میں بنا لیتے ہیں۔

خط نصف النہار

مدخل الظل — مخرج الظل

مغرب — مشرق
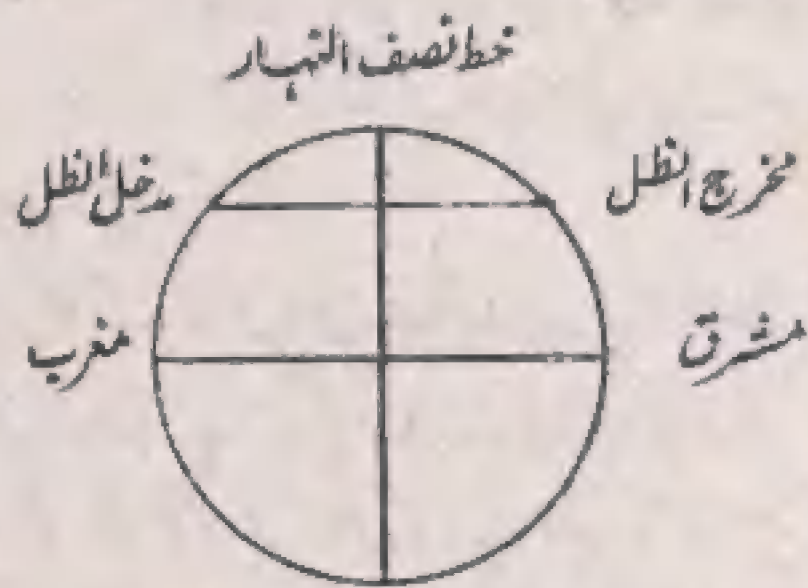
یہ دائرہ ہندیہ اس طرح بنایا جاتا ہے کہ ہموار زمین پر جتنا بڑا چاہیں ایک دائرہ کھینچیں اور اس کے بیچ میں مرکز پر ایک مخروطی (یعنی اوپر سے باریک نیچے سے موٹی) کیل جو قطر دائرہ کے چوتھائی کے برابر ہو سیدھی کھڑی کریں شروع دن اس کا سایہ مغرب کی طرف لمبا ہوگا انتظار کریں کہ گھٹتے گھٹتے دائرے کے کنارے پر آجائے وہاں ایک نشان لگا دیں پھر دوپہر کے بعد جب یہ سایہ مشرق کی جانب بڑھے تو دیکھتے رہیں جب سایہ کنارے پر پہونچے وہاں بھی ایک نشان لگا دیں پہلے نشان کو مدخل ظل اور دوسرے کو مخرج ظل کہتے ہیں ان دونوں کے درمیان ایک سیدھا خط کھینچ دیں پھر اس خط کے دو حصے کر کے بیچ میں مرکز کو لیتے ہوئے محیط تک ایک خط کھینچیں۔ یہ خط نصف النہار کہلاتا ہے جب اس کیل کا سایہ اس خط سے مشرق کی جانب ہو جائے تو ظہر کا وقت شروع ہو گیا اور عصر کا وقت شروع ہونے کی شناخت یہ ہے کہ اس کیل کا سایہ خط نصف النہار پر جس قدر تھا، اس کے علاوہ جمہوری مذہب کے مطابق اس کیل کی برابر ہو جائے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق دو گنا ہو جائے اور زمین کی ہمواری کبھی پانی سے معلوم کرتے ہیں جو معماروں کا معمول ہے کہ جب پانی ہر طرف کو بہہ جائے تو سمجھتے ہیں کہ زمین ہموار ہے۔ دوسرا طریقہ گنیا سے معلوم کرنے کا ہے گنیا ہر طرف رکھنے میں ساہل اگر درمیانی خط پر رہے تو زمین ہموار ہوگی اور جس جانب ساہل جھکے گا وہ نیچا ہوگا اور اس کے مقابل جانب بلندی ہوگی۔ گنیا کی شکل یہ ہے :۔

گنیا

کہ ایک تکونیہ تختہ بنادیں جس کے دو اطراف برابر ہوں اور اس کے کونے پر تاگے کا ایک سرا باندھ دیں اور
دوسرے سرے میں کوئی وزنی چیز مثلاً پتھر یا لوہا باندھ دیں چونکہ وزن بالطبع مرکز عالم کی طرف جو کرۂ زمین
کا مرکز ہے مائل ہوتا ہے لہٰذا زمین میں جدھر بھی نشیب ہوگا وزن اُدھر ہی کو جھک جائے گا اور مخروطی کیل
اس لئے بناتے ہیں کہ اس کا سر باریک نقطہ ہوتا ہے اس کا سایہ خط نصف النہار پر برابر آجاتا ہے اور قطر
دائرے کے چوتھائی کی برابر اس لئے رکھتے ہیں کہ اگر اس سے زیادہ ہو تو جاڑوں میں بہت سے مقامات
میں دائرے کے کنارے پر نہ آئے گا اور قطر کا چوتھائی بھی وہیں رکھتے ہیں جہاں عرض بلد چالیس
درجہ دو دقیقہ سے کم ہو ورنہ اس عرض میں جس وقت آفتاب اول جدی میں آئے گا کیل کا سایہ دائرے
سے باہر ہی رہے گا لہٰذا چوتھائی سے کم ہی رکھنا چاہیئے اور اس کیل کا سیدھا قائم ہونا اس طرح معلوم
کریں کہ ایک تاگا اس کے سرے پر باندھ کر تاگے کی دوسری جانب محیط پر گھمائیں۔ تاکہ بغیر کمی بیشی
کے ہر طرف محیط پر برابر رہے تو کیل سیدھی ہے کیونکہ از روے ہندسہ قواعد سے ثابت ہے کہ ایک
مثلث کے تینوں ضلعے دوسرے مثلث کے تینوں ضلعوں کے برابر ہوں تو زاویئے بھی آپس میں برابر
ہوں گے اور چونکہ ایک ضلع سب جگہ قطر کا نصف ہے اور دوسرا ضلع مقیاس (کیلی) اور تیسرا ضلع
تاگہ مقررہ مقدار ہے لہٰذا تینوں ضلعے آپس میں برابر ہو گئے اور وہ زاویے قطروں کے ادھیائی اور
مقیاس (کیلی) سے پیدا ہوئے ہیں وہ بھی آپس میں مساوی رہیں گے اور مقیاس عمود دائرے کی سطح پر
عمود ہوتا ہے اور دائرۂ ہندیہ کا عمل اُس وقت صحیح ہوگا کہ اس دن نصف النہار کے وقت کسی ایک نقطۂ
انقلاب صیفی یا شتوی پر آفتاب آجائے ورنہ دائرہ کا خط نصف النہار سطح فلک کے نصف النہار پر واقع
نہ ہوگا کیونکہ مدار آفتاب ہر آن میں دوسرا ہے لہٰذا آفتاب کے ان دو نقطوں پر ہونے سے جو دائرہ نصف
النہار سے متساوی الزوایا کا طول یکساں نہیں رہ سکتا بلکہ کبھی پہلا دراز ہوگا کبھی دوسرا۔
کیونکہ اگر میل شمالی ہے تو پہلا دراز ہوگا اور میل جنوبی میں دوسرا

پس پہلی صورت میں بجانب مشرق۔ اس صورت میں اگر اول جدی سے آخر جوزا تک آفتاب کی حرکت کے وقت میں اگر دائرے کا عمل کیا جائے تو ظہر کا وقت خط نصف النہار سے سایہ ہٹتے ہی ہو جائے گا بلکہ خط پر سایہ آتے ہی البتہ دیر کرنی چاہیئے ورنہ نماز قبل از وقت ادا ہوگی۔

مسجد اکبر آبادی:۔ دوسری مسجد نواب اکبر آبادی بیگم کی ہے[۱] جہاں کشمیری کٹرہ ہے اور مولوی عبدالقادر مخدومی شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی درس اور وعظ فرماتے ہیں۔

مسجد فتحپوری:۔ مسجد فتحپوری بھی قابل ذکر ہے کہ کسی دوسری مسجد میں اس کثرت سے کلام اللہ کے حافظ

---

[۱] یہ عالی شان مسجد اعزالنساء بیگم محل شاہ جہاں بادشاہ نے ۱۰۶۰ھ میں بنوائی ان بیگم کا خطاب اکبر آبادی محل تھا اس سبب سے یہ مسجد بھی اکبر آبادی مشہور ہوگئی سر سید احمد خاں آثار الصنادید میں اس مسجد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یہ ایک مسجد ہے دلکش و دلربا، فرحت بخش و روح افزا سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی اور اس کے مکانات اور حجرے طالب علموں کے رہنے کے لئے بنے ہوئے ہیں ضلع غربی سے ملحق کرسی دے کر بنائی ہے جس کی رفعت و شان کے آگے گنبد اخضر پست ہے اور جس کی عظمت و جلال کے آگے ملاء اعلیٰ گرد ہے۔"

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد یہ عالیشان مسجد انگریزوں کی آتش انتقام کی نذر ہوگئی مولوی بشیر الدین احمد واقعات دارالحکومت حصہ دوم میں لکھتے ہیں:۔

"یہ مسجد غدر کے بعد ڈھایا ڈھوئی کی نذر ہوئی محل وموقع اس کا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے جس وقت اس کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھیں ویسے ہی ڈھک دی گئیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خانۂ خدا اور بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہوگئی۔"

تفصیل کے لئے دیکھئے:۔

(۱) آثار الصنادید باب سوم صفحہ ۱۸۔ ۱۹

(۲) واقعات دارالحکومت حصہ دوم صفحہ ۱۴۰۔ ۱۴۲

نہیں دیکھے گئے [1]

مدرسہ غازی الدین خاں :۔ یہ مدرسہ غازی الدین خاں اول کا تعمیر کردہ [2] ہے جو عہد عالمگیری

---

[1] یہ مسجد بھی شاہ جہاں بادشاہ کی ایک دوسری بیگم نواب فتحپوری محل بیگم نے بنوائی ہے، نہایت عمدہ، خوبصورت سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے تمام صحن اور دونوں دالانوں کا فرش بھی سنگ سرخ کا ہے اس مسجد کا طول ۴۵ گز اور عرض ۲۲ گز ہے گنبد کے دونوں طرف تین تین در کے ایوان دریوں میں کرسی اور اجارہ میں منبت کاری ہوئی ہے۔ دونوں کونوں پر ۳۵، ۳۵ گز کے دو مینارے ہیں جو نہایت خوشنما بنے ہوئے ہیں صحن کے آگے ۱۲×۱۴ گز کا حوض ہے۔ اس میں چاندنی چوک کی نہر سے پانی آتا تھا مسجد کے دائیں بائیں دالان اور طالب علموں کے رہنے کے لئے حجرے بنے ہیں۔ مسجد کے ہر سہ جانب مسلسل دوکانیں ہیں جن سے خوب آمدنی ہوتی ہے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی حکومت نے مسجد کی دوکانیں ضبط کرلیں لالہ چھنا مل رئیس نے گورنمنٹ سے انتیس ہزار روپے میں خرید لیں ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء میں بجانب حاجی محمد تقی باہتمام حاجی قطب الدین و غلام محمد اس مسجد کی تعمیر و مرمت ہوئی ۱۹۳۵ء میں انجمن راشدین صُلح کل اسلامیہ (دہلی) کی طرف سے جائداد وقفی اور تنسیخ نیلام کی درخواست دی گئی جس کے نتیجہ میں مسجد کی کل جائداد واگذاشت ہوگئی مسجد کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہے مسجد میں ایک عربی مدرسہ بھی قائم ہے۔

(۱) آثار الصنادید باب سوم ص ۲۶ - ۲۷　　(۲) یادگار دہلی صفحہ ۱۵۴، ۱۵۶

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۲۴۲، ۲۴۶

[2] غازی الدین فیروز جنگ اول المتوفی ۱۷۱۰ء (ولد نظام الملک آصف جاہ اول) نے اجمیری دروازے کے پاس یہ مدرسہ قائم کیا یہ عمارت دلی کی مشہور اور دلکش عمارات میں سے ہے اس عمارت کی خوب صورتی اور طرز تعمیر قابل دید ہے یہ عمارت مربع اور دو منزلہ تمام سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے جس کا وسیع احاطہ تین سو گز مربع ہے اس کے تین دروازے بہت بڑے عالی شان اور نہایت خوب صورت ہیں مغرب میں ایک نہایت خوشنما اور وسیع مسجد جو سرتاپا سنگ سرخ کی ہے، بنی ہوئی ہے پاس ہی بانی مدرسہ نے اپنا مقبرہ بنوا لیا۔ اس مقبرہ کی مرمت ۱۹۱۹ء کے بعد سترہ ہزار روپیہ کی لاگت سے نواب میر عثمان علی خاں نظام دکن نے کروائی اس مدرسہ کا دوسرا دور ۱۷۹۲ء میں شروع ہوا اور ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہوگیا۔ دہلی کالج کے مصارف کے لئے اعتماد الدولہ فضل علی خاں (المتوفی ۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۹ء) نے ۱۸۲۹ء میں ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ سرکار انگریزی کے سپرد کیا۔ دہلی کالج میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی جیسے جید علماء مدرس رہے اور اس کالج نے علمی درس گاہ کے اعتبار سے بڑی شہرت حاصل کی اور اس سے بڑے بڑے فاضل (باقی صفحہ ۲۱۴ پر)

کا امیر تھا والد کا نام خواجہ محمد عابد تھا اور یہ شخص شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں سے تھا سمرقند سے خانہ جنگی کی بنا پر ہندوستان آگیا بخت کی یاوری نے بزرگی اور پیری سے وزارت اور امارت پر پہونچا دیا وہاں کا مدرس مولوی نذر محمد حساب دانی میں مشہور تھا

مولانا شاہ فخر الدین: دوسرا مدرسہ نواب غازی الدین خاں کی والدہ کا ہے جس کو لوگ مولانا فخر الدین کا مدرسہ کہتے ہیں۔[۱] یہ بزرگوار (مولانا شاہ فخر الدین) مولانا نظام الدین کے فرزند ہیں اٹھارہ سال کی عمر تھی کہ سایۂ عاطفت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۵) آگے شمس العلماء خان بہادر ذکاء اللہ شمس العلماء مولوی ضیاء الدین خاں ایل ایل ڈی، شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد خاں بہادر وغیرہ نکلے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کالج ختم ہوگیا۔ اب اس عمارت میں اینگلو عرب کالج قائم ہے۔ تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو (۱) آثار الصنادید باب سوم صفحہ ۳۱۔۳۲ (۲) یادگار دہلی صفحہ ۱۰۳۔۱۰۵ (۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ۵۹۲۔۵۰۳ (۴) ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں ص ۲۳ (۵) مرحوم دہلی کالج ص ۲

[۱] حضرت شاہ فخر الدین دہلویؒ کا یہ مدرسہ حقائق و معارف کی درس گاہ تھی۔ علوم معقول و منقول اور احادیث کے باقاعدہ درس ہوتے تھے حضرت نے اپنے مشہور مرید و شاگرد میر بدیع الدین کو میزان سے لیکر صحیح بخاری تک کی تعلیم دی۔ مولوی بشیر الدین احمد مؤلف واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم مدرسہ غازی الدین خاں کے بیان میں مولانا فخر الدینؒ کے مدرسہ کے متعلق ضمناً لکھتے ہیں:۔

> "اس عمارت کے سامنے تا خندق ایک وسیع میدان اجمیری دروازہ کے باہر تک تھا شمال مغرب اور جنوب کی طرف دوسری شاندار عمارتیں اور اُمراء کے مقبرے تھے جن کے نشانات اب تک بھی کچھ کچھ باقی ہیں اُنھیں عمارتوں میں مولانا فخر الدین کا مدرسہ بھی تھا جہاں وہ خود درس دیا کرتے تھے اور جہاں اُنھوں نے ۱۱۹۹ھ میں انتقال کیا، در غسل کے بعد قطب صاحب میں دفن ہوئے جس مقام پر آپ کو غسل دیا گیا تھا وہ جگہ بڑی متبرک خیال کی جاتی ہے"

مولانا فخر الدین صاحب کے مدرسے کا تفصیلی بیان پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت میں مولانا شاہ فخر الدین کے حالات میں "درس و تدریس" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

(۱) تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۲۷۳، ۲۷۰۔ (۲) فخر الطالبین از نور الدین حسین فخری (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۵ھ)

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۵۶۸ (۴) رسالہ فخر البرابیہ از دراز علی ڈاکٹر مطبع نامی الہ آباد ۱۹۰۸ء ص ۳۲، ۳۱

پدری میں علوم درسیہ حاصل کر کے علم اخلاق اور تزکیہ نفس کا فیض والد سے حاصل کیا۔ کچھ عرصے تک سپہ گری کے پیشے پر بسر کی اس کے بعد سب کو چھوڑ چھاڑ اجمیر پہونچے اور اجمیر سے ٹپن گئے جو پنجاب میں ہے اور وہاں پر بزم فیضان آراستہ کی مخدوم نور محمد[1] اسی ملک کے باشندے ان ہی کے فیض صحبت سے نامور ہوئے آخر میں شاہ فخر الدین دہلی آئے اور زندگی بھر یہیں رہے علوم ظاہری کی تعلیم اور تہذیب باطن کی تلقین فرماتے رہے ہر یگانہ و بیگانہ سے برادرانہ تعلق رکھتے تھے ٹیڑھی بات کا بھی سیدھا جواب دیتے تھے ظاہری وضع عوام کی سی مگر ملکات فاضلہ کی بنا پر خاص گروہ میں سے تھے درگاہ خواجہ قطب الدین کاکی کی مسجد کی پشت پر

---

[1] شاہ نور محمد ۱۴ رمضان المبارک ۱۱۴۲ھ / ۱۷۲۹ء کو چوٹالہ میں پیدا ہوئے والد کا نام ہنوال تھا چھٹی پشت کے بعد ان کے بزرگوں کے نام بالکل ہندوؤں کی طرح شروع ہو جاتے ہیں خود شاہ صاحب کا خاندانی نام بھیل تھا حضرت شاہ فخر نے بدل کر نور محمد کر دیا۔ شاہ نور محمد کی والدہ ماجدہ کا نام عاقل بی بی تھا شاہ نور محمد کے والد چوٹالہ سے مہار آگئے تھے وہیں شاہ صاحب نے حافظ محمد مسعود سے قرآن کریم حفظ کیا اس کے بعد مختلف دیار و امصار میں تحصیل علم کے لئے گشت و قیام کرتے ہوئے دہلی پہونچے اول مدرسہ غازی الدین میں پڑھا پھر حضرت شاہ فخر کی خدمت میں حاضر ہوئے تحصیل علم کے بعد ۱۱۶۵ھ / ۱۷۵۱ء میں حضرت شاہ فخر کے دست حق پرست پر بیعت کی کچھ عرصے بعد حضرت شاہ فخر نے پاک ٹپن کا قصد کیا شاہ نور محمد بھی اس سفر میں ان کے ہمراہ رہے حضرت شاہ فخر نے کچھ دنوں کے بعد خلافت سے سرفراز فرما کر مہاران میں قیام کرنے کا حکم دیا حضرت شاہ نور محمد کی وجہ سے پنجاب میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کی خوب تبلیغ و ترویج ہوئی۔ ۳ ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء کو وصال فرمایا تاج سرور (بستی چشتیاں) میں مزار ہے کسی نے تاریخ وفات کہی ہے:

حیف دار یا جہاں بے نور گشت ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء

تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو:

۱۔ مناقب المحبوبین از نجم الدین چشتی (مطبوعہ مطبع محمدی لاہور ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء) ص ۵۴، ۱۰۳

۲۔ تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۵۳۰۔۔ ۵۶۰

۳۔ خزینۃ الاصفیاء جلد اول صفحہ ۵۰۶ ۔ ۵۰۸

(۴) تذکرۃ المعین فی ذکر الکاملین از مولوی زین العابدین (مطبوعہ ۱۹۰۹ء) صفحہ ۱۴۹۔۱۵۱

(۵) برکات الاولیاء از مولوی امام الدین گلشن آبادی (افضل المطابع دہلی ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء) ص ۱۷۲

اُن کا مزار ہے[1]

---

[1] شاہ فخر الدین ابن شاہ نظام الدین ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے حضرت شاہ فخر کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی فصوص الحکم، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ کتابیں میاں محمد جان سے اور ہدایہ وغیرہ مولانا عبد الحکیم سے پڑھیں۔ حضرت شاہ فخر نے حدیث کی سند دکن کے ایک مشہور محدث حافظ اسعد الانصاری سے حاصل کی بعض کتابیں مثلاً شرح وقایہ مشارق الانوار اور نفحات الانس وغیرہ اپنے والد سے پڑھیں درسی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم و فنون طب، تیر اندازی اور فن سپہ گری میں بھی مہارت حاصل کی اپنے والد ماجد حضرت خواجہ شاہ نظام الدین سے بیعت کی والد صاحب کے انتقال کے بعد لشکر میں ملازمت کرلی مگر ریاضت و عبادت میں راتوں کو مشغول رہتے جب شہرت پھیلی تو لشکر کو چھوڑ کر باپ کی مسند کو سنبھالا ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء میں دہلی پہونچے ایک حویلی کرائے پر لے لی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کردیا اور بیعت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا اس کے بعد حضرت شاہ فخر نے پاک پٹن کا سفر کیا واپسی میں دہلی میں مستقل قیام کیا اور اجمیری دروازہ کے مدرسے میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ حقائق و معارف کے دریا بہنے لگے حضرت شاہ فخر کی تصنیفات سے (۱) عقائد نظامیہ (۲) رسالہ مرجیہ اور (۳) فخر الحسن ہیں

"حضرت شاہ فخر کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا ہر چھوٹے بڑے سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے ان کے اخلاق سے دشمن تک متاثر ہوتے تھے ہر چھوٹے بڑے کی تعظیم کرتے تھے۔ تفضیلی بزرگ تھے عشرۂ محرم میں بعض مراسم ادا کرتے تھے ———— اکثر شیعوں کو بھی مرید کر لیتے تھے ہندوؤں سے بڑے اخلاق سے پیش آتے تھے دہلی کے آخری بادشاہ سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ کو حضرت شاہ فخر سے بڑی عقیدت تھی حضرت شاہ فخر کا ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء کو وصال ہوا، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے قریب سپرد خاک کیا گیا مزار کے سرہانے یہ کتبہ لگا ہوا ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

بگذاشت فخر دین چوں مہماں سرائے فانی — بر آستانہ جا دواں آں قطب جاودانی
سال وصال آں مہ از غیب چوں بجستم — تاریخ گفت ہاتف خورشید دو جہانی

۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء

تفصیل کے لئے دیکھئے :- (۱) تاریخ مشائخ چشت ص ۴۷۰، ۵۲۹ (۲) واقعات دار الحکومت دہلی صفحہ ۳۹۶، ۳۹۷ (۳) آثار الصنادید باب چہارم صفحہ ۱۹-۲۱ و باب اول ص ۷۷ (۴) رسالہ فخر البرا نیہ ص ۲۶/ ۵۹ (۵) خزینۃ الاصفیاء اول صفحہ ۴۹۸، ۵۰۷ (۶) تذکرۃ المصنفین فی ذکر الکاملین ص ، ۱۴۹ (۷) برکات الاولیاء ص ۱۶۶، ۱۶۷ (۸) مناقب المحرمین ص ۴۹ - ۵۴

ان کے مشرب سے ناواقف معتقدوں کو اگرچہ گنبد بنانے کا موقع نہ ملا مگر اس پر آشیانہ کھڑا کر لیتے ہیں اور مدّے میں جس جگہ ان کو غسل دیا تھا زیارت گاہ ہے اور ان کے سونے کی جگہ حجرے میں پلنگڑی تبرکاً رکھ چھوڑی ہے یہ چیزیں نہ شریعت میں ہیں نہ تصوف اور سلوک میں۔ بلکہ بوالہوس لوگوں کی من گھڑت ہیں ان کے لڑکے مخاطب بہ مولوی قطب الدین[1] خلیق، مسکین، اور متواضع تھے حضور والا (اکبر شاہ ثانی) ان کے مُرید تھے ان کے پوتے معروف بہ کالے میاں[2] ہیں اُن کی ہمت امیرانہ اور وضع درویشانہ ہے۔

---

[1] حضرت شاہ فخر الدینؒ کے ایک ہی فرزند تھے نام غلام قطب الدین تھا وہ دکن میں پیدا ہوئے شاہ صاحب جب دہلی تشریف لائے تو ان کو اپنی بہن کے سپرد کر دیا شاہ فخر الدین کے بعد غلام قطب الدین ہی سجادہ نشین ہوئے ان کے زہد و تقدس کا بڑا شہرہ تھا محمد اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر ان کے مُرید تھے بہادر شاہ ظفر نے لکھا ہے:۔

مرید قطب دیں ہوں، خاکپائے فخر دیں ہوں میں		اگرچہ شاہ ہوں، ان کا غلام کمتریں ہوں میں

ان ہی کے فیض سے ہے نام روشن میرا عالم میں		وگرنہ یوں تو بالکل رو سیہ شل نگیں ہوں میں

بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
ولیکن اے ظفر ان کا گدائے رہ نشیں ہوں میں

غلام قطب الدین نے ۱۰ محرم ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء کو وصال فرمایا اور حضرت خواجہ قطب کاکی کے جوار میں دفن ہوئے۔ اخبار الصنادید میں سال وصال ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء تحریر ہے باب چہارم ص ۲۱ جو صحیح نہیں ہے کیونکہ سر سید احمد خاں نے اس صفحہ پر حضرت کالے صاحب کی عمر سنہ ۱۸۴۶ء — (آثار الصنادید کا سال تالیف) میں پچاس سال سے متجاوز لکھی ہے۔ غالباً دہائی اور اکائی کے اعداد لکھنے سے رہ گئے۔

(۱) تاریخ مشائخ چشت ص ۵۱۸ - ۵۱۹		(۲) واقعات دار الحکومت دہلی ص ۵۱۹۔

(۳) اخبار الصنادید باب چہارم ص ۲۱		(۴) مناقب المحبوبین ص ۵۱

[2] غلام قطب الدین کے بھی یہی ایک فرزند تھے ان کا نام میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب تھا سر سید نے ان کے متعلق لکھا ہے:۔ "اس زمانہ میں ایسا نامی گرامی شیخ نہیں ہے۔ حضور والا (بہادر شاہ ظفر) اور تمام سلاطین و جمیع اُمراءِ عظام آپ کے نہایت معتقد ہیں"

غالب کو حضرت کالے صاحب سے خاص لگاؤ اور تعلق تھا بہادر شاہ ظفر حضرت کالے صاحب کے بڑے معتقد تھے چنانچہ ظفر لکھتے ہیں:۔

نظام خانۂ فخر جہاں تمہیں تو ہو		قیام سلسلہ و خاندان تمہیں تو ہو		(صفحہ ۲۱۸ پر)

شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی:۔ خانم کے بازار[1] میں شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی مُرشد مولینا نظام الدین اورنگ آبادی کا مزار ہے حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی نے جلالین کے طرز پر قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے عشرۂ کاملہ میں دس مسئلوں کی تحقیق کی ہے رقعات اور کشکول بھی فن سلوک میں ان کی یادگار ہیں ان کتابوں سے ان کا تبحر علمی ظاہر ہے[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۹ سے آگے) نہ کیونکر تم سے ہوں ظاہر صفات قطب الدین خدا رکھے تمہیں ان کا نشان تمہیں تو ہو

کالے صاحب کی حویلی گلی قاسم جان میں رہتی جو اب "احاطہ کالے صاحب" کے نام سے مشہور ہے۔ کالے صاحب نے ۱۵ رجنوری ۱۸۲۶ء ۱۲۴۲ھ کو وصال فرمایا مہرولی میں دفن ہوئے۔ کالے صاحب کے بعد ان کے فرزند اکبر غلام نظام الدین سجادہ نشین ہوئے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں کالے صاحب کی املاک منضبط ہو گئیں غلام نظام الدین صاحب حیدرآباد چلے گئے جب حالات درست ہوئے تو دہلی واپس آئے ۱۸۷۵ء ۱۲۹۲ھ میں وصال ہوا۔

(۱) تاریخ مشائخ چشت ص ۵۱۷ - ۵۲۰ (۲) آثار الصنادید باب چہارم ص ۲۱

(۳) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم ص ۳۹۷ (۴) مناقب المحبوبین ص ۵۱

(۵) دلی کی سزا از خواجہ حسن نظامی (مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۲۶ء) ص ۴۸، ۹۰

[1] خانم کا بازار ایک بہت بڑا اور پُر رونق بازار تھا جو قلعے کی فصیل کے برابر سراوگیوں کے مندر تک چلا گیا تھا جہاں اب ٹھنڈی سڑک ہے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد خانم کا بازار ڈھا دیا گیا اور میدان صاف کر دیا گیا۔ (واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم ص ۱۲۳)

[2] حضرت شاہ کلیم اللہ کے والد کا نام شیخ نور اللہ تھا خلیفہ اول سیدنا صدیق اکبرؓ کی اولاد میں تھے، شیخ نور اللہ کے والد شیخ احمد معمار تھے جو عہد شاہجہانی کے مشہور ماہرین فن میں تھے شاہان مغلیہ کی طرف سے نادر العصر کا خطاب تھا اُقلیدس، ہیئت نجوم اور ریاضی وغیرہ پر کامل عبور رکھتے تھے۔ تاج محل اور لال قلعہ انہی نے تعمیر کیا تھا احمد معمار کے تین بیٹے عطاء اللہ، لطف اللہ مہندس اور شیخ نور اللہ (والد شاہ کلیم اللہ) تھے۔ لطف اللہ علم ہندسہ کے ماہر تھے مہندس شاہی خطاب تھا شاعر بھی تھے مہندس کا دیوان طبع ہو چکا ہے شیخ نور اللہ بھی اپنے فن میں بڑے کامل تھے دہلی کی جامع مسجد کی پیشانی پر جو کتبے ہیں وہ نور اللہ ہی کی باکمال انگلیوں کا کرشمہ ہیں، حضرت شاہ کلیم اللہ کی ولادت ۲۴ رجمادی الثانی ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء کو ہوئی تھی شاہ صاحب کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی ان کے اساتذہ میں شیخ برہان الدین المعروف بہ شیخ بہلول اور شیخ ابو الرضا الہندی (حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تایا) کے اسماء گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں تکمیل علوم کے بعد شاہ کلیم اللہ مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے (باقی ص ۲۲۱ پر)

حضرت شاہ ترکمان:- شہر میں شاہ ترکمان کا مزار بھی ہے ان کا تفصیلی حال بندے کے خیال میں نہیں ہے[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۰ سے آگے) اور حضرت شیخ یحییٰ مدنی کے دست حق پرست پر بیعت کی شاہ کلیم اللہ نے دہلی واپس آ کر بازار خانم میں اپنا مسکن بنایا اور سلسلہ درس و تدریس شروع کر دیا شاہ صاحب کے مدرسے میں دور دور سے طلباء آتے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے شجرۃ الانوار کے حوالے سے لکھا ہے "بسیارے طلبائے علم آمدہ سکونت می نمودند و سبق کتب ہا می خواندند و نان و پارچہ نیز از سرکاری یافتند" حضرت شاہ کلیم اللہ نے تصانیف کا ایک بے بہا ذخیرہ چھوڑا البقول "مناقب فریدی" شاہ صاحب کی تصانیف کی تعداد ۳۲ ہے مندرجہ ذیل تصنیفات مشہور ہیں (۱) قرآن القرآن (۲) عشرہ کاملہ (۳) کشکول (۴) مکتوبات کلیمی (۵) رسالہ تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیہ (۶) سواء السبیل (۷) مرقع (۸) تسنیم (۹) الہامات کلیمی (۱۰) شرح القانون

شاہ صاحب نے ایک رسالہ "رد روافض" اور دوسرا علم منطق میں بھی مرتب فرمایا تھا غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب شعر بھی کہتے تھے اور ان کا کلام جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ضائع ہو گیا "قرآن القرآن" عربی زبان میں قرآن کریم کی نہایت اعلیٰ مذہب حنفی تفسیر کی ہے ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں مطبع احباب "میرٹھ" سے منشی عرفان الحق نے ایک قرآن کریم، شاہ رفیع الدین دہلوی کے ترجمہ کے ساتھ شائع کیا تھا اس کے حاشیہ پر یہ تفسیر چھاپی تھی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے طباعت کی تاریخ "ختم المصاحف" سے نکالی عشرہ کاملہ اور کشکول اور مکتوبات بھی چھپ چکے ہیں شاہ صاحب نے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ / ۱۷۲۹ء میں وصال فرمایا۔ قطعہ تاریخ وفات

فضل و کمال خویش بود مرہم قلب ریش بود

سال وصالش گفتہ ہاتف قطب زمانہ خویش بود

۱۱۴۲ھ / ۱۷۲۹ء

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:-

(۱) تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۳۶۶ - ۴۲۶ (۲) مکتوبات کلیمی از شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی مطبوعہ مطبع مجتبائی ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء

(۳) یادگار دہلی صفحہ ۴۳ (۴) واقعات دار الحکومت دہلی صفحہ ۱۱۶ - ۱۱۷

LIST OF MUHAMMADAN AND HINDU MONUM NTS VOL. I. P. 150

[1] حضرت شاہ ترکمان بڑے پائے کے بزرگ تھے شمس العارفین بیابانی کے لقب سے مشہور تھے شاہ ترکمان تارک الدنیا تھے اور اکثر صحرا و بیابان میں بسر اوقات فرماتے تھے بہت سے لوگ ان کے معتقد تھے شاہ صاحب کا مزار اندرون شہر دہلی ترکمان دروازہ کے پاس ہے اور یہ دروازہ ان ہی کے نام سے مشہور ہے مزار کے چاروں طرف احاطہ بنا ہوا ہے (باقی صفحہ ۲۲۲ پر)

صوفی سرمد:- جامع مسجد کے سامنے سرمد کی قبر ہے کہتے ہیں کہ یہ ادمنی تھا اس کا کلام بیشتر رباعیات پر مشتمل ہے جو کیفیت سے خالی نہیں اور ان رباعیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد منش سنجیدہ شخص تھا شہزادہ دارا شکوہ سے جو فقیر دوست اور مذہب سے خوب واقف تھا اس کو خاص ربط حاصل تھا اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں علماء کے فتوے پر مارا گیا، تلوار سر پر تھی اور یہ مطلع جو اس کی پختہ کاری کا شاہد ہے زبان پر تھا[1]

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم　　دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم
ہستی میں عدم کی جو مچا شور کھلی آنکھ　　دیکھا کہ شب فتنہ ہے باقی تو لگی آنکھ

خواجہ باقی باللہ:- اس شہر میں خواجہ باقی باللہ کا مزار ہے یہ شیخ احمد سرہندی معروف بہ مجدد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۱ سے آگے) سلسلہ سہروردیہ تھا شاہ ترکمان کا وصال ۲۳ رجب المرجب ۶۳۷ھ / ۱۲۴۰ء میں بعہد معز الدین بہرام شاہ ہوا سالانہ عرس ہوتا ہے اور بسنت کا میلہ بھی لگتا ہے

(۱) مرقع دہلی از درگاہ قلی خاں (مرتبہ حکیم مظفر حسین) مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد دکن صفحہ ۸۰
(۲) آثار الصنادید باب سوم صفحہ ۱۶　　(۳) یادگار دہلی صفحہ ۹۲
(۴) واقعات دار الحکومت دہلی صفحہ

LIST OF MUHAMMADAN AND HINDU MONUMENTS VOL I, P, 56

[1] مشہور ہے کہ سرمد یہودی سے مسلمان ہوا تھا اول ٹھٹھ میں رہا پھر دہلی پہونچا دارا شکوہ کو سرمد سے عقیدت ہوگئی جذب کی حالت میں اکثر سرمد ننگا رہتا تھا علمائے شریعت نے سرمد کے قتل کا فتوے دیا ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء میں مقتول ہوا۔ قبر پر یہ تاریخ کندہ ہے

شاہ سرمد بعہد عالمگیر　　چوں سفر ساخت بخلد بریں
گفت تاریخ اکبر مسکین　　لحد مرقد شہید سرداییں

(۱) یادگار دہلی صفحہ ۳۰ (۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۱۱۳-۱۱۴ ۱۰۷۰ھ / ۱۶۵۹ء
(۳) روضۃ القیومیہ جلد اول از کمال الدین محمد احسان ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء ص ۲۴۰

LIST OF MUHAMMAD AND HINDU MONUMENTS VOL I, P, 148-149

الف ثانی[۱] کے پیر ہیں اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں تھے لوگوں میں مشہور ہے کہ ان کے مزار کے چاروں طرف جو پتھر کا فرش ہے کرامت کی بنا پر دھوپ سے گرم نہیں ہوتا لیکن تجربہ کار اس کو اس پتھر کی خاصیت سمجھتے ہیں نامہ نگار (مولوی عبدالقادر) کا خیال ہے کہ اللہ والے اس دنیا میں اینٹ پتھر بلکہ جسم سے بھی چنداں سروکار نہیں رکھتے اس خاکدان سے روانگی کے بعد بالاخانہ کی چھت کی سردی و گرمی کی کیا پروا ہوگی۔ بزرگوں کی کرامت بس یہی ہے کہ ان کے متبعین مخلوق کی رہنمائی کریں[۲]

---

[۱] شیخ احمد فاروقی سرہند میں ۹۷۱ھ/۱۵۶۳-۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ اکثر علوم متداولہ اپنے والد شیخ عبدالاحد سے حاصل کئے پھر سیالکوٹ جاکر مولانا محمد کمال کشمیری اور مولانا یعقوب کشمیری سے علوم کی تحصیل کی اور حدیث کی سند قاضی بہلول بدخشی سے حاصل کی اور علوم ظاہری و باطنی میں یکتائے روزگار ہوکر علم و عرفان کے دریا بہانے شروع کر دیئے اسی اثناء میں بہت سے رسالے جیسے تہلیلیہ اور رد روافض وغیرہ تصنیف فرمائے۔ ۱۰۰۸ھ/۱۵۹۹ء میں حج کے لئے اپنے وطن سے روانہ ہوئے راستے میں دہلی میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہ سے شرف ملاقات و بیعت و خلافت حاصل کی نقشبندیہ سلسلہ کا خوب شیوع کیا اتباع سنت کا بڑا خیال رکھتے تھے عہد اکبری میں علمائے سوء کی مدد سے اسلام کی جو صورت مسخ ہوئی تھی اور شریعت محمدیہ کو جو نقصان ہوا تھا اس کی اصلاح میں حضرت مجدد نے بہت کوشش کی بدعات کا رد کیا وحدت الشہود کے نظریے کی اشاعت کی عہد جہانگیری میں مجدد صاحب قید بھی ہوئے حضرت نے تسلیم و رضا کا مظاہرہ کیا ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔
حضرت مجدد کی تصانیف میں مکتوبات بہت مشہور ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:-

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم از مولانا محمد میاں (دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۴۲ء) ص ۲۱۲ - ۳۱۹
(۲) گلزار اولیا از مولوی مظفر حسین (مطبع سبحانی حیدرآباد دکن ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) صفحہ ۳۳ - ۳۷
(۳) سفینۃ الاولیا صفحہ ۲۴۷، ۲۴۸
(۴) رود کوثر از شیخ محمد اکرم (لاہور ۱۹۵۸ء) صفحہ ۲۰۹ - ۲۸۵
(۵) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی از خلیق احمد نظامی (دہلی ۱۹۵۳ء) صفحہ ۱۲۳ - ۱۲۵
(۶) سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان از غلام علی آزاد بلگرامی (طبع بمبئی) ص ۴۷ - ۵۲

[۲] حضرت خواجہ باقی باللہ کا اصلی نام رضی الدین احمد ابن شیخ عبدالسلام ہے وہ ۹۷۱ھ/۱۵۶۳-۶۴ء میں کابل میں پیدا ہوئے وہاں علوم ظاہری کی تحصیل ملا محمد صادق حلوائی سے کی پھر فیوض باطنی مدینہ منورہ میں حضرت خواجگی (باقی صفحہ ۲۲۴ پر)

سیّد حسن :- ایک مزار سیّد حسن کا ہے جو محمد شاہ کے زمانے میں تھے ان بزرگوار کی وفات کے دن ہر مقام سے ان کے مقلدین جن کو بھانڈ کہتے ہیں جمع ہو کر اپنے پیشے کی داد دیتے ہیں اور لوگوں کو کبھی رلاتے ہیں کبھی ہنساتے ہیں [۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳ سے آگے) اکتساب علیہ الرحمہ سے حاصل کئے بعہد اکبر بادشاہ ہندوستان تشریف لائے اور دہلی میں مقیم ہوئے۔ خواجہ باقی باللہ کا وصال چالیس سال کی عمر میں ۲۵ جمادی الآخر ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں ہوا۔ خواجہ صاحب کی درگاہ شریف شہر کی آبادی کے اندر صدر بازار میں شہر کے مغرب رُخ واقع ہے ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء میں سجادہ نشین درگاہ مظفر علی صاحب نے مسجد و درگاہ کی مرمت کرائی۔

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۵۱۳ - ۵۱۶ (۲) گلزار اولیاء صفحہ ۳۱ - ۳۳

(۳) آثار الصنادید، باب اول ص ۹۳ (۴) سفینۃ الاولیاء صفحہ ۱۱۹

[۱] قطب روڈ پہاڑ گنج سے ذرا آگے بڑھ کر سیّد حسن کا مزار ہے ان کا لقب رسول نما ہے مشہور ہے کہ جس کو چاہتے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف کرا دیتے تھے ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں وصال ہوا لفظ "رسول نما یا رسول باقی شد" سے تاریخ وفات نکلتی ہے مزار کے سرہانے سنگ مرمر کی تختی پر بخط نسخ یہ شعر کندہ ہے :-

حسن رسول نما افتخار آل حسین،

اویس قرنی ثانی و ثالث حسنین

خافی خاں منتخب اللباب حصہ دوم صفحہ ۵۵۱ - ۵۵۲) میں لکھتا ہے :-

"سیّد حسن رسول نما کہ مجموعہ فضل و کمال و از مستعدان روزگار واصل باللہ بود خصوص در علم تفسیر و حدیث و عبادت و ریاضت نادرۃ العصر بودہ بحسب ظاہر با اہل دول کہ در خدمت آں سیّد از روی ارادت و عقیدت رجوع می آوردند بدستور فقرائے ملامتی در کلمہ و کلام کہ از مردم نفرت گیرند سلوک می نمودہ از ملاقات دنیا پرستاں خود را می کشید و ہر کہ بخدمت ایشاں رفتہ اظہار ارادت و گرویدن می نمود حرفہائے درشت و خلاف روبہ روزگار بادی گفتند و از راویان ثقہ مسموع شدہ کہ بعضے خادمان صادق العقیدت را بسعادت حاضر نمودن در مجلس حضرت سرور کائنات (باقی صفحہ ۲۲۵ پر)

خواجہ میر درد: خواجہ میر دردؔ کا مزار قابل ذکر ہے جن کی رباعیاں اور ریختہ (اردو) کی غزلیں سب درد آمیز ہیں رسالہ آہ سرد، نالۂ درد اور واردات ان کی تصنیفات سے ہیں فن تصوف اور اس کے اہم مسائل کی موشگافی ان کے تبحر علمی کی شاہد ہے [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۴ سے آگے) مفتخر ساختہ بودند واکثر محتاجان از توجہ باطن الیشان بمراد دل می رسانند"

نواب درگاہ قلی خاں لکھتے ہیں:-

"بہ بست ونہم شعبان المعظم مراسم عرس بتقدیم می رسد۔ وضع تزئین وآرائش بکار می رود۔ صبح عرس جمیع نقالان دہلی تا شام بمجرا پرداختہ احتظاظ وافی بزائران می سازند"

(۱) مرقع دہلی از نواب درگاہ قلی خاں ص ۹

(۲) منتخب اللباب حصہ دوم از محمد ہاشم خان المخاطب بہ خافی خاں (مطبع مظہر العجائب کلکتہ ۱۸۷۴ء) ص ۵۵۱ ۔ ۵۵۲

(۳) یادگار دہلی ص ۱۸۵ (۴) آثار الصنادید، باب اول ص ۹۴

(۵) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۵۵۰ (۶) نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر جلد ششم از مولوی عبد الحئی (دائرۃ المعارف دکن ۱۹۵۵ء) ص ۹۳ ۔ ۹۴) (۷) ملفوظات شاہ عبد العزیز دہلوی (اردو) ہاشمی پریس میرٹھ ۱۸۹۷ء ص ۹۰

(۸) مناقب الحسن رسول نما (اردو ترجمہ فواتح العرفان مصنفہ سید ہاشم) مطبوعہ مطبع گلزار ہند اسٹیم پریس ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء

[1] خواجہ میر درد، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے تھے دہلی میں ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۱ء میں پیدا ہوئے اپنے والد کے آغوش تربیت میں پرورش پائی اور بائیس برس کی عمر میں والد کے سجادہ نشین ہوئے۔ علوم وفنون میں طاق تھے تصوف اور موسیقی میں اچھی مہارت تھی واردات درد میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں خواجہ میر دردؔ نے ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء کو تریسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی فارسی اور اردو میں دیوان طبع ہو چکے ہیں لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:۔ ھو الناصر

نور الناصرین اول المحبوبین خواجہ میر علی محمد المتخلص بہ دردؔ تحیات اللہ علیہ ولوالدیہ وعلی من توکل الیہ

خورشید ضمیر خواجہ میر درد است ہم میر و فقیر خواجہ میر درد است

ہم بدر منیر خواجہ میر درد است ہم مرشد و پیر خواجہ میر درد است

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔ (۱) گل رعنا از عبد الحئی مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء ص ۱۷۹ ۔ ۱۸۰ (۲) آبحیات از محمد حسین آزاد لاہور ۱۹۵۰ء ص ۸۴، ۱۹۲ (۳) واقعات دار الحکومت دہلی ص ۳۱۵، ۵۷۵ (۴) یادگار دہلی ص ۹۶

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں :۔ حضرت مرزا جانِ جاناں کا مزار[1] ہے جو سلسلۂ نقشبندیہ کے متاخر مشائخ کبار میں سے تھے یہ دونوں بزرگوار (حضرت خواجہ میر درد حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں) شاہ عالم بادشاہ کی بادشاہی کے زمانے میں اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے جناب مرزا کو نواب نجف خاں کے ایک نادان شیعہ لشکری نے رات کے وقت آکر اور حضرت کو تنہا پاکر بندوق کی گولی

---

[1] اصل نام شمس الدین ابن مرزا جان ہے شاہی نام جانِ جاناں اور تخلص مظہر ہے۔ محمد بن حنفیہ کی اولاد میں ہیں ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے مرزا کے والد اپنے عہد کے عالم تھے چنانچہ مرزا صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور حدیث کی سند محمد افضل سیالکوٹی سے حاصل کی نقشبندیہ سلسلے میں شاہ نور محمد بدایونی سے جو دہلی میں مقیم تھے چار سال تک کسب سلوک کر کے خرقہ اور اجازت حاصل کی۔ حضرت شاہ نور محمد بدایونی کے وصال کے بعد حضرت شاہ سعد اللہ اور حضرت عابد سنامی سے فیوض و برکات حاصل کئے استغنا اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا۔ نقشبندی مجددی شیخ ہونے کی وجہ سے شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے حسب معمول حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کے حالات بیان کرنے میں چٹکیاں لی ہیں۔ مرزا صاحب نے ایک مدت تک درس و تدریس کا مشغلہ بھی رکھا۔

"مدتہا درس علم ظاہر بطالبان گفتیم آخر چوں نسبت باطنی غلبہ کرد شغل کتاب متروک گردید"

سلسلۂ نقشبندیہ کے اجل مشائخ میں سے تھے اس زمانے میں سیاسی ابتری حد کمال کو پہونچی ہوئی تھی مرہٹہ گردی عروج پر تھی مرزا صاحب نے روہیل کھنڈ میں اکثر دورے کئے اہل روہیلکھنڈ کثرت سے مرزا صاحب کے سلسلہ بیعت و ارادت میں منسلک تھے مرزا صاحب سنبھل، مرادآباد، امروہہ، آنولہ، بریلی اور شاہ جہاں پور پہونچے تاکہ مرہٹوں کے خلاف اس علاقے کے لوگوں کو تیار کیا جائے اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا نجف خاں کے عہد میں فولاد خاں شیعہ نے محرم ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء میں شہید کر دیا میر قمر الدین منت نے "عاش حمیداً مات شہیداً" سے تاریخ نکالی ہے لوح مزار پر خود حضرت کا یہ شعر کندہ ہے۔

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہوں (۱) گل رعنا صفحہ ۱۲۰-۱۳۲ (۲) گلزار اولیاء صفحہ ۴۱-۴۷ (۳) آبحیات صفحہ ۱۳۷-۱۳۸
(۴) مقامات مظہری از شاہ غلام علی دہلوی مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء (۵) سرو آزاد ص ۲۳۲
(۶) کلمات طیبات مرتبہ ابو النجر محمد ابن احمد مرادآبادی بہ تصحیح حافظ فضل الرحمٰن مطبوعہ مطبع مجتبائی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء (۷) مرقع دہلی ص ۱۰۴-۱۱۰
(۸) خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۶۸۴ (۹) نزہۃ الخواطر جلد ششم ص ۵۰-۵۴

ماردی اس شیعہ لشکری نے یہ کام مذہبی تعصب کی بنا پر کیا اس زخم نے مرزا مظہر جان جاناں کو ان کے بزرگوں کے پاس پہونچا دیا۔ کہتے ہیں شاہ عالم نے اس سانحے کو سنکر انگریز ڈاکٹر کو معالجے کے لئے تجویز فرمایا اور نجف خاں کو تاکید کی کہ ان کے قاتل کو پکڑ کر قصاص کے لئے حضور میں پیش کرے۔ جناب مرزا نے اسی حالت میں بادشاہ کو یہ مضمون لکھا:۔

"دستِ شیعہ کے زخم کا علاج عیسائی سے کرانا اپنے کی شکایت غیر سے ہے جس کو میں اچھا نہیں سمجھتا اور نفیر کا قاتل اگر گرفتار ہو جائے تو اس کو فقیر ہی کے حوالہ کر دیں تاکہ بطریق معافی خود قصاص لے لوں"

سچ تو یہ ہے کہ خاندانِ آزادی کے امیرزادے ایسا ہی کرتے ہیں اور جس شخص نے یہ فعل شنیع کیا تھا وہ وہاں (دہلی) سے نکل کر فیض آباد پہونچا۔ خدا سب کو غضبِ بیجا کی پیروی سے محفوظ رکھے۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں علم و عمل اور زہد و تقویٰ سے متصف تھے۔ تورانی اور ہندوستانی مغل زادوں کی سی فارسی زبان میں ان کا ایک مختصر دیوان ہے جو کیف سے خالی نہیں۔

شیخ عبدالحق:۔ شیخ عبدالحق جہانگیری کا مزار ہے وہ محدث اور خدا پرست تھے جو لوگ ان کی تصانیف سے کچھ بھی لطف اندوز ہوئے علم حدیث اور سیرت کے حصہ دار بن گئے۔[1]

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ولادت ۹۵۸ھ ۱۵۵۱ء میں دہلی میں ہوئی والد کا نام شیخ سیف الدین تھا جو اپنے وقت کے مشہور مشائخ میں تھے شیخ امان اللہ پانی پتی کے مرید و مجاز تھے۔ شیخ عبدالحق نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی حفظ قرآن کے بعد درسی علوم کی تحصیل ماوراء النہر کے علماء سے کی علوم کی تحصیل و تکمیل کے بعد شیخ موسیٰ قادری کے ہاتھ پر بیعت کی حضرت شیخ عبدالحق کچھ دنوں فتحپور میں رہے ۹۹۶ھ ۱۵۸۷ء میں سفر حج کیا حجاز کے مشہور محدث حضرت شیخ عبدالوہاب المتقی سے علم حدیث کی تحصیل کی پھر ہندوستان آکر شیخ ہمہ تن نشر علوم حدیث تزکیۂ باطن اور بدینی و الحاد کے خلاف لسانی و قلمی جہاد میں مشغول ہو گئے حضرت شیخ عبدالحق تصانیف کثیرہ کے مالک تھے اپنی وفات سے ایک مدت پہلے خود انھوں نے اپنی تصانیف کی ایک فہرست "تالیف الالیف بکتابۃ فہرس التوالیف" کے نام سے لکھی تھی جو مطبع مجتبائی دہلی (۱۳۰۹ھ ۱۸۹۱ء) سے اور رامپور سے شائع ہوئی۔ شیخ عبدالحق کا انتقال ۱۰۵۲ھ ۱۶۴۲ء میں ہوا۔ تاریخ وفات فخر العالم ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے:۔

(۱) تذکرہ شیخ عبدالحق (۲) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی پروفیسر خلیق احمد نظامی و خواجہ برقی پریس دہلی ۱۹۵۳ء (۳) تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۲۷۶ - ۲۷۰ (۴) حدائق الحنفیہ صفحہ ۹ ۴ - ۱۲۴ (۵) رود کوثر صفحہ ۲۹۴ - ۲۳۱ (۶) آثار الصنادید صفحہ ۵ ، (۷) تذکرہ مصنفین اہل دہلی (مقدمہ) مرتبہ حکیم شمس اللہ قادری (حیدر آباد، دکن ۱۹۱۳ء (۸) سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان ص ۵۲ - ۵۳

شاہ ولی اللہ دہلوی :۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مزار[۱] ہے جو محمد شاہی وقت سے شاہ عالم کے زمانہ تک

---

[۱] قطب الدین احمد ابن شاہ عبدالرحیم فاروقی ۴ر شوال ۱۱۱۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے حضرت شاہ عبدالرحیم اپنے عہد کے نامی گرامی فاضل اور شیخ طریقت تھے بیٹا باپ سے زیادہ نامور اور فاضل ہوا مروجہ تعلیم اپنے والد سے حاصل کی ۱۴ سال کی عمر میں شادی ہوگئی سترہ سال کی عمر تھی کہ والد شاہ عبدالرحیم کا انتقال ہوگیا، والد ماجد کی وفات کے بعد مدرسہ رحیمیہ کے صدر نشین ہوئے ۱۱۴۳ھ ۱۷۳۰ء میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے شیخ ابوطاہر اور دیگر مشائخ حرمین شریفین سے علم حدیث میں استفادہ کیا حرمین شریفین سے ہندوستان واپس آکر ارشاد وہدایت کی مسند کو سنبھالا سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مذہبی زندگی بھی انحطاط پذیر تھی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے غور وفکر کے بعد مسلمانوں کی اصلاح وہدایت کے لئے ایک پروگرام مرتب کیا سیاسی طور سے ان کی بہبودی کے لئے اس دور کے نامور مسلم زعما اور سرداروں کو ایک نقطۂ نظر پر جمع کیا نجیب الدولہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے خاص طور پر متاثر تھا چنانچہ احمد شاہ ابدالی کی آمد اور مرہٹوں کی پسپائی میں شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی ہاتھ تھا۔

شاہ صاحب نے تمام علوم دینی قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف وغیرہ میں بڑی بیش قیمت تصنیفات چھوڑیں۔ حجۃ اللہ البالغہ، ازالۃ الخفاء، فوز الکبیر، فتح الرحمٰن، عقد الجید، الانصاف، تفہیمات الٰہیہ، المسوی، انفاس العارفین، قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین، البدور البازغہ، الجزء اللطیف، وصیت نامہ، رسالہ دانشمندی وغیرہ مشہور ومعروف تصانیف ہیں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک کو ان کے نامور صاحبزادگان حضرت شاہ عبدالعزیز شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین وغیرہ نے خوب آگے بڑھایا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا انتقال ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۲ء میں ہوا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔

(۱) انسان العین فی مشائخ الحرمین از شاہ ولی اللہ دہلوی مطبوعہ مطبع احمد دہلی

(۲) الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف از شاہ ولی اللہ دہلوی (اردو ترجمہ از محمد ایوب قادری الرحیم حیدرآباد سندھ اکتوبر ۱۹۶۲ء) (۳) تذکرۂ علمائے ہند صفحہ ۵۴۲ - ۵۴۵ (۴) حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۴۴ - ۴۴۸

(۵) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات از پروفیسر خلیق احمد نظامی (علیگڑھ)

(۶) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک از مولانا عبید اللہ سندھی (دین محمدی پریس لاہور ۱۹۴۲ء)

(۷) الفرقان بریلی کا شاہ ولی اللہ نمبر ۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء مرتبہ مولانا منظور احمد نعمانی

(۸) علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد دوم از محمد میاں (الجمعیۃ پریس دہلی، ۱۹۵۷ء) ص ۱ - ۴۲ (باقی صفحہ ۲۲۹ پر)

طلبہ اور مریدین کو فائدہ پہونچاتے رہے فن حدیث حاجی محمد افضل کی خدمت میں دہلی میں حاصل کیا اس کے بعد حرمین شریفین میں جاکر سند حدیث حاصل کی بہت سے رسائل اور کتابیں اُن کی تصنیف سے ہیں ہر ایک میں نئے فوائد بیان کرتے ہیں عقائد اور عقلیات میں دلائل کے پیرو ہیں اور اعمال و نقلیات میں حدیث اور اخبار متواتر اور قرآن کے تابع ہیں بات مجتہدانہ کہتے ہیں محض تقلید کی طرف نہیں دوڑتے ان کے بیٹے بھی ابھی تک وہی طریقہ رکھتے ہیں۔

قدم شریف :۔ ماہ ربیع الاول میں قدم شریف پر بہت زیادہ ہجوم ہوتا ہے اس کی اصلیت یوں ہے کہ اس پتھر پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کا نقش معجزے کے طور پر ہو گیا ہے روایت کے اعتبار سے اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے نادان لوگ وہاں پر ہجوم کرتے ہیں اور اس قدر تعظیم کرتے ہیں جو پیغمبر کے لئے بھی جائز نہیں اس پر سجدہ کرتے ہیں آنکھیں ملتے ہیں [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۸ سے آگے) (۹) حیات ولی اللہ از مولوی رحیم بخش دہلوی (مطبوعہ) (۱۰) تذکرہ شاہ ولی اللہ از مولانا مناظر احسن گیلانی مطبوعہ دو آبہ پریس لاہور ۱۹۴۶ء (۱۱) یادگار دہلی صفحہ ۹۸ - ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲ (۱۲) واقعات دار الحکومت حصہ دوم صفحہ ۵۸۴ - ۵۸۵ (۱۳) ابجد العلوم صفحہ ۹۱۲ - ۹۱۴ (۱۴) الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی بر حاشیہ کشف الاستار عن رجال معانی الآثار) مرتبہ مفتی محمد شفیع دیوبندی (جید برقی پریس دہلی بابت ۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء) (۱۵) امداد فی مآثر الاجداد (اردو ترجمہ محمد ایوب قادری) (الرحیم حیدرآباد سندھ مئی و جون ۱۹۶۶ء) (۱۶) کلمات طیبات ص ۱۵۸ - ۱۹۷

[1] لاہوری دروازے کے جنوب میں تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر (علاقہ صدر متصل سرائے خلیل، عید گاہ چھوٹی کھڑکی) یہ درگاہ ہے جو در حقیقت شہزادہ فتح خاں کی قبر ہے اس پر ایک پتھر نصب ہے اور اس پر ایک نقش قدم بنا ہوا ہے جس کا انتساب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کیا جاتا ہے اور قبر کے گرد مدرسہ، مکانات مسجد اور حوض تعمیر ہوئے یہ مقام زیارت گاہ خاص و عام ہے ہر سال ۱۲ ربیع الاول کو بڑی دھوم دھام سے اجتماع ہوتا تھا تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے بعد یہ سارا ہنگامہ ختم ہو گیا۔ مسجد، قبرستان، مدرسہ تمام عمارات پر ہندو شرنارتھی قابض ہیں۔ پختہ اور سنگ مرمری سیکڑوں قبریں مسمار کر دی گئی ہیں ۱۶ جولائی ۱۹۶۳ء بروز سہ شنبہ ہم نے خود اس جگہ کو دیکھا۔ قدم شریف کی تاریخی حیثیت وغیرہ کے سلسلے میں ہم نے اپنی کتاب مخدوم جہانیاں جہاں گشت میں تفصیلی بحث کی ہے اسے دیکھنا چاہیئے

مخدوم جہانیاں جہاں گشت از محمد ایوب قادری ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی ۱۹۶۳ء ص ۲۱۰، ۲۲۳

شاہ مردان:۔ ایک اور جگہ ہے جس کو شاہِ مرداں کہتے ہیں یہاں بھی قدم شریف کی طرح ماتمتوں کا دستور ہے[1]

جائے نشست:۔ جامع مسجد کے حوض کے کنارے پر ایک جگہ ہے کسی کو اس مقام پر بیٹھنے نہیں دیتے اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ یہاں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا ہے سبحان اللہ لوگ مکہ اور مدینہ جاتے ہیں وہاں پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نشست کے مقامات پر بیٹھنے سے کسی کو منع نہیں کیا جاتا اور یہاں صرف خواب میں دیکھنے کی روایت پر یہ ممانعت ہے بیوقوف یہ نہیں سمجھتے کہ اُن (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد دینی اُمور میں اپنی طرف سے کوئی حکم یا مخالفت کرنا اُن (رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کی مسند پر غاصبانہ بیٹھنا اور اسلام سے خارج ہونا ہے[2]

---

[1] ادہم بائی زوجہ محمد شاہ بادشاہ جس کو احمد شاہ کی سلطنت میں اول نواب بائی اور پھر نواب قدسیہ صاحب زمانی کا خطاب ملا شیعہ مذہب کی پیروتھی ۱۱۶۳ھ میں ادہم بائی کے پاس ایک پتھر آیا جس پر ایک نقشِ قدم تھا بیان یہ کیا گیا کہ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نقشِ قدم ہے ادہم بائی نے اس نقشِ قدم کو سنگِ مرمر کے حوض میں نصب کروادیا اس حوض کے نیچے سنگِ مرمر کا فرش کرکے مجّر بنوایا اور اس کے کنارے پر یہ شعر کندہ ہے

برزمینے کہ نشان کفِ پائے تو بود سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

احمد شاہ کے زمانہ (۱۱۶۱ھ) میں ادہم بائی نے اپنے خواجہ سرا جاوید کے اہتمام سے چہار دیواری، مجلس خانہ، مسجد، اور حوض بنوایا ہر مہینے کی ۲۲ تاریخ کو یہاں مجلس ہوتی ہے اور رمضان المبارک کی بیس تاریخ کو بہت ہجوم ہوتا ہے۔

(۱) مرقع دہلی ص ۳۰۲ (۲) آثار الصنادید باب اول ص ۸۰ (۳) یادگار دہلی ص ۲۲۰، ۲۲۱

[2] جامع مسجد کے صحن کے عین وسط میں فرش سے ایک ہاتھ اونچا ۱۵×۱۲ گز سنگ مرمر کا ایک حوض ہے جس میں سنگِ موسیٰ کی سیاہ تحریریں سنگ مرمر کی سفیدی کو بہت رونق دیتی ہیں ؎

در ابلق کسے کم دیدہ موجود مگر اشکِ بتانِ سرمہ آلود

حوض کے مغربی گوشے پر ایک چھوٹا سا رنگ مرمر کا کٹہرا محمد حسین خاں محلی خواجہ سرا کا بنوایا ہوا ہے وجہ یہ ہے کہ علیٰ روایت العوام حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقام پر بیٹھے ہوئے خواب میں دیکھا گیا تھا اور اس کٹہرے کے اندر یہ اشعار کندہ ہیں (باقی صفحہ ۲۳۱ پر)

نظام الدین اولیاءؒ:- ایک مزار نظام الدین اولیاء کا ہے جو بدایوں کے قاضی زادے[1] تھے علوم رسمیہ حاصل

(حاشیہ صفحہ ۲۳۰ سے آگے) کوثر محمد رسول اللہ ~~۱۱۹۸ھ~~ ۱۷۸۴ء

رسول دیدہ اندایں جا ولی و اہل اللہ   بجاست گر شود ایں سنگ ہم زیارت گاہ

بنائے سال وتحسین و آفریں ہاتف   بگفت احاطہ جائے نشست رسول اللہ

(۱) آثار الصنادید باب سوم ص ۱۰ (۲) یادگار دہلی ص ۳۹ (۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۱۰۶

[1] شہر بخارا کے دو بزرگ علی بخاری و عرب بخاری ترک وطن فرما کر شمس الدین التمش کے عہد میں لاہور ہوتے ہوئے بدایوں آئے یہ دونوں بزرگ سگے بھائی تھے علی بخاری کے صاحبزادے احمد اور عرب بخاری کی صاحبزادی زلیخا تھیں۔ بعد کو ان دونوں لڑکے اور لڑکی کو ازدواجی رشتہ میں منسلک کر دیا گیا جن کے نور عین شیخ نظام الدین اولیاء بدایونی صفر ۶۳۱ھ/۱۲۳۴ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے بدایوں میں حضرت کے مکانات متصل ستید باڑہ چنگی ٹیلہ پر اس جگہ پر تھے جہاں آج کل کالے رہتے ہیں وہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے حضرت نظام الدین اولیاء کے بچپن ہی میں ان کے والد احمد کا انتقال ہو گیا (۶۳۵ھ/۱۲۳۸ء) اور ان کا مزار ساہو تال (بدایوں) کے قریب نہایت پُر فضا مقام پر واقع ہے مسجد، گنبد اور چہار دیواری کی تعمیر حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے کرائی تھی حضرت نظام الدین اولیاء کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے بہ احسن وجوہ فرمائی بچپن میں مسجد محلہ سوتھہ (بدایوں) میں بیٹھ کر مطالعہ فرمایا کرتے تھے چنانچہ اس مسجد میں ایک طاقچہ بطور یادگار موجود ہے نظام الدین نہایت ذکی و ذہین تھے بحث و مباحثہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اسی لئے ان کا لقب بحاث اور نظام محفل شکن مشہور ہو گیا حضرت نظام الدین اولیاء نے قرآن شریف کا ایک پارہ حافظ شادی مقری بدایونی سے پڑھا اس کے بعد مولانا علاؤ الدین اصولی سے پڑھا کتاب مشارق الانوار کی سند مولانا کمال الدین سے حاصل کی بدایوں میں جب انھوں نے علوم سے فراغت پائی تو علماء و مشائخ وقت کے سامنے دستار بندی ہوئی بدایوں کے ایک عالم اور صاحب باطن بزرگ مولانا علی ناصحؒ بدایونی نے اپنے ہاتھ سے حضرت نظام الدین اولیاء کے سر پر دستار باندھی یہ دستار حضرت کی والدہ نے خود سوت کات کر بنوائی تھی پھر مزید علوم کی تکمیل دہلی پہونچ کر حضرت مولانا شمس الدین خوارزمی سے فرمائی۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں جب اجودھن حاضر ہوئے تو وہاں حضرت بابا صاحب سے چند پارے کلام اللہ کے اور کچھ کتابیں پڑھیں حضرت بابا صاحب سے نظام الدین اولیاء بدایونی بیعت ہوئے اجازت و خلافت سے سرفراز ہوئے، مخلوق کی ہدایت کے لئے حسب الحکم حضرت بابا صاحب، نظام الدین اولیاء دہلی پہونچے، موضع غیاث پور میں قیام کیا اور مخلوق الٰہی کی ہدایت و رہنمائی میں مصروف ہوئے سلسلہ چشتیہ نظامیہ (باقی صفحہ ۲۳۲ پر)

کرنے اور بحاث (بہت بحث کرنے والا) کا لقب پانے کے بعد دہلی پہونچے تاکہ عہدۂ قضا کی سعی حاصل کریں قسمت نے ان کو فقر کی جانب کھینچا اور اجودھن میں جاکر شیخ فریدالدین گنج شکر کی خدمت میں اصلاح نفس کی پھر دہلی میں آکر دوسروں کو فائدہ پہونچایا۔

مجحر محمد شاہ بادشاہ:۔ محمد شاہ بادشاہ کی قبر بھی وہیں (درگاہ نظام الدین اولیاء میں) ہے [1]

(حاشیہ صفحہ ۲۳۱ سے آگے) کے بانی ہوئے۔ خواجہ حسن سنجری، امیر خسرو، نصیر الدین چراغ دہلوی جیسے اجل مشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفا میں ہیں حضرت نظام الدین اولیاء کا وصال ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء کو ہوا۔ مزار غیاث پور بستی نظام الدین اولیاء میں ہے مسجد کی دیوار پر تاریخ وفات کندہ ہے:۔

نظام دو گیتی شہ ماہ و طین	سراج دو عالم شدہ بالیقین
چو تاریخ فوتش بہ جستم زغیب	ندا داد ہاتف شہنشاہ دیں

۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔

(۱) تذکرۃ الواصلین از مولوی رضی الدین بسمل بدایونی (نظامی پریس بدایوں)

(۲) سیر الاولیاء صفحہ ۹۱ - ۱۵۵ (۳) سفینۃ الاولیا صفحہ ۱۳۳ - ۱۳۴

(۴) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۴۹ - ۵۸، (۵) بزم صوفیا صفحہ ۱۸۰ - ۱۳۳

(۶) سیر العارفین صفحہ ۵۹ - ۹۱ (۷) مونس الارواح ص ۱۰۰ - ۱۱۰

(۸) اخبار الاخیار ص ۶۰ (۹) خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۳۲۸

[1] درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے احاطے کے صحن میں محمد شاہ بادشاہ کا مجحر ہے یہ بادشاہ ایسے زمانہ میں تخت نشین ہوا جبکہ سارے ملک میں بدنظمی اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ باج گذار راجاؤں اور امراء نے علم بغاوت بلند کر رکھا تھا سب سے بڑی مصیبت نادر شاہ کا حملہ تھا، جو دہلی کو تباہ کر گیا محمد شاہ، حملۂ نادری کے بعد آٹھ سال تک زندہ رہا۔ انتقال کے بعد درگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں دفن ہوا۔

قطعہ تاریخ وفات

شہ فلک حشم و روشن اختر آں کہ از د	چو آفتاب جہاں جلگی فروغ گرفت
چو شد بجادۂ فردوس زیں سرائے سپنج	سرود ہاتف غیبی کہ گو بجنت رفت"

۱۱۶۱ھ ۱۷۴۸ء

(باقی صفحہ ۲۳۳ پر)

حجرِ جہاں آرا بیگم :- شاہی خاندان کی بیگمات میں سے ایک بیگم کی قبر بھی وہاں موجود ہے قبر کا ایک شعر یہ ہے [5]

(حاشیہ صفحہ ۲۳۲ سے آگے) حجرِ محمد شاہ کا احاطہ مستطیل ۲۰×۱۲ فٹ ہے جس کے چاروں گوشوں پر سنگِ مرمر کے چھوٹے چھوٹے منارے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی حجر کی تمام تعمیر سنگِ مرمر سے ہوئی ہے اس کی نفاست و خوبصورتی کے سلسلے میں سرسید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:

> "نفاست اور لطافت اس کی بیان سے باہر ہے گل بوٹے پتے بہ منبت کاری کے ایسے خوب بنائے ہیں کہ گویا کار سامری ہے نگار خانۂ چین بھی اس کے آگے مات ہے جالیاں سنگِ مرمر کی ایسی تحفہ بنی ہوئی ہیں کہ بیان سے باہر ہے بے تامل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آسمان سے تارے جگمگ کرتے ہیں اور کبھی معلوم ہوتا ہے کہ چادر نور ہے کہ گرد قبر کے تان دی ہے"

(۱) اخبار الصنادید باب اول ص ۳۹ (۲) یادگار دہلی ص ۲۰۲ (۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۹۶، ۹۷-۹۷

(۴) تاریخ بادشاہان دہلی از مولوی مقبول احمد ابن مولوی قدرت احمد گوپاموی (مطبع حسنی میر حسن رضوی لکھنؤ ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء) ص ۱۵

[5] یہ حجرِ جہاں آرا بیگم بنت شاہ جہاں بادشاہ کا ہے جہاں آرا بیگم حسن و جمال و عقل و فراست میں مشہور زمانہ تھی تعلیم نہایت اعلیٰ ہوئی تھی مشائخ چشت کے حالات میں اس نے مونس الارواح کتاب لکھی۔ شاہجہاں بادشاہ کے زمانۂ نظر بندی میں وہ بھی باپ کے ساتھ آگرہ کے قلعے میں رہی اورنگ زیب نے ناراض ہو کر جہاں آرا بیگم کے کچھ معمولات بھی بند کر دیئے تھے شاہ جہاں نے ۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۶ء میں انتقال کیا باپ کے انتقال کے پندرہ سال بعد جہاں آرا بیگم نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ جہاں آرا بیگم نے اپنی زندگی ہی میں زمین خرید کر سنگِ مرمر کا حظیرہ بنوایا جہاں آرا بیگم کی قبر کے سرہانے ایک پتلی سی سنگ مرمر کی تختی نہایت خوشنما لوح کی کھڑی ہے جس پر بخط عربی سنگ موسیٰ کی پچیکاری سے درج ذیل نہایت خوشخط کتبہ بنایا گیا ہے کہا جاتا ہے کہ یہ شعر خود شہزادی مرحومہ کا ہے۔

هو الحی القیوم

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا   کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

الفقیرۃ الفانیہ جہاں آرا مرید خواجگان چشت بنت شاہ جہاں بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء (۱) اخبار الصنادید باب اول ص ۳۸

(۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۹۴، ۹۵، (۳) یادگار دہلی ص ۲۰۲ (۴) بزم تیموریہ از صباح الدین عبد الرحمن ص ۴۴، ۴۵ (مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء)

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا	کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است
میرے مزار کے چادر نہ کبھی پاس رہی	ہمیشہ گور غریباں پہ اُگی گھاس رہی

باؤلی :- وہاں (درگاہ نظام الدین اولیا) پر ایک کنواں ہے جس کو ہندوستان میں بہ اختلاف لہجہ باؤلی اور باوری کہتے ہیں یہ کنواں بہت گہرا ہے اور اس کے کنارے پر اونچے اونچے درخت ہیں شہر کے فاقہ مست، شرابی اور جواری مردے کی نعش اُٹھاتے اور قلم ہاتھ میں لیکر سواری کے ساتھ چلتے ہیں اور کل کے لئے اپنے پاس ایک پائی نہیں رکھتے ہیں ان درختوں پر بیٹھ جاتے ہیں لوگ ان کو پیسہ دکھا کر پانی میں ڈال دیتے ہیں وہ لوگ اتنی جلدی اس میں کود تے ہیں کہ پیسے کو تہ میں نہیں پہونچنے دیتے اور ہاتھ میں لاکر پھینکنے والے کو دکھاتے ہیں اور رکھ لیتے ہیں مگر یہ گروہ چوری اور خیانت نہیں کرتا لہ

لہ یہ باؤلی حضرت شاہ نظام الدین اولیاء نے غیاث الدین تغلق کے زمانے میں تعمیر کروائی تھی اس باؤلی کے چاروں طرف دیوار سا پختہ بندش ہے اور شمال کی جانب اُترنے کی سیڑھیاں ہیں جو باؤلی کی تہ تک چلی گئی ہیں یہ باؤلی کمل سنگ خارا کی بنی ہوئی ہے باؤلی کے جنوبی رُخ کی تمام عمارات فیروز شاہ کے عہد کی بنی ہوئی ہیں یہاں ایک نہایت بدخط کتبہ بخط عربی یہ ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعہد دولت شاہ معظم | خجستہ خسرو اولاد آدم
موفق گشت از حق بندہ معروف | اساس ایں عمارت کرد محکم
وحید الدین قریشی والامن | کہ باہل ارادت بود ہمدم
مرا چوں بر در پیش شیخ عالم | بدست خود گرفت و کرد نا مم
رجا دارم کہ انفاس مبارک | درآں عالم بود معروف پرچم
مدار دین احمد شاہ فیروز | شہ صاحب قران سلطان اعظم
جوار روضۂ شیخ المشائخ | نظام الحق والدین قطب عالم
بحسن اعتقاد و صدق اخلاص | دراسرار ولی واللہ محرم
بلفظ خود مرا معروف خواندہ | دریں عالم چو شیخ عیسوی دم
بخواں تاریخ اتمام عمارت | دریں جا چوں بیائی خیر مقدم
مرتب شد بنا واللہ اعلم | ز ہجرت ہفتصد ہشتاد و یک بود

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی صفحہ دوم صفحہ ۸۰۴ - ۸۰۶

(۲) یادگار دہلی ص ۹۹

(۳) آثار الصنادید باب اول ص ۴۲ - ۴۴

کوٹلہ فیروز شاہ :- مشہور مکانوں میں سے کوٹلہ فیروز شاہ ہے اس میں ایک مینار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی پتھر ہے اس کی لمبائی چوڑائی اس کا انکار کرتی ہے کیونکہ اتنے بڑے پتھر کو کھڑا نہیں کر سکتے اور اگر سب پہاڑ ہو اور اس کو تراش تراش کر اسے چھوڑ دیا ہو تو یہ بھی تعجب کی بات ہے [1]

مقبرہ ہمایوں :- ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ ہے اس میں ایک ایسی جگہ ہے کہ آدمی اس میں راستہ بھول جاتا ہے، کیونکہ تمام راستے ایک دوسرے کے مشابہ اور پیچ در پیچ ہیں اس کو بھول بھلیاں کہتے ہیں [2]

---

[1] فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء میں فیروز آباد کے نام سے دہلی سے متصل ایک نیا وسیع شہر تعمیر کیا جو نہایت شاندار تھا، مدرسے، حمام، سرائیں، حویلیاں اور محلات تعمیر ہوئے ایک محل "کوشک فیروز شاہ" یا "فیروز شاہ کا کوٹلہ" کے نام سے مشہور ہے یہ عمارت اب بالکل ختم ہو گئی صرف اس کوٹلے کی فصیل کہیں کہیں باقی ہے جو دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا اعلان کر رہی ہے۔ یہ فصیل ۹ فٹ بلند ہے کوٹلے کے عجائبات میں سے تین بڑی بھاری اور لمبی لمبی شہ نگیں ہیں ان کے علاوہ کوٹلے میں دو نادر چیزیں بھی قابل دید ہیں ایک فیروز آباد کی بے نظیر مسجد جو فیروز شاہ نے بنوائی ہے اور دوسرے اشوکا کی لاٹ جو عموماً فیروز شاہ کی لاٹ کہلاتی ہے۔

سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں "سرکار دولتمدار انگریزی نے اس کوٹلہ کے توڑنے کا حکم دیا ہے اور جہاں کہیں پتھر کی خواہش ہوئی ہے یہاں سے ٹوٹ کر جاتا ہے عنقریب یہ بھی نیست و نابود ہو جائے گا اور قلعوں کی طرح اس کو بھی کوئی نہیں جانتا کہ کیا تھا اور کیا ہوا" (آثار الصنادید باب چہارم صفحہ ۷)

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی مولف واقعات دار الحکومت دہلی (حصہ دوم) نے فیروز شاہ کے کوٹلے کا مفصل ذکر کیا ہے

(۱) واقعات دار الحکومت (۲) یادگار دہلی ص ۱۸۶ - ۱۸۷ (۳) آثار الصنادید باب اول صفحہ ۵۱-۵۲ باب چہارم صفحہ ۶-۷

[2] ہر کہ می خواہد کہ بیند شکل فردوس بریں　　گو بیا ایں قصر ایں باغ ہمایوں را ببین

۱۱ ربیع الاول ۹۶۳ھ/۱۵۵۶ء کو ہمایوں بادشاہ نے کوٹھے سے گر کر انتقال کیا اور اس مقبرے میں جو شہر دہلی سے تقریباً پانچ میل جنوب کی طرف موضع کیلوکھڑی کی حدود میں ہے دفن کیا گیا بادشاہ کی حرم محترم حمیدہ بانو بیگم ملقب بہ مریم مکانی المعروف بہ نواب حاجی بیگم صاحبہ نے جو اکبر بادشاہ کی والدہ تھیں اپنے شوہر کا بے نظیر مقبرہ تعمیر کرایا جس کی تکمیل ۹۷۳ھ/۱۵۶۵ء میں ہوئی ہمایوں کا مقبرہ نہایت عالی شان اور قابلِ دید ہے عمارت سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے بنی ہے ہمایوں کا مقبرہ دراصل خاندانِ تیموریہ کی ہڈوارا ہے۔ حمیدہ بیگم داراشکوہ، فرخ سیر، جہاندار شاہ، رفیع الدولہ، رفیع الدرجات عالمگیر ثانی وغیرہ اسی مقبرہ میں آسودہ خواب ہیں (بقیہ صفحہ ۲۳۶ پر)

مقبرہ صفدر جنگ:۔ مقبرہ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کا ہے جس کی اولاد اودھ میں حکمران ہے [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۵ سے آگے) آخری تاجدار مغلیہ سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اسی مقبرے میں پناہ لی تھی۔ بلکہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد دہلی میں ہندوؤں نے اپنی طے شدہ اسکیم کے تحت جب مسلمانوں کا قتل عام کیا اور دہلی سے نکلنے پر مجبور کر دیا اس وقت بھی مسلمانوں نے مقبرہ ہمایوں ہی میں پناہ لی تھی۔ لارڈ کرزن کے زمانہ میں محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے ہمایوں کے مقبرہ کی مرمت و درستی ہوئی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے:۔

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی ص ۶۸۰، ۶۷۸ (۲) یادگار دہلی ص ۱۹۶-۱۹۷

[1] ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۶ھ کو پاپڑ گھاٹ ضلع سلطان پور میں انتقال ہوا اول (گلاب باڑی) فیض آباد میں دفن کیا گیا تھوڑے دنوں کے بعد صفدر جنگ کی لاش نکال کر دہلی لائی گئی اور شاہ مرداں کے متصل دفن کیا گیا صفدر جنگ احمد شاہ بادشاہ دہلی کا وزیر تھا یہ مقبرہ سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے اور جا بجا سنگ مرمر کی دھاریں اور چوکے لگے ہوئے ہیں اس کا تمام برج سنگ مرمر کا ہے اور قبر کا تعویذ بھی سنگ مرمر کا ہے۔ ایک تہ خانہ میں اصل قبر بنی ہوئی ہے یہ مقبرہ شیدی بلال محمد خاں کے اہتمام سے تین لاکھ روپے میں تیار ہوا ہے مقبرہ کے اندر یہ تاریخ کندہ ہے:۔

چو آں صفدر عرصۂ مردمی ز دار فنا گشت رحلت گزیں
چنیں سال تاریخ او شد رقم کہ بادا مقیم بہشت بریں
۱۱۶۶ھ

دہلی کی سیاست میں صفدر جنگ کا خاص ہاتھ رہا ہے صفدر جنگ نے افاغنہ روہیل کھنڈ کی بیخ کنی کی ہمیشہ تدابیر کیں حکیم نجم الغنی خاں رامپوری لکھتے ہیں:۔

"وہ خدا و رسول و قرآن و پنجتن کو درمیان میں واسطہ کرکے عہد و پیمان باندھتے اور پھر بے سبب وعدہ خلافی کر جاتے اور جہاں تک دھوکے اور دغا سے کام نکلتا تھا جرأت و دلاوری سے کام نہیں لیتے تھے۔" (اخبار الصنادید حصہ اول ص ۲۹۰)

تفصیلات کے لئے دیکھئے:۔ (۱) آثار الصنادید باب اول ص ۸۸ (۲) یادگار دہلی ص ۲۱۹
(۳) تاریخ اودھ حصہ اول ص ۲۹۴-۲۹۷
(۴) مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (گذشتہ لکھنؤ) از عبد الحلیم شرر لکھنوی (کراچی ۱۹۶۵ء) ص ۶۱-۶۲

جنتر منتر: شہر پناہ کے اندر نواب سعادت خاں برہان الملک کی حویلی ہے جو بادن چوکی کے نام سے مشہور ہے اور صفدر جنگ کا دیوان خانہ معروف بہ دلکشا[1] اور غازی الدین خاں کی حویلی نہایت کشادہ ہیں، شہر سے باہر ایک رصدگاہ ٹوٹی ہے جس کو جنتر کہتے ہیں اب اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا[2]

خواجہ قطب الدین کاکی: اس مینار کے قریب جو ہاپوڑ سے جمنا کی جانب نظر آتا ہے خواجہ قطب[3] الدین کاکی کا مزار ہے کہتے ہیں کہ شمس الدین ایک مسجد بنوا رہا تھا یہ اس کا ایک مینار ہے۔

---

[1] سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:

"یہ حویلی بہت عمدہ اور نہایت بڑی آراستہ نہر جاری اور فوارہ اور اس حویلی کے پاس ایک حمام ہے اور ہر سال جاڑے میں گرم ہوتا ہے۔" (آثار الصنادید باب سوم ص ۲۹)

[2] یہ رصدگاہ سوائی راجہ جے سنگھ والی جے پور نے محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء میں بنوائی تھی بڑے بڑے ہندو اور مسلمان ریاضی داں اس میں شریک تھے خوبی ان آلات کی دیکھنے سے علاقہ رکھتی تھی اکثر آلات رصد ٹوٹ گئے ۱۸۵۲ء تک چار آلات رصد باقی تھے سر سید احمد خاں بہادر نے لکھا ہے:

"افسوس ہے کہ یہ آلات عالی جن کا ہونا مغتنمات سے تھا نہایت بے مرمت پڑے ہیں اور بہت جگہ سے شکستہ ہو گئے ہیں رصد خانے کے بدلے یہ جگہ براز خانہ ہو گیا ہے ہر ہر زاویہ اور ہر ہر مدویر اور درجہ اور دقیقہ میں نو نو من گوہ کا ڈھیر ہو گیا ہے۔ ایسی عفونت یہاں تھی کہ نقشہ کھینچنے کو ٹھہرنا مشکل پڑا تھا۔"

(۱) آثار الصنادید باب اول ص ۹۰ (۲) یادگار دہلی ص ۲۱۸

[3] حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے والد کا نام کمال الدین تھا ماوراء النہر کے قصبہ اوش میں پیدا ہوئے حضرت خواجہ کاکی حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے اکابر خلفا میں سے تھے خواجہ قطب الدین کاکی نے شمالی ہند میں چشتیہ سلسلہ پھیلانے میں بہت سعی فرمائی اور انھوں نے عہد التمش میں دہلی آکر ارشاد و تلقین کا ہنگامہ برپا کر دیا حضرت خواجہ کاکی کا وصال ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء کو ہوا مفصل حالات کے لئے ملاحظہ ہو:

(۱) تاریخ مشائخ چشت ص ۱۴۳، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۰ (۲) خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۲۷۴، ۲۷۶

(۳) اخبار الاخیار ص ۱۵، ۳۰ (۴) آثار الصنادید ص ۷۵-۷۶ (۵) دلیل العارفین خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء)

(۶) سیر العارفین ص ۱۶-۲۱ (۷) سفینۃ الاولیاء ص ۴۸-۵۷

حوضِ شمسی:- ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کو حوضِ شمسی کہتے ہیں تالاب کے اندر ایک چھوٹا سا مکان ہے جس کی چھت گول ہے کہتے ہیں کہ بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں وضو کیا ہے اور صبح کو اسی مقام پر نئی گھاس جمی ہوئی پائی تعمیر میں وہ جگہ چھوڑ دی ہے کاش اگر مقام کو اپنا دل اور وضو کو اس کی طہارت کا حکم سمجھکر دل کی تعمیر کی کوشش کرتا تو اس کی بنیاد پائدار ہوتی لیکن بادشاہ ہو یا فقیر ہر ایک اسی تصنع اور بناوٹ کو صحیح سمجھتا ہے اور عالم ارواح کے تخت نشینوں کو بھی اس خاکدان کی اشیاء کا نیاز مند خیال کرتا ہے[1]

کیلی:- دھات کا ایک ستون ہے جس کا حلقہ دو ہاتھ سے کچھ کم ہوگا اس کو کیلی کہتے ہیں اس کی اصلیت کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں کوئی کہتا ہے کہ یہ اس مسجد کے دائرہ ہندی (دھوپ گھڑی) کی کیلی ہے جس کے مینار بہت بلند تھے مگر وہ مخروطی نہیں ہے دوسرے لوگ تواریخ ہنود سے نقل کرتے ہیں کہ راجہ پرتھی راج نے برہمنوں سے کہا تھا کہ کوئی ایسا جادو کرو کہ ہمارے خاندان سے سلطنت نہ جائے انھوں نے کہا کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اگر اس وقت اس سانپ کے سر میں جس کے اوپر تمام زمین ہے ایسی کیلی ٹھونک دیں کہ وہ نہ ہل سکے تو یقیناً تیرے خاندان سے سلطنت زائل نہ ہوگی راجا نے اس کے بنانے کا حکم دیا، کیلی

---

[1] سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:-

"یہ حوض بھی عجائب روزگار سے تھا اس واسطے حوض شمسی کر کے مشہور ہے کسی زمانہ میں یہ حوض تمام سنگ سُرخ سے بنا ہوا تھا اب (۱۲۶۳ھ) دیواریں اور پتھر بالکل اُکھڑ گئے ہیں اور تالاب کی سی صورت رہ گئی ہے اسی واسطے اس حوض کو لوگ قطب صاحب کا تالاب کہنے لگے اور بعضے تالاب شمسی کہتے ہیں اسی تالاب میں سے جھرنے میں پانی جاتا ہے اور اسی کا پانی تغلق آباد کے قلعے کی خندق میں گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ اتنا بڑا حوض شاید روئے زمین پر نہ ہوگا اب بھی یہ تالاب دو سو چھتر بیگہ ۸ بسوہ پختہ ہے"

سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنے دورِ حکومت میں اس حوض کی مرمت کرائی اور پانی آنے کے راستے صاف کرائے۔ تقریباً ۱۸۹۶ء میں ڈپٹی کمشنر ڈیوس نے اس حوض کو کسی قدر صاف کرایا تھا۔ جس میں کچھ پانی جمع ہونے لگا تھا مگر بعد کو پھر یہ تالاب پٹ گیا۔

(۱) آثار الصنادید باب اول صفحہ ۳۰-۳۱
(۲) یادگار دہلی صفحہ ۲۴۹
(۳) فتوحات فیروز شاہی (علی گڑھ ایڈیشن) صفحہ ۱۵

بنائی گئی اور ٹھونکی گئی راجا نے کہا مجھے یقین نہیں آتا اس کو نکالو ہرچند ان لوگوں نے کہا کہ پھر یہ گھڑی ہاتھ نہ آئے گی راجا نے اصرار کیا کیلی کو نکالا گیا دیکھا کہ خون آلود ہے افسوس ہوا ۔ اس کے جائے وقوع کا پتہ لوگ وہاں تک بتاتے ہیں جہاں کیسل اُکھڑی (کیلو کھڑی) محلہ آباد ہے پھر وہاں سے دوسری جگہ لیجا کر اس کو نصب کیا گیا ہے۔

یہ بھی عجیب کہانی ہے کہ ہندوؤں کے نزدیک ساری زمین سانپ پر ہے یہ میخ یا تو قطر زمین سے زیادہ ہوگی یا وتر سے جو لمبائی میں قطر سے کچھ ہی فرق رکھتا ہے اور میخ کی چوڑائی کا طول چین سے دیار مغرب تک پھیلا ہوا ہوگا ۔ نیز برہمنوں نے اس کام کی کیونکر جسارت کی جب کہ بھاگوت کے بارھویں اسکندھ میں جو ان کے نزدیک آسمانی کتاب ہے سلطنت دہلی کا قوم ہنود سے دوسری قوموں میں منتقل ہونا مذکور ہے نیز راجہ جنمی جی کے قصے کے مطابق جو سانپوں کو مارتا تھا کلجگ کے زمانے میں جادو کا اثر نہیں رہا کیونکہ کہتے ہیں کہ مہادیو نے جادو کے تمام الفاظ کو ایسا منتشر کر دیا کہ پھر کوئی درست کر ہی نہیں سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جنگ کے ہتھیاروں میں کا ایک ہتھیار ہے جو دریودھن اور جدھشٹر میں کروکشیتر کے میدان میں ہوئی تھی اس کو کسی نے لا کر یہاں کھڑا کر دیا ہے ان لوگوں کی بعید از خیال طاقت سے قطع نظر کرکے کہ ایسی مستبعد باتیں ہر فریق کی تاریخوں میں ہیں ایک بات اور غور طلب ہے کہ مسلمان سلاطین ہندوؤں کے بیکار ہتھیار کو کیوں ایستادہ کراتے اور اگر ہنود نصب کراتے تو اس کی پوجا لازمی ہوتی اور اگر مسلمانوں کے خوف سے پوجا کچھ عرصے تک چھوڑے رہے ہوتے تو ضعف سلطنت کے زمانے میں ضرور رواج دے لیتے [۱]

---

[۱] سرسید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں :۔" اس لاٹ کا کچھ حال تحقیق نہیں ہوتا کہ یہ کیا چیز ہے اور کس کے وقت کی بنی ہوئی ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ بہت قدیم ہے اس واسطے کہ اس پر اگلے حرفوں اور اگلی زبان میں کچھ عبارت کندہ ہے کہ وہ پڑھنے میں نہیں آتی .... یہ لاٹ عجائب روزگار ہے سر پاؤں تک ایک لوہے کی ڈھلی ہوئی ہے اسکو دیکھ کر آدمی کی عقل حیران ہوتی ہے کیونکر بنی ہوگی اور کس طرح کھڑی کی گئی ہوگی جبکہ میں نے اس مقام کا نقشہ (باقی صفحہ ۲۳۰ پر)

بسنت :۔ اس دار السلطنت اسلام (دہلی) میں بہت سی بدعتیں رائج ہیں جن میں ایک رسم بسنت بھی ہے جو ہندوؤں کا بڑا دن ہے طرفہ تر یہ ہے کہ اس بیہودہ عمل کا زیادہ تر اہتمام صلحاء کی قبروں اور مشائخ کی محفلوں میں ہوتا ہے ہندوؤں میں اس کی تعظیم اس قدر نہیں ہوتی جتنی کہ شہر کے مشائخ میں ہوتی ہے جب گلدستوں کو مطرب لاتے ہیں تو سب بزرگ استقبال کرتے ہیں اور مجلس سماع و وجد گرم ہوتی ہے یہ تو معلوم نہیں کہ اس کی ابتدا کتنی مدت سے ہوئی مگر رقعات عالمگیری میں اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے بیٹے کو اس معاملے میں ہدایت کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں صلحاء میں چنداں شورش نہ تھی [۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۹ سے آگے) کھینچا تو اس لاٹ کو بھی ناپا فٹ سے بھی اور اصطرلاب کے عمل سے بھی کل اونچائی اس کی بائیس فٹ چھ انچ کی نکلی اور جڑ کی موٹائی پانچ فٹ ۲ انچ کی مدور معلوم ہوئی ۔

(۱) آثار الصنادید باب اول ص ۵۹ - ۶۱

[۱] ۵۱-۱۱۵۰ھ / ۳۸-۱۷۳۷ء میں درگاہ قلی خاں نے دہلی میں بسنت کی جو کیفیت دیکھی ہے اس کو مرقع دہلی میں تفصیل سے قلم بند کیا ہے بسنت کے پہلے روز قدم شریف میں اجتماع کی حالت یوں لکھی ہے :۔

"عجب ہنگامہ صبح آں روز جمیع سکنۂ شہر بہ تقطیع و تزئین پرداختہ در راستہائے آں بہارستان فیض بزنگینی خیابان دو طرفہ فرش ملون گستردہ و بآرائش اماکن جلوہ گری شوند و در حوالی صحن آں سعادت کدہ بریکدگر سبقت جستہ بساط تفرج و انبساط می گسترند و چشم براہ قوالان و مجرائیاں : زائراں می باشند و انتظار می کنند کہ دریں صحن در صحن قوالاں و نغمہ سرائیاں شہر بہ تجمل تمام و تزئین مالا کلام اقسام گلدستہ با ترتیب دادہ و ریاحین متنوعہ را در کوزہ ہا گذاشتہ جہت نیاز روح مقدس سرور کائنات علیہ افضل الصلوات بکمال خضوع و خشوع در ہر قدم زمزمہ سنجان و در ہر خطوطین ترانہ طرازاں بتانی ہر چہ تمام تر رہ نورد می شوند"

دوسرے روز یہ اجتماع درگاہ خواجہ قطب الدین کاکی کی درگاہ میں اور درگاہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی میں روز سوم درگاہ سلطان المشائخ میں روز چہارم درگاہ حضرت شاہ حسن رسول نما میں روز پنجم درگاہ حضرت شاہ ترکمان میں ہوتا ہے اختتام یوں ہوتا ہے :

"شب ہفتم ایں ماہ ارباب رقص بہیئت مجموعی بر قبر عزیزی کہ در آمدی پورہ مدفون است حاضر گشتہ قرش را بشراب ناب می شویند و ہمہ شب بے اہتمام متنفسے مرتبہ بمرتبہ برقص و سرود پرداختہ صدور ایں حرکات را ذریعہ ترویح روحش (باقی صفحہ ۲۴۱ پر)

رسم حنابندی:۔ دوسری رسم مردوں کی حنابندی ہے یہ نئی بدعت ہے مذہب امامیہ کے جہلاء اور عوام کا عمل اس کا ماخذ ہوگا کیونکہ یہ لوگ عشرۂ محرم کے دنوں میں ساتویں تاریخ کو قاسم بن حسن رضی اللہ عنہ سے حنابندی منسوب کرتے ہیں فریقین کے علماء اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۰ سے آگے) میدانند تو الان ہم جستہ جستہ فراہم می آیند مجلس رنگینی می شود مردم حسین در آنجا وارد می شوند طرفہ خلوتے دست بہم می دہد و عجب صحبتے میسر می آید غرض باین تقریب تا شش روز تماشائیاں عشرت پرست و نظارگیان سبک سیر جا بجا بدست درد انبساط می در ہندو وغیرہ احتظاظ برائے یک سال در یک ہفتہ می اندوزند۔"

شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:۔ "بسنت کا موسم وہی ہوتا ہے جو بہار کا۔ ہندو اپنے دیوتاؤں کے مندر میں سرسوں کے پھول چڑھاتے ہیں مسلمانوں نے بھی اپنے بزرگوں کے مزاروں پر عقیدت کے پھول چڑھانے شروع کر دیئے دلّی میں کئی جگہ بسنت چڑھتی تھی آج بھولو شاہ کی بسنت ہے تو کل رسول نما کی، کبھی ہرے بھرے صاحب کی بسنت ہے تو کبھی شاہ بڑے کی، کبھی سلطان جی کی بسنت ہے کبھی حضرت ترکمان کی۔ ان بزرگوں کے علاوہ بعض قوالوں اور گائکوں نے اپنے نامی گرامی باپ دادا کے مزاروں پر بھی بسنت چڑھانی شروع کر دی تھی۔ غرض دلی میں بیسیوں جگہ بسنت چڑھتی تھی اور خوب رونق ہوتی تھی۔ بسنتوں کا کوئی اعلان نہیں ہوتا کہ کب اور کس جگہ بسنت ہوگی مگر سب کو خبر ہو جاتی تھی اور ہر بسنت میں سیکڑوں آدمی شریک ہوتے تھے ہوتا یہ تھا کہ عصر کی نماز کے بعد درگاہ کے متولی یا خادم صاحب ختم پڑھتے اور شیرینی تقسیم کرتے پھر پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتیں۔ مزار کے پائین میں سرسوں کے پھول اور گڑوے رکھے جاتے اس کے بعد قوالی ہوتی، فرط عقیدت سے طوائفیں بھی اپنے ناچ گانے کا ہنر دکھانے آتیں ان کی وجہ سے اور خلقت ٹوٹ پڑتی تیسرے پہر ہی سے سودے والوں کی دکانیں لگ جاتیں گیس کے ہنڈوں سے رات کا دن بن جاتا، شام کے جھٹ پٹے کے بعد ہجوم بڑھنا شروع ہوتا یہاں تک کہ رات ڈھلے تک تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی دلی کے من چلوں نے عقیدت کے ان اجتماعوں کو بھی دل بہلانے کا ایک ذریعہ بنا لیا جب طوائفیں ناچنے اور گانے کھڑی ہوتیں تو انہیں ہجوم کے مختلف گوشوں سے بیل کے روپیہ اور نوٹ دکھائے جاتے اور رنڈیاں دل لگتی پھلانگتی انہیں لینے جاتیں۔ بیل دینے میں مقابلہ اور مسابقت جب شروع ہو جاتی تو سیکڑوں کے وارے نیارے ہو جاتے ..... بسنتوں میں وہ ہنگامہ اور دھما چوکڑی ہوتی کہ اس ہڑبونگ میں بھلے آدمیوں نے شریک ہونا چھوڑ دیا تھا۔ حضرت سلطان جی کی درگاہ کے صحن میں اور حضرت امیر خسرو کے مزار کے سامنے بھی رنڈیاں ناچا کرتی تھیں۔"

(اُجڑا دیار از شاہد احمد دہلوی (مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۹۲ء) ص ۳۰۱-۳۰۲ (باقی صفحہ ۲۴۲ پر)

رسم سے بیزار ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۱ سے آگے) چشتیہ سلسلے کے مشائخ خاص طور سے بسنت کو اہمیت دیتے ہیں حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی لکھتے ہیں :۔

"ناز و ادا سے جھومتا آیا جسے کی چوکھٹ چومتا　　دیکھو نیاز اس رنگ کو، کیسی سہانی ہے بسنت"

شاہ دلدار علی مذاقؔ بدایونی لکھتے ہیں :۔

بسنت آنے کی تھی کچھ بھی خبر اے غنچۂ دل تجھکو　　جو سرسوں پھولی آنکھوں میں تو یہ جانا بسنت آیا
بنے سلطان محبوب الٰہی جب زری زرنگش　　در دولت پران کے بن کے شاہانہ بسنت آیا
شہ خوباں ہے رنگیں اور رنگیں نوا خسرو　　شہانہ راگ رنگیں مطربو! گاتا بسنت آیا

مذاقؔ صاف دل کو رنگ دے اپنے رنگ میں جامی
رنگیلے بانکے فخر الدین مولانا بسنت آیا

(۱) مرقع دہلی صفحہ ۳۰ - ۳۲
(۲) دیوان نیاز از شاہ نیاز احمد بریلوی (مطبع نامی پریس لکھنؤ ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء) ص ۸۲
(۳) کلام دلدار علی مذاقؔ از دلدار علی مذاق بدایونی (وکٹوریہ پریس بدایوں ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء) ص ۲۵۰ - ۲۵۱
(۴) ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک مرتبہ صلاح الدین عبدالرحمن (دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۵۸ء) صفحہ ۲۲۸ - ۲۳۲

باب پنجم

علمائے دہلی:۔ اب اس شہر کے وہ اہل کمال گنتا ہوں جو بندے کے زمانے میں موجود تھے۔
مولانا شاہ عبدالعزیز:۔ خلیفہ حقیقی و پسر جناب شاہ ولی اللہ محدث ہیں، ہر زبان، اردو، فارسی، ایرانی، تورانی، دہلی کی مختصر زبانی اور عربی میں ایسا خوش بیاں میں نے بہت کم دیکھا ہے، شاہ صاحب کی کتاب تحفہ اثناء عشریہ دہلی کی فارسی عبارت میں ہے، کیونکہ اسی ملک والوں کے لئے تصنیف کی ہے اور لفظ تعیناتی بھی جو اس میں بجواب استدلال بحدیث جہزوا جیش اسامہ لعن اللہ من تخلف عنہا واقع ہوا ہے اسی پر مبنی ہے[1]، عربی عبارت عمدہ لکھتے تھے، عربی میں ان کے قصائد اور اشعار بھی ہیں۔
شیخ احمد شروانی یمنی نے ان کے مکتوب فقرات کو دوسرے کا مسروقہ کلام لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو دیکھا نہ تھا،[2] شاہ عبدالعزیز صاحب بینائی جاتے رہنے کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکتے تھے،

---

[1] ملاحظہ ہو تحفہ اثناء عشریہ از شاہ عبدالعزیز (اردو ترجمہ از مولوی سعد حسن خاں یوسفی (کارخانہ تجارت کتب کراچی ۱۹۵۶ء) صفحہ ۴۱۷، ۴۲۰۔

[2] شیخ احمد شروانی (ف ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء) کی مشہور کتاب نفحۃ الیمن فیما یزول بذکرہ الشجن ہے، جو اکثر مدارس عربیہ میں داخل نصاب ہے، اس کے علاوہ مناقب حیدریہ، شمس الاقبال اور دلشائے عجب العجائب بھی اس کی تالیفات ہیں، مناقب حیدریہ پر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے تقریظ بار قام فرمائی ہے، اس تقریظ کو سر سید احمد خاں بہادر نے آثار الصنادید میں نقل کیا ہے (باب چہارم ص ۴۱-۴۲) جس سے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شیخ احمد شروانی کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے، شیخ احمد شروانی نے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے ملاقات سے پہلے اپنی کتاب حدیقۃ الافراح میں ایسا خیال ظاہر کیا ہے، مگر معلوم ایسا ہوتا کہ حضرت شاہ صاحب سے ملاقات کے بعد اس نے اپنی رائے بدل دی اور اپنی کتاب مناقب حیدریہ پر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے تقریظ بھی لکھوائی۔ ملاحظہ ہو:۔

(۱)، تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۱۰۵ (۲) دہلی اور اس کے اطراف ص ۱۰۰

دوسرے کو بلا تامل املا فرماتے تھے، اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص قلم برداشتہ خط لکھتا ہو اور اس میں ایسا فقرہ نکل آئے کہ بعینہٖ تذکرۂ آتش کدۂ لطف علی خاں آذر میں ہو یا فی البدیہہ کوئی قصیدہ کہے اور اس کا کوئی مصرعہ کسی غیر مشہور امام کے دیوان میں مل جائے جو ہندوستان میں بہت کم دستیاب ہوتا ہو، تو یہ صریح توارد ہے نہ کہ سرقۂ قبیحہ، شاید شیخ احمد شروانی نے خود کو ہندوستانیوں کا عیب جو سمجھ رکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ملک ہند اسی لائق ہے کہ دوسرے ملک والوں کے غیر منصفانہ ہاتھوں سے اس پر طرح طرح کے مصائب وارد ہوں کیونکہ اس سرزمین میں باہر کے لوگوں کی اس قدر تعظیم کی جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، یہ کام اکیلے بیچارے شیخ ہی نے نہیں کیا بلکہ بعض دوسرے کم حیثیت لوگ بھی دہلی اور لکھنؤ کی اُردو پر عیب لگاتے ہیں اور یہ کی جمع یے اور وہ کی جمع دے بناتے ہیں، نیز بیجائی سے زبان دانوں کے اُستاد بننا چاہتے ہیں اور سند میں کسی ایسے شخص کی تحریر پیش کرتے ہیں جو اس ملک کا باشندہ نہ ہو، یہ نہیں سمجھتے کہ اگر اس ملک کا کوئی شخص ملک فرنگ میں جائے اور ایک ایسے انگریزی لفظ پر جس کو وہاں کے لوگ غلط سمجھتے ہوں صحت کی سند میں نواب شمس الدولہ کی لغت کی کتاب پیش کرے[1] تو بالآخر اس کو (پاگلوں) کے شفا خانے میں بھیجنے کے سوا اور کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز علم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ میں شہرۂ آفاق تھے[2]۔ اور ہیئت، ہندسہ، مجسطی، مناظر، اصطرلاب، جر ثقیل، طبیعات، الٰہیات، منطق، مناظرہ، اتفاق، اختلاف، ملل نحل، قیافہ، تاویل، تطبیق مختلف اور تفریق مشتبہ میں یکتائے زمانہ تھے، فن ادب اور ہر قسم کے اشعار سمجھنے میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، منقول میں کلام اللہ اور حدیث سے دلیل پیش کرتے تھے اور معقول میں جو ثبوت مناسب سمجھتے، خواہ مخواہ یونانیوں میں سے افلاطون، ارسطو، اور متکلمین سے فخر رازی وغیرہ کے اقوال کی تائید میں مبتلا نہیں ہوتے تھے اور اپنی تحقیقات کو فن معقول میں صاف صاف بیان کر دیتے تھے چاہے وہ کسی کی رائے کے موافق ہو یا نہ ہو، کتاب تحفۂ اثنا عشریہ میں وہ طریقہ اختیار نہیں کیا ہے جو تمام فرقوں کے علماء کا اکثر دستور ہے اگرچہ اس کتاب کا موضوع مباحثہ ہے

---

[1] نواب شمس الدولہ کے حالات کے لئے ملاحظہ باب دوم ص ۱۳۲ [2] حضرت عبدالعزیز محدث دہلویؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (باقی صفحہ ۲۴۵ پر)

بلکہ اس میں اشاعرہ کی وکالت کرتے ہوئے عینیت صفات کی بحث میں اس کتاب میں اشعری کا قول مانا ہے اور اپنے رسالہ میں جو عقائد میں لکھا ہے، عینیت صفات کا حکم دیا ہے، جیسا کہ محقق طوسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۴ سے آگے) کے فرزند اکبر تھے ولادت بمقام دہلی ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء میں ہوئی تاریخی نام غلام حلیم ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۱۷ سال کے قریب تھی تمام علوم ظاہر و باطن اپنے والد ماجد سے حاصل کئے بعض کتب حدیث کی سند اپنے والد کے اجل تلامذہ شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ امین اللہ کشمیری سے لی، علم فقہ اپنے خسر مولوی نور اللہ سے حاصل کیا، جامع علوم ظاہری و باطنی اور صاحب علم و حلم و زہد و ورع و تقوی تھے، دور دور سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور علم حاصل کر کے دین کی خدمت کرتے، وہ مرجع علماء و مشائخ تھے، تمام علوم متداولہ، فنون عقلیہ نقلیہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، حافظہ نہایت قوی تھا، تمام عمر دین و ملت کی خدمت میں صرف کر دی، ہمیشہ درس و تدریس افتاء فصل خصومات، وعظ و پند، تلامذہ کی تربیت و تکمیل میں صرف کر دی، نجف خاں کے زمانہ میں اس کی سخت گیر پالیسی کی وجہ سے شاہ صاحب کو ایذا پہنچی، یہاں تک کہ شہر سے خارج البلد کئے گئے، مگر حضرت نے اصلاح و تبلیغ کا کام برابر جاری رکھا، شاہ عبدالعزیز کی تصنیفات سے تفسیر عزیزی تحفہ اثنا عشریہ،.... بستان المحدثین، فتاوی عزیزی دو جلد، تحقیق الرویا، عزیز الاقتباس، رسالہ بلاغت، عجالہ نافعہ وغیرہ مشہور ہیں، ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں انتقال ہوا،

قطعہ تاریخ از حکیم مومن خاں مومن دہلوی

انتخاب نسخہ دیں مولوی عبدالعزیز   بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے   آ گیا تھا کیا کہیں مردود کے ایماں میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا   کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا   لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسی گردوں محل
کیا کس و نا کس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن   ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
مجلس درد آفریں تعزیت میں میں بھی تھا   جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آکر بے بدل

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل
۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء

تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو:-

(۱) مجموعہ حالات عزیزی از ظہیر الدین احمد ولی اللّٰہی (مطبع مجتبائی ۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۴ء) (بقیہ صفحہ ۲۴۶ پر)

شرح اشارات میں شیخ بوعلی کا وکیل ہے اور رسالہ او صاف الاشراف اور آغاز و انجام میں جنید اور شبلی کا نائب اور اخلاق ناصری میں یونانیوں کا تابع اور تجرید میں اپنے عقیدے پر ہے۔

مولوی رفیع الدّین: مولوی رفیع الدین جامع کمالات تھے، لیکن فنون ریاضیہ کی تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ تھے، ان کا حافظہ ان کے ذہن تاباں سے بڑھا ہوا تھا بخلاف مولانا شاہ عبدالعزیز کے کہ ان کے ذہن کی براقی ان کے عدیم النظیر حافظے پر بدرجہا فوقیت رکھتی تھی [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۵ سے آگے) (۲) تذکرہ عزیزیہ مرتبہ قاضی بشیر احمد میرٹھی (مجتبائی پریس ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۴ء)

(۳) کمالات عزیزی از نواب مبارک علی خاں (مطبع ضیائی میرٹھ ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء)

(۴) تذکرہ شاہ ولی اللہ ص ۳۰۴ - ۳۱۲ (۵) شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۱۰۱ - ۱۷۵

(۶) آثار الصنادید ص ۲۹ - ۴۲ (۷) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۶ - ۱۹۰

(۸) حدائق حنفیہ ص ۴۷۰ (۹) الیانع الجنی ص ۷۳ - ۷۵

(۱۰) اخبار رنگین از سعادت یار خاں رنگین، ورق ص ۱۲، ۱۵، ۲۶ (قلمی مملوکہ محمد ایوب قادری)

(۱۱) تراجم علمائے اہل حدیث جلد اول از ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی جید برقی پریس ۱۹۳۸ء ص ۴۹ - ۶۲

(۱۲) تذکرہ کاملان رامپور ص ۲۰۳ - ۲۱۲

(۱۳) علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد دوم از مولانا محمد میاں (الجمعیۃ پریس دہلی، ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۷ء) ص ۴۲ - ۵۲

[1] شاہ رفیع الدین ابن شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۱۶۳ھ ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوئے تحصیل علم اور سند حدیث حضرت شاہ ولی اللہ سے لی جب حضرت شاہ عبدالعزیز کی کبرسنی اور کثرت امراض کے سبب سے طلبہ کی تعلیم میں حرج واقع ہوا تو شاہ رفیع الدین نے طلبہ کو اپنے ذمے لے لیا، دیار و امصار سے طلبہ حاضر خدمت ہوتے اور فیض حاصل کر کے اپنے اپنے وطن واپس لوٹتے سرسید احمد خاں لکھتے ہیں: دیار ہندوستان کے جمیع فضلائے نامی انھیں حضرت فیض موہبت کے مستفیضوں میں سے ہیں، ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلف کا درس فرماتے تھے، جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے، حضار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسی فن میں جامۂ یکتائی ان کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے۔ باوجود ان کمالات کے اضافۂ فیض باطنی کا یہ حال تھا کہ جنید بغدادی اور حسن بصری کہ اگر ان کے وقت میں ہوتے تو بیشک و ریب اس میں اپنے تئیں کمترین مستفیدان تصور کرتے مؤلف تذکرہ علمائے ہند نے ۱۲۴۹ھ ۱۸۳۳ء مؤلف حدائق حنفیہ نے ۱۲۳۳ھ ۱۸۲۲ء لکھا ہے۔ شاہ رفیع الدین کا انتقال (باقی صفحہ ۲۴۷ پر)

مولوی عبدالقادر :- تینوں بھائیوں میں کمال رکھتے تھے، تمام فنون سے واقف تھے لیکن تفسیر اور حدیث کی خدمت ان کا معمول تھا، اکبر آبادی بیگم کی مسجد میں درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اپنے اور پرائے کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے، پہلے ان بزرگوار کو حکم اجل پہنچا، ان کے بعد مولوی رفیع الدین جو تمام خاندان میں قوی المزاج تھے اچانک ہیضہ میں راہی ملک عدم ہوئے اور مولانا عبدالعزیز باوجودیکہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا رہتے تھے لیکن سب کے بعد انھوں نے اس سرائے قدیم کو چھوڑا خدا ان تینوں بزرگواروں کو ان کے مشائخ عظام کے پاس پہنچائے اور ان کے متبعین حشر میں ان کے ساتھ ہوں (آمین) لہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۶ سے آگے) ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء میں ہوا، قرآن شریف کا اردو تحت اللفظ ترجمہ مقبول خاص و عام ہے قیامت نامہ فارسی، مقدمۃ العلم، رسالہ عروض، کتاب التکمیل، رسالہ ومغ الباطل، اسرار المحبۃ بھی شاہ رفیع الدین کی تصنیفات سے ہیں شاہ صاحب شعر بھی کہتے تھے، نمونہ کلام آثار الصنادید میں درج ہے۔ حال میں مولوی عبدالحمید سواتی صاحب نے گوجرانوالہ سے شاہ رفیع الدین کے کئی رسالے شائع کرکے بڑی علمی خدمت کی ہے۔

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۵۲ - ۵۳ (۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۶ - ۱۹۷

(۳) حدائق حنفیہ ص ۱۰۳ (۴) یادگار دہلی ص ۱۰۳

(۵) واقعات دار الحکومت دہلی ص ۵۰۰ (۶) الیانع الجنی ص ۵۵ - ۷۶

(۷) تراجم علمائے اہلحدیث ص ۶۵ - ۶۶

لہ شاہ عبدالقادر بن حضرت شاہ ولی اللہ ۱۱۶۷ھ میں پیدا ہوئے، عالم، فاضل، متقی، پرہیزگار، مستغنی المزاج اور متوکل تھے، تحصیل علم سے فراغت پاکر اکبر آبادی مسجد کے حجرہ میں ساری عمر بسر کردی رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے، اہل دنیا کی طرف مطلق التفات نہ فرماتے، قرآن شریف کا بامحاورہ اردو ترجمہ اور تفسیر موضح قرآن دو نایاب چیزیں آپ کی یادگار ہیں ترجمہ قرآن نہایت بلیغ اور بہت مقبول ہے، سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:۔

"بارہا ثقات کی زبان سے سنا گیا ہے کہ جس امر میں کچھ فرمایا ویسا ہی بے کم و کاست ظہور میں آیا، باوجود اس کے کہ بسبب کثرت اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ ادھر بیٹھ یا ادھر، لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ رؤسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے (باقی صفحہ ۲۴۸ پر)

شاہ محمد اسمٰعیل :- دادا اور چچاؤں کی یادگار مولوی محمد اسمٰعیل ہیں جو ذہن کی جودت اور قوت توجیہ میں بے مثل ہیں خدا ان کا نگہبان رہے [۱]

(حاشیہ صفحہ ۲۴۷ سے آگے) بہ سبب ادب کے دور دور خاموش بیٹھے اور بدوں آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات کے سوا یارانہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں، کرامات حضرت بحد تواتر پہنچ گئی ہیں، اگر ان کا بیان کیا جائے کتاب میں گنجائش نہیں سے

مردان خدا، خدا نباشند لیکن زخدا جدا نباشند

۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء میں شاہ عبدالقادر کا انتقال ہوا۔ مؤلف "تذکرہ علمائے ہند" نے سن انتقال غلط لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۵۴ - ۵۵
(۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۵۰۸ - ۵۰۹
(۳) یادگار دہلی ص ۱۰۲ - ۱۰۴
(۴) تذکرہ علمائے ہند ص ۳۱۵ - ۳۱۶
(۵) حیات ولی ص ۳۴۹ - ۳۵۲
(۶) تراجم الفضلاء ص ۱۷
(۷) حدائق حنفیہ ص ۴۷۱
(۸) تراجم علمائے اہلحدیث ص ۹۴
(۹) ابجد العلوم ص ۹۱۵

[۱] شاہ محمد اسمٰعیل ابن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء کو پیدا ہوئے نہایت ذہین وطباع اور حاضر دماغ تھے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی والد کے انتقال کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز نے تعلیم و تربیت فرمائی علم حدیث کی تحصیل حضرت شاہ عبدالعزیز سے فرمائی اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فراغ حاصل کر لیا۔ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید نے دین اسلام کی بڑی خدمت کی اس زمانے میں مراسم شرک و بدعات کا جو رواج ہو گیا تھا، اس کا خوب رد کیا سنت کی تبلیغ اور بدعت کا رد ان کا مقصد حیات تھا، اس سلسلے میں جامع مسجد دہلی میں سہ شنبہ اور جمعہ کو وعظ فرماتے تھے، سید احمد بریلوی کے دست حق پرست پر بیعت کی حج بیت اللہ کو گئے پھر شمالی ہندوستان کا دورہ کیا، پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں کی زندگیوں کو تلخ کر دیا تھا، ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے، مذہب کی آزادی بالکل سلب کر لی تھی، شاہ محمد اسمٰعیل شہید نے حضرت سید احمد شہید کی امارت میں سکھوں سے جہاد کیا اور بالاکوٹ کے میدان میں ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔ شاہ محمد اسمٰعیل کی تصنیفات سے تقویۃ الایمان صراط مستقیم، تنویر العینین، ایضاح الحق، منصب امامت، رسالہ یک روزی وغیرہ یادگار ہیں (باقی صفحہ ۲۳۲ پر)

مولوی رشید الدین خاں :- ان سب بزرگوں کے شاگرد رشید الدین خاں تھے اگرچہ اتنے تیز فہم نہ تھے مگر تعلیم وتعلم کی خوب مشق تھی، ہر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے مگر مناظرے میں بہت جلد رنجیدہ ہو جاتے تھے، نمائش کے بہت زیادہ پابند تھے ہر فن کی بہت کچھ معلومات رکھتے تھے، جو کچھ لکھتے بسط وتفصیل سے اور جو کچھ کہتے دراز وطویل، بالخصوص مباحثہ اختلافیہ دینیہ میں یہی طریقہ تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ اب مقابل میں ردّ وقدح کی گنجائش نہیں رہی بندے (مولوی عبد القادر) سے بہت شفقت فرماتے تھے، ان سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی جبکہ بندے کو اجمیر سے واپسی نصیب ہوئی (۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء) مسئلہ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں جو کتاب لکھ رہے تھے اس کا مقدمہ کئی جزو ہو گیا تھا اور ابھی پورا نہیں ہوا تھا، مجھے کتاب دکھا کر کہا کہ جب یہ کتاب اس شرح وبسط کے ساتھ جو میں چاہتا ہوں پوری ہو جائے گی، اور لکھنؤ پہنچے گی تو وہاں کے علماء اس کے جواب کی فکر میں مرجائیں گے اور گریبان سے سر نہ اٹھا سکیں گے میں (مولوی عبد القادر) نے کہا کہ جناب اس کا نام "لوح محفوظ" رکھیں کہ اسم بامسمّی ہو جائے [۱] اب اس شہر میں ان جیسا دوسرا نہیں ہے اور وہ بھی غالباً ۱۲۴۱ھ یا ۱۲۴۲ھ میں اس دار پر شور وشغب

(حاشیہ صفحہ ۲۴۸ سے آگے) تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو:-

(۱) حیات طیبہ از مرزا حیرت دہلوی (اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور) (۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۲ - ۲۱۳

(۳) آثار الصنادید باب چہارم ص ۵۵ - ۵۹　　(۴) ابجد العلوم ص ۹۱۶

(۵) اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین از نواب صدیق حسن خاں (مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء) ص ۴۱۶

(۶) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۴۱۰ - ۴۱۲　　(۷) حیات دلی ص ۲۵۲ - ۲۵۹

(۸) موج کوثر از شیخ محمد اکرم ص ۳۴ - ۳۷　　(۹) تراجم علمائے اہل حدیث ص ۹۷ - ۱۱۲

(۱۰) ابجد العلوم ص ۹۱۶

[۱] اس کتاب کا نام شوکت عمریہ بجواب بارقہ ضیغمیہ ہے اس کتاب کا ایک مخطوطہ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (شیفتہ کلیکشن) میں ہے جس کا نمبر ۱۱۱ ہے۔ فہرست کتب (شیفتہ کلیکشن) مرتبہ مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری (مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۳۲ء) ص ۲۲

سے اپنے باکمال اساتذہ کے پاس چلے گئے[1]

مولوی رشید الدین خاں اور مولوی محمد اسمٰعیل نیز مولوی عبد الحیٔ سے مجلس وعظ جامع مسجد شاہجہاں آباد میں جو صورت پیش آئی نہ ان کی شریف وضع کے شایان تھی نہ اس خاندان سے علاقہ رکھنے والوں کے لئے زیبا تھی[2]

---

[1] مولوی رشید الدین خاں کشمیری الاصل اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے رشتہ دار تھے، شاہ عبد العزیز، شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین سے تمام علوم کی تحصیل کی، علم ہیئت و ہندسہ میں کمال حاصل تھا، روافض کے رد میں اکثر کتابیں لکھیں، دہلی کالج میں مسند درس کو زینت بخشی، ستر برس کے قریب عمر ہوئی، مولوی رشید الدین خاں اور شیخ احمد شروانی صاحب نفحۃ الیمن کے عربی خطوط کا ایک مختصر مجموعہ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں المکاتیب کے نام سے مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ سر سید احمد خاں بہادر نے ۱۸۴۳ء میں آثار الصنادید کو مرتب کیا اور اس میں تحریر کیا کہ عرصہ تیرہ چودہ برس کا گذرتا ہے کہ مولانا رشید الدین کا انتقال ہوا اس طرح ۱۸۳۳ء مطابق ۱۲۴۹ھ نکلتے ہیں، تذکرہ علمائے ہند نے بھی یہی سال وفات لکھا ہے۔ البتہ مؤلف نزہۃ الخواطر (جلد ہفتم) نے ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷-۲۸ء لکھا ہے

تفصیل کے لئے دیکھئے:۔

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۵۱ - ۵۲ (۲) تذکرہ اہل دہلی ص ۷۰ - ۷۲

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۴۰۹ - ۴۱۰ (۴) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۹۱ - ۱۹۲

(۵) ابجد العلوم ص ۹۱۷ (۶) المکاتیب (مجموعہ خطوط مولوی رشید الدین خاں اور شیخ احمد شروانی)

(۷) نزہۃ الخواطر جلد ہفتم ص ۱۷۷ - ۱۷۸ (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء)

[2] شاہ محمد اسمٰعیل شہید نے اگرچہ ایک طرف رد بدعت و شرک میں گرم جوشی سے حصہ لیا تو دوسری طرف نئے مسائل آمین بالجہر قرأۃ فاتحہ خلف امام اور عدم تقلید وغیرہ کے نئے مسائل کو رواج دیا، ان مسائل نے دہلی کے عوام و خواص میں اختلاف پیدا ہوا، ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں جامع مسجد دہلی میں ان مسائل کے موافقین و مخالفین کے درمیان ایک مباحثہ منعقد ہوا، جس میں فریق اول کے سرگروہ مولوی عبد الحیٔ اور شاہ محمد اسمٰعیل فریق دوم کے قائد مولوی رشید الدین خاں اور مولوی مخصوص اللہ و مولوی محمد موسیٰ فرزندان شاہ رفیع الدین دہلوی تھے، اسی مباحثے کی طرف مؤلف روزنامچہ مولوی عبد القادر نے اشارہ کیا ہے، اس مباحثے کی پوری کیفیت مشتمل بر تحریرات ہر دو گروہ مولوی برہان الدین (باقی صفحہ ۲۴۹ پر)

مرزا حسن علی لکھنوی:- مرزا حسن علی لکھنوی نے جو سفر حج بھی کر چکے ہیں، کلکتہ میں مخلوق کو وعظ و تذکیر سے نفع پہنچایا ہے، کچھ عرصے باندہ میں بھی بزم ارشاد آراستہ کی ہے، جو کچھ بھی ہیں سلسلہ عزیزیہ میں بس وہی ہیں، ان کا دل و دماغ ملفوظات عزیزیہ و رفیعیہ کی بیاض سمجھنا چاہیئے، اس زمانے میں ایسے بزرگوار کا وجود غنیمت ہے [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۰ سے آگے) ساکن دیوہ نے ایک رسالے میں قلم بند کی ہے جو "رسالہ محاکمہ" کے نام سے مشہور ہے، اسی بحث کے سلسلے میں تنبیہ الضالین و ہدایت الصالحین وغیرہ رسالے شائع ہوئے۔

(۱) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۹ - ۱۳۰

(۲) انوار آفتاب صداقت جلد اول قاضی فضل احمد پولیس پنشنر لدھیانہ (ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء) ص ۵۱۳ - ۵۱۴

(۳) تنبیہ الضالین و ہدایت الصالحین (مجموعہ فتاوی علمائے دہلی و حرمین شریفین در جواز تقلید) مطبع سید الاخبار دہلی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء)

[1] مرزا حسن علی کا اصلی نام محمد، لقب جمال الدین اور عرف حسن علی والد کا نام عبد العلی تھا، درسی کتابیں ملا حیدر علی سندیلوی المتوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء سے پڑھیں پھر دہلی پہنچے، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر سے استفادہ کیا، علم حدیث حضرت شاہ عبد العزیز سے پڑھا، مرزا حسن علی نامور مدرس، بلند پایہ محدث، شیوہ بیان مقرر اور سحر طراز خطیب تھے، نہایت با اخلاق، متواضع، نیک طینت اور درویش صفت عالم تھے، جب سید احمد شہید لکھنؤ وارد ہوئے اور لوگوں کو جہاد کی دعوت دی تو مرزا حسن علی نے سید احمد شہید کی بڑی تعظیم و تکریم کی اپنے مکان پر دو مرتبہ دعوت کی اور چند چیزیں نذر کیں ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ مرزا صاحب کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا۔ تشنگان علوم دور دور سے آتے اور ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو کر واپس جاتے مرزا صاحب کے نامور تلامذہ میں مولانا حسین احمد ملیح آبادی، مولانا اولاد حسن قنوجی مولانا عبد الرزاق فرنگی محلی، مفتی سعد اللہ مرادآبادی، مولانا عبد الحکیم فرنگی محلی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ۲۰ جنوری ۱۸۳۹ء/۱۲۵۵ھ کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

(۱) تحفۃ المشتاق فی بیان النکاح والطلاق		(۲) رسالہ قوس و قزح

(۳) برہان الخلافۃ (مجموعہ فتاوی)		(۴) حاشیہ سنن ابی داؤد۔

(۵) حاشیہ جامع الترمذی، مرزا حسن علی کی تصنیفات سے ہیں۔

تفصیل کے لئے دیکھئے:-

(باقی صفحہ ۲۵۲ پر)

مولوی محبوب علی :- اس خاندان کے شاگردوں میں محبوب علی شاہجہان آبادی ہیں ان کے والد سرکار بادشاہ دہلی کے قدیم متوسلوں میں سے ہیں ان کی توجہ زیادہ تر حدیث اور تفسیر پر ہے اور ان کی ہمت حتی المقدور علم کے مطابق عمل میں مصروف ہے، ہر معاملے میں ذہن رسا اور فکر درست رکھتے ہیں، طرز مباحثہ اور طریق مناظرہ کو متقرہ تقریر میں عمدہ ادا کر دیتے ہیں سلہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۱ سے آگے) (۱) تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۰۔۱۶۱

(۲) الیانع الجنی ص ۷۷ (۳) ابجد العلوم ص ۹۱۷

(۴) اتحاف النبلاء ص ۱۵۲ (۵) معارف جلد ۸، شمارہ ۶ (دسمبر ۱۹۵۶ء) ص ۴۲۷۔۴۴۲

(۶) نزہۃ الخواطر جلد ہفتم ص ۱۳۶۔۱۳۷ (۸) تراجم علمائے اہل حدیث ص ۲۲۲

سلہ مولانا محبوب علی ابن مصاحب علی بن حسن علی خاں ۱۲۰۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، شاہ عبدالعزیز کے ارشد تلامذہ سے تھے، سید احمد شہید سے بیعت کی تھی، سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں :-

"علم حدیث و فقہ میں اقران و امثال سے بیش جہاندیدہ و سفر کردہ تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ کی جناب مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز کے خاندان رفیع الارکان سے کی ان فنون میں ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ مسائل جزئیہ مثل لوح محفوظ کے ان کے تختۂ حافظہ پر منقوش ہیں"

حضرت سید احمد شہید کے ہمراہ سکھوں سے جہاد کے لئے یاغستان گئے، تو وہاں کے شدائد و مصائب دیکھکر گھبرا گئے، مولوی محبوب علی نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بھی فتویٰ جہاد کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا، بلکہ بقول سر سید احمد خاں بہادر جنرل بخت خاں سے صاف انکار کر دیا، اور کہا کہ "ہم مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں، ہم اپنے مذہب کی رو سے اپنے حاکموں سے مقابلہ نہیں کر سکتے" مولوی محبوب علی کا ۱۲۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ اختصار العیانۃ، صیانۃ الایمان اور بیان عدم جواز رفع سبابہ ان کی تصنیفات سے ہیں، یہ تینوں رسالے قلمی نیشنل میوزیم آف پاکستان (کراچی) میں محفوظ ہیں۔

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۶۱

(۲) یادگار دہلی ص ۹۲

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۴۱۴۔۴۷۵

(۴) ہنٹر پر نظر از سر سید احمد خاں مطبوعہ کیپٹل کو اپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور ۱۹۴۹ء ص ۳۱۔۳۲

مولوی فضل امام خیرآبادی:۔ اس شہر میں مولوی فضل امام خیرآبادی کی زیارت سے مستفیض ہوا، جو مولوی عبدالواجد مرحوم کے شاگرد اور اپنے زمانے کے استاد تھے، ان کا تبحر فن معقول میں کیا لکھوں، فن منطق میں شیخ کی شفا کا خلاصہ انھوں نے کیا ہے، اس وقت دہلی میں مفتی عدالت تھے، قتل اور قصاص کا فتوی قلم برداشتہ جیسا چاہتے لکھ دیتے تھے، تمام مسائل کے جوابات کتاب الاشباہ والنظائر کی عبارت کے مطابق ہوتے تھے۔

ایک شخص کا مقدمہ قتل کے شبہ میں بعدالت دورہ بمقام گوہانہ ریلدر صاحب کے زیر تجویز تھا کاغذات مثل کا خلاصہ یہ ہے کہ متہم مقتول کو اپنے ساتھ گھر سے لے گیا اس کے بعد اس شخص کا پتہ نہیں چلتا، مگر ایک عرصے کے بعد اس شخص کی ہڈیاں ایک گڑھے میں پائی گئیں جس کو متہم ایک روز جھانک رہا تھا، اس قتل سے پہلے ایک روز متہم ایک شخص سے کہہ رہا تھا کہ اگر تو میرے ساتھ ہو جائے تو ایک شخص کو مار ڈالوں اور متہم نے اظہار میں محض قتل سے انکار کیا اور کہا کہ یہ ایک شخص میرے بھائی کو مار کر دوسرے ملک میں چلا گیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اگر کوئی میرا ساتھی ہو جائے تو میں اپنے بھائی کا قصاص خود لے لوں، کوئی میرا ساتھی نہ ہوا اور میرا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا میں اس ارادے سے باز آگیا، اور اس گڑھے میں اپنے بیلوں کی آنکھوں کی دوا جو فلاں جانور کی ہڈی ہے ڈھونڈ رہا تھا، (بندہ (مولوی عبدالقادر) اس وقت جانور کا نام بھول گیا لیکن اس کی ہڈی کو جلا کر بیلوں کی آنکھ میں لگاتے ہیں) اور نام بردہ (مقتول) نے میرا ساتھ دینے کے ارادے سے قصد کیا کہ گاؤں میں چلے لیکن وہ میری مدد کے ارادے سے پھر گیا اور اپنا راستہ لیا اور میں نے اپنا راستہ لیا۔

صاحب عدالت نے فتوی کے لئے مثل بھیجدی، جناب ممدوح (مولوی فضل امام خیرآبادی) نے قتل کا حکم دیدیا کہ اس نے قتل کا اقرار کیا ہے اور کتاب الاشباہ والنظائر کی یہ عبارت "الحجۃ اما اقرار او بینۃ او قرینۃ قطعیۃ" تحریر تھی، ویلدر صاحب نے پھر لکھا کہ اس نے دوسرے کے قتل کے ارادے کا اقرار ضرور کیا ہے، لیکن مقتول کے قتل کا اقرار نہیں کیا اور گواہوں نے بھی قتل مقتول سے پہلے قتل مبہم کے ارادے کے اقرار کی گواہی دی ہے نہ کہ قتل مقتول کے اقرار کی۔ ان دونوں صورتوں میں شرع شریف میں کوئی فرق ہے یا نہیں، حسب قاعدہ عدالت

نے اس پر حکم دیا کہ آخری حکم کے لئے روداد اور مجرم کو بڑے صاحب (ریزیڈنٹ) کی عدالت میں دہلی بھیجا جائے، حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب (مولوی فضل امام خیرآبادی) فتوی پر اعتماد کامل اور مقدمے کی حقیقت پر رائے صائب رکھتے تھے اس لئے مقتول کے ورثا نے گم شدہ قاتل سے قصاص پالیا، خدا ان (مولوی فضل امام خیرآبادی) کے اعمال کا پورا پورا بدلہ عطا فرمائے [1]

---

[1] مولانا فضل امام ابن شیخ محمد ارشد ہرگامی فاروقی، خیرآباد وطن تھا، مولوی عبدالواجد کرمانی خیرآبادی کے ارشد تلامذہ سے تھے، علوم نقلیہ و عقلیہ کی تحصیل کر کے دہلی پہنچے، حکومت انگریزی کی جانب سے پہلے مفتی پھر صدر الصدور مقرر ہوئے، رسالہ میرزاہد اور ملا جلال پر حواشی لکھے۔ آمدنامہ اور تراجم الفضلاء بھی ان سے یادگار ہیں۔ شاہ صلاح الدین صفوی سے بیعت تھے، فرائض ملازمت کے ساتھ مشغلہ تدریس و تصنیف ہمیشہ جاری رکھا۔ اپنے تلامذہ پر نہایت شفقت فرماتے، شاہ غوث علی پانی پتی نے بڑی محبت سے اپنے استاد مولانا فضل امام کا ذکر خیر کیا ہے، سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں :۔

"علوم عقلیہ اور فنون حکمیہ کو ان کی طبع وقاد سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ کو ان کی زباندانی سے افتخار۔ اگر ان کا ذہن رسا دلائل قطعیہ بیان نہ کرتا، فلسفہ کو معقول نہ کہتے اور اگر ان کا فکر صائب براہین ساطعہ قائم نہ کرتا، اشکال ہندسی، تار عنکبوت سے سست تر نظر میں آتے، اس نواح میں ترویج علم و حکمت و معقول کی اسی خاندان سے ہوئی گویا اس دودۂ عالا تبار سے اس علم نے یک جہتی بہم پہنچائی ہے" ان کے تلامذہ میں مولانا فضل حق اور مفتی صدرالدین آزردہ بہت مشہور ہوئے، کچھ دنوں پٹیالہ میں بھی رہے، رشوت لینے کے الزام میں ملازمت سے برطرف ہوئے ۵ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ (۲۹ ء۱۸) میں خیرآباد میں انتقال ہوا اور احاطہ درگاہ شیخ سعدالدین میں دفن ہوئے، مرزا غالب نے تاریخ وفات کہی ہے

اے دریغا قبلہ ارباب فضل	کرد سوئے جنت الماوی خرام
چون ارادت از پئے کسب شرف	جستم سال فوت آن عالی مقام ۲۵۰
چہرۂ ہستی خراشیدم نخست	تا بنائے تخرجہ گردد تمام $\frac{۹۹۲}{۱۲۴۹}$
گفتم اندر سایۂ لطف نبی"	باد آرامش گہ "فضل امام" ۵
۲۵۰ +	۹۹۲ - ۵ = ۱۲۴۴ھ (۲۹ ء۱۸)

(باقی صفحہ ۲۵۳ پر)

منشی فضل عظیم خیرآبادی:- مولوی فضل امام کے بڑے بیٹے منشی فضل عظیم فارسی نظم ونثر میں مہارت رکھتے ہیں، جو واقعہ پیش آئے اس کی کیفیت قلم برداشتہ لکھ دیتے ہیں، ولیم فریزر بہادر کی ان پر بےحد شفقت ہے، جو ملتا ہے اس سے زیادہ خرچ کر دیتے ہیں۔ ظاہر میں پریشان اور باطن میں خوش ہیں۔

مولوی فضل حق خیرآبادی:- منشی فضل عظیم کے بھائی مولوی فضل حق ہیں کہتے ہیں کہ فنون عقلیہ میں ریاضی کے سوا سلف کی یادگار ہیں، عربی ادب میں ابوالحسن اخفش جیسے ہیں ان کی نثر مقامات حریری سے اور نظم دیوان متنبی سے ممتاز ہے، بندے (مولوی عبدالقادر) نے اس یکتائے زمانہ (مولوی فضل حق خیرآبادی) کو ایک مرتبہ دیکھا ہے، علاوہ علم کے جرأت وتہوّر بھی رکھتے ہیں، مولوی کرامت علی ابن مولوی حیات علی خوش نویس ان کی قوت تقریر کا ذکر کرتے تھے کہ "ایک روز میں نے کہا کہ حج اصغر عمرہ ہے اور حج اکبر میں عرفات کا قیام بھی ضروری ہے، جناب مولوی فضل حق نے فرمایا کہ حج اکبر وہ ہے کہ جمعہ کے دن ہو، ہرچند میں اپنے مدعا پر عقلی دلیل لایا مگر انہوں نے اپنے حسن بیان سے سب کو ہیچ اور پوچ بنا دیا" میں نے سنا ہے کہ ان کی تصنیفات بہت ہیں، لیکن بندے کو ان کا دیکھنا نصیب نہ ہوا[۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۴ سے آگے) مولوی رحمٰن علی نے تذکرہ علمائے ہند میں ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء اور عبدالشاہد خاں شروانی نے "باغی ہندوستان" میں ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء سن وفات لکھا ہے جو غلط ہے۔
حوالہ کے لئے دیکھئے:-

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۹۲　(۲) باغی ہندوستان از عبدالشاہد خاں شروانی (مدینہ پریس بجنور ۱۹۴۷ء) ص ۱۶-۲۵
(۳) تذکرہ علمائے ہند ص ۳۶۹-۳۶۸　(۴) مختصر سیر ہندوستان ص ۶۰
(۵) واقعات دارالحکومت حصہ دوم ص ۴۱۴-۴۱۵　(۶) تراجم الفضلاء (تمہید ا-iii)
(۷) کلیات غالب (شعر فارسی) (مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۰ء) ص ۴۲-۴۳
(۸) علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) (جلد دوم) مرتبہ محمد ایوب قادری کراچی ۱۹۶۱ء ص ۱۹۹

[۱] مولانا فضل حق ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں خیرآباد میں پیدا ہوئے، علوم معقول کی تکمیل باپ سے کی اور علم حدیث (باقی صفحہ ۲۵۶ پر)

مولوی کرامت علی :۔ مولوی کرامت علی علوم شرعیہ اور ادبیہ کی طرف زیادہ متوجہ ہیں، اگرچہ کسی فن سے خالی نہیں، ان جیسا خوش نویس اور زود قلم میں نے نہیں دیکھا اگر کوئی مانع پیش نہ آیا تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۵ سے آگے) مولانا شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے حاصل کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا دہلی پر قبضہ ہوچکا تھا۔ رزیڈنسی میں مولانا فضل حق سررشتہ دار ہو گئے، مولانا فضل حق اور شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی سے مذہبی مباحث پر اختلاف ہوا طرفین سے رسائل لکھے گئے، مرزا غالب سے مولانا کے بڑے تعلقات تھے، وہ ایک عرصے تک نواب جھجر، مہاراجہ الور، نواب ٹونک اور ریاست رامپور میں ملازم رہے۔ آخر میں واجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ میں رہے ہنومان گڑھی کا جو مشہور واقعۂ جہاد پیش آیا، جس میں مولوی امیر علی امیر المجاہدین تھے، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی سعد اللہ رامپوری اور مولوی محمد یوسف فرنگی محلی نے مولوی امیر علی اور جہاد ہنومان گڑھی کے خلاف فتویٰ دیا مگر کس کو معلوم تھا کہ مولانا فضل حق جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں اس کی پوری پوری تلافی کریں گے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا نے مردانہ وار حصہ لیا، دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے، لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے جب انگریزوں کی فتح ہوئی تو گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء کو انتقال ہوا، اور تدفین عمل میں آئی۔ حیرت ہے کہ پروفیسر حامد حسن قادری نے تاریخ داستان اردو (مطبوعہ آگرہ ۱۹۴۱ء طبع ثانی) میں کیسے لکھ دیا کہ مولانا فضل حق کا انتقال رنگون میں ہوا، اور وہیں دفن ہوئے اور اسی کے حوالے سے شیخ محمد اکرم نے (حیات غالب مطبوعہ فیروز سنز کراچی ص ۱۷۱) لکھا کہ مولانا فضل حق کا انتقال اور دفن رنگون میں ہوا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔

(۱) باغی ہندوستان از محمد عبدالشاہد خاں شروانی ص ۱۱۰-۱۷۹

(۲) مولانا فضل حق و عبدالحق از مفتی انتظام اللہ شہابی ص ۱-۱۱ (۳) تذکرہ علمائے ہند ص ۳۸۲ - ۳۸۴

(۴) آثار الصنادید باب چہارم ص ۶۲ - ۶۹ (۵) تذکرہ غوثیہ ص ۱۲۱ - ۱۲۵ -

(۶) ہدیۂ سعیدیہ فی الحکمۃ الطبیعیہ از مولانا فضل حق خیرآبادی مطبع شعلہ طور کانپور ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء (مقدمہ) (۷) یادگار غالب ص ۱۷

(۸) انتخاب یادگار ص ۲۸۱ - ۲۹۵ (۹) تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۲۲۲ (۱۰) آبحیات ص ۵۰۵

(۱۱) غدر کی صبح وشام ترجمہ ضیاء الدین احمد برنی (ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۶ء) ص ۲۱۰ - ۲۲۰ - ۲۲۶ - ۲۲۸

(۱۲) حدائق حنفیہ ص ۴۸۰

ممکن ہے بہت کچھ ترقی کر جائیں، ہر طرح کے علوم حاصل کئے ہیں مگر تعلیم و تعلّم کا طریقہ زیادہ تر خاندان عزیزیہ کے طرز پر ہے [1]

شاہ غلام علی:- مسند ارشاد مظہری کے جانشین تھے، بندے نے صغر سنی میں رامپور میں ان کی زیارت کی تھی اس کے بعد شاہجہاں آباد میں ان کی خانقاہ میں دیکھا جو چتلی قبر کے متصل ہے،

---

[1] مولوی کرامت علی کے حالات میں سر سید احمد خاں بہادر رقمطراز ہیں:-

"خلف الرشید ہیں، مولوی حیات علی خوش نویس علیہ الرحمہ کے اور شاگرد رشید ہیں، مولانا فضل امام صاحب کے فضل و کمال ان کا حد تقریر اور حد تحریر سے زیادہ ہے، استحضار مسائل اس مرتبہ کو پہنچا ہے کہ حصولی ان کے ذہن میں حکم حضوری کا رکھتا ہے، عرصہ چند سال کا ہوا کہ شہر شاہجہاں آباد کو تلاش معاش کی تقریب سے چھوڑا اور حیدر آباد کی طرف راہی ہوئے، چونکہ "السفر وسیلۃ الظفر" حدیث مشہور ہے، گردش فلک نے وہاں ان سے موافقت کی اور بالفعل ہزار روپیہ ماہانہ منصب سے سرفراز ہیں، اس نواح میں مع قبائل اور عشائر کے بسر کرتے ہیں، نظم و نثر ان کا راقم کو بہم نہیں پہنچا"

مولوی کرامت علی بنی اسرائیلی کہلاتے تھے، مولوی فضل امام خیرآبادی اور شاہ رفیع الدین دہلوی کے شاگرد تھے اور علم حدیث شاہ محمد اسحق اور شاہ اسمٰعیل سے حاصل کیا ان کے والد مولوی حیات علی حنبلی مذہب تھے۔ مولوی کرامت علی نے کچھ دنوں نواب فریدالدین دبیر الدولہ سے پڑھا تھا۔

مولانا کرامت علی نے سیرت نبوی پر ایک ضخیم کتاب عربی زبان میں "سیرت المحاریہ" تصنیف کی ہے، جو ۱۲۴۵ھ سے قبل حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی ہے، یہ کتاب نظام حیدرآباد دکن کے نام معنون کی گئی ہے اور کتب خانۂ آصفیہ میں اس کا ایک مخطوطہ بھی موجود ہے، مولانا کرامت علی کا انتقال ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء میں ہوا۔

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۰ ،
(۲) تذکرہ اہل دہلی مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (مطبوعہ انجمن پریس کراچی ۱۹۵۵ء) ص ۹۷، ۹۸
(۳) سیرت فریدیہ ص ۱۲۰ - ۱۲۱
(۴) الحیات بعد المماۃ (سوانح عمری مولوی نذیر حسین دہلوی) از فضل حسین (مطبع اکبری آگرہ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) ص ۳۵
(۵) حدیقۃ المرام از محمد مہدی واصف (مطبع مظہر العجائب مدراس ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء)
صفحہ ۴۷ - ۴۸

ان کا مشغلہ درس حدیث و تفسیر، نوجوانوں کی اصلاح مراقبہ اور اصطلاحات تصوف کے مطالب سمجھانا تھا۔ [1]

---

[1] شاہ عبداللہ عرف شاہ غلام علی ابن عبداللطیف ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء یا ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء میں بٹالہ (یا پٹیالہ) میں پیدا ہوئے حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مرید و خلیفہ تھے، جملہ مراتب سلوک طے کر کے دہلی میں سکونت اختیار کی، سر سید احمد خاں بہادر نے آثار الصنادید کے باب چہارم کا آغاز حضرت شاہ غلام علی کے حالات ہی سے کیا ہے اور نہایت ارادت و تفصیل سے ان کے حالات لکھے ہیں، سر سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ:

"میرا کیا مقدور ہے کہ آپ کے کمالات ظاہری اور مقامات باطنی کا حال لکھ سکوں کہ حالات آپ کے اس سے سوا ہیں، جو بیان ہو سکیں، سبحان اللہ علم اور عمل اور فضل و کمال اور تجرید و تجرد اور حلم و کرم اور سخاوت اتم اور ایثار و انکسار آپ کی ذات پر ختم تھے۔ آپ کی ذات فیض آیات سے تمام جہان میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے آن کے بیعت اختیار کی میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی۔ حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتے تھے اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمے تھا اور باوجودیکہ کہیں سے ایک حبہ مقرر نہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب الغیب سے سب کام چلاتا تھا..... ایک دفعہ نواب امیر الدولہ امیر محمد خاں والئ ٹونک نے بہت التجا سے درخواست تقرر وظیفہ کی اس کے جواب میں آپ نے صرف یہ شعر لکھ بھیجا ؎

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم — با میر خاں بگوئے کہ روزی مقرر است

۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء کو دہلی میں انتقال فرمایا، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

سال تولید و حیات و فوت آں سلطان پاک — "مظہر جود" امام و "مظہر یزدان پاک"
۱۱۵۸ھ — ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء)

(۱) مکتوبات شریفہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی مطبوعہ لاہور ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء ص ۱ تا ۳
(۲) آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۱-۱۵
(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۱۵۳ - ۱۵۵ (۴) تذکرہ علمائے ہند ص ۳۶۴ - ۳۶۶
(۵) گلزار اولیاء ص ۴۷ - ۵۴
(۶) تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان از مرزا محمد اختر دہلوی (سیٹھ آدم جی عبداللہ پبلشرز بمبئی والے لاہور) ص ۲۶۱ - ۲۶۴

شاہ ابوسعید:۔ مخدوم شاہ ابو سعید نے مخدومنا مولوی شرف الدین رامپوری کی خدمت میں علوم الٰہیہ حاصل کیے، مخدوم سراج احمد سے حدیث کی سند لی، جناب شاہ درگاہی سے خرقۂ تصوف حاصل کر کے دوسروں کو پہنچایا، اس کے بعد شیخ الشیوخ (شاہ غلام علی) کی خدمت سے مستفید ہو کر ان کی خانقاہ کو آباد کر رکھا ہے، یہ بزرگوار حافظ کبیر کے پھوپی زاد بھائی ہیں اور اس فقیر کے پرانے کرم فرما ہیں، دیکھا چاہیے کہ اس چند روزہ زندگی میں ان کا دیدار نصیب ہوتا ہے یا نہیں [1]

---

[1] حضرت شاہ ابوسعیدؒ بن شاہ صفی القدر فاروقی ۲ ذیقعدہ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء میں رام پور (روہیلکھنڈ) میں پیدا ہوئے "حافظ و عالم و ولی باد" سے تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا، فن تجوید قاری نسیم سے اور علوم عقلی و نقلی مفتی شرف الدین رامپوری اور مولانا رفیع الدین دہلوی سے پڑھے، شاہ عبدالعزیز سے سند حدیث حاصل کی، اپنے والد ماجد سے طریقہ نقشبندیہ میں گیارہ برس کی عمر میں بیعت کی پھر حضرت شاہ درگاہی سے خاندان قادریہ میں مرید ہوئے حضرت شاہ غلام علی نے چند ماہ کے بعد خلافت سے سرفراز فرمایا، ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں حرمین شریفین کا قصد فرمایا اور خانقاہ میں اپنے فرزند شاہ احمد سعید کو جانشین بنایا، حج و زیارت کے بعد ہندوستان تشریف لائے، ۲۲، رمضان ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء کو ٹونک میں داخل ہوئے، عیدالفطر کے دن سکرات موت شروع ہوئی، ان کے صاحبزادے شاہ عبدالغنی ہمراہ تھے انکو وصیت کی کہ "اتباع سنت کرنا اور اہل دنیا سے پرہیز کرنا، اگر دنیا داروں کے پاس جاؤ گے تو ذلیل ہو گے، ورنہ دنیادار کتوں کی طرح تمہارے دروازے پر لوٹیں گے" عیدالفطر کو شنبہ کے دن ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء کو انتقال فرمایا، نعش تابوت میں رکھ کر دہلی لائی گئی، حضرت شاہ غلام علی کے پہلو میں خانقاہ میں دفن کیا گیا، چار فرزند شاہ احمد سعید، شاہ عبدالغنی، شاہ عبدالرشید اور شاہ محمد عمر یادگار چھوڑے۔ یہ قطعہ تاریخ وفات ہے:۔

امام و مرشدنا شاہ ابوسعید سعید	بعید فطر چو شد واصل جناب خدا
دلے شکستہ و مغموم گفت تاریخش	ستون محکم دین نبی فتادہ ز پا
	۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں:۔

(۱) یادگار دہلی ص ۸۹ (۲) واقعات دارالحکومت دہلی ص ۲۹۳-۳۹۴ (۳) آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۵-۱۶۔
(۴) تذکرہ علمائے ہند ص ۷۵-۷۶ (۵) تذکرہ کاملان رامپور ص (۶) حدائق حنفیہ ص ۴۷۱-۴۷۲ (۷) تذکرہ اولیائے ہند و پاکستان ص ۴۶۷-۴۶۸

مخدوم شاہ صابر بخش:- شہر کے اکابر مشائخ سے مخدوم صابر بخش نبیرہ مخدوم غلام سادات تھے ان کے بزرگ سلسلہ نظامیہ چشتیہ میں نام آور اور مشہور تھے، ان کی ہمت وجود کی نشانیاں، کارواں سرائے، مسجد، امام باڑہ اور دھرم شالہ ہیں، جو امیر و غریب، سنی و شیعہ اور مسلمان و ہندو کے آرام کے لئے تعمیر ہوئی ہیں بندے نے ان کی زیارت نہیں کی[1]

---

[1] صابر بخش اپنے زمانہ کے چشتیہ صابریہ سلسلے کے مشہور بزرگ تھے، شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ نصیر الدین بن شاہ غلام سادات بن شیخ عبدالواحد برادرزادہ حقیقی قطب العارفین حضرت شیخ محمد چشتی قدس سرہٗ العزیز تھے، شاہ صابر بخش نے بڑے بڑے مشائخ سے فیض باطن حاصل کیا اور اپنے جد امجد شاہ غلام سادات سے خلافت پائی اور انھوں نے شاہ محمد نصیر سے، انھوں نے شیخ محمد چشتی سے اور انھوں نے شیخ محمد ابراہیم رامپوری سے ۱۴؍ ربیع الاول ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء میں شاہ صابر بخش صاحب کا انتقال ہوا، خانقاہ میں واقع دریا گنج میں دفن ہوئے، ان کے بعد ان کے بیٹے شاہ عبداللہ صاحب سجادہ نشین ہوئے اور شاہ صاحب کے قدم بقدم رہے ۲۲؍ شعبان ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء کو انتقال فرمایا اور شاہ صابر بخش کے قریب دفن ہوئے، ان کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ امیر حسین سجادہ نشین ہوئے جو نہایت خلیق، متواضع، منکسر المزاج اور درویش صفت شخص تھے، قریب ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا۔ شاہ امیر حسین کے بعد ان کے پوتے شاہ کرار حسین ابن مظفر حسین سجادہ نشین ہوئے جن کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ ان کے بعد میاں صابر حسین صاحب سجادہ نشین ہوئے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

شاہ صابر بخش اور شاہ عبداللہ کے مزارات پر ایک لمبی لوح دیوار میں لگی ہے جس میں بخط نسخ و نستعلیق نہایت خوش خط یہ کتبہ ہے جو بہادر شاہ ثانی نے نصب کرایا تھا۔

محمد اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسکم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعًا انہ ھو الغفور الرحیم ط

بادشاہا جرم ما را در گزار　　　　ما گنہگاریم و تو آمرزگار

تو نکوکاری و ما بد کردہ ایم　　　　جرم بے اندازہ بے حد کردہ ایم

(باقی صفحہ ۲۶۱ پر)

مخدوم میر نصیر۔ بزرگان شہر میں مخدوم میر نصیر ہیں، اب خواجہ میر درد کی یادگار، بس وہی ہیں، معتقدین بے روک ٹوک اور دوسرے لوگ بانسری کا نغمہ سننے کی تقریب میں مہینہ میں ایک بار ان کی خدمت میں جاتے ہیں، اس خاندان میں یگانہ و بیگانہ سے بے غرض ملاقات کے وقت بھی شاہانہ رسوم کی پابندیاں کثرت سے ہیں، بندے نے ان کی زیارت کی ہے، مگر انھوں نے مجھے نہیں دیکھا[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۰ سے آگے)

بے گنہ نگذشتہ بر من ساعتے	با حضور دل نکردم طاعتے
بر در آمد بندۂ بگریختہ	آبروئے خود ز عصیان ریختہ
مغفرت دارد امید از لطف تو	زانکہ خود فرمودۂ لا تقنطو
بحر الطاف تو بے پایان بود	ناامید از رحمتت شیطان بود
نفس و شیطان زد کریما راہ ما	لطف تو باشد شفاعت خواہ ما

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں :-

(۱) یادگار دہلی ص ۴۹-۵۱ (۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۱۳۲-۱۳۴ (۳) آثار الصنادید باب چہارم ص ۲۳-۲۴ (۴) میرے زمانہ کی دلی حصہ اول از ملا واحدی دہلوی (مشہور پریس کراچی ۱۹۵۰ء) ص ۲۴۸-۲۴۹

[1] مخدوم میر نصیر میر کلو اکبر آبادی کے فرزند اور خواجہ میر دردؒ کے نواسے تھے، سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں :۔

"آپ کے صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ اس سے سوا ہیں، جو لکھنے میں آویں اور اس سے بہت ہیں جو کہے جاویں آپ نواسے ہیں خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کے جو بڑے نامی مشائخ تھے اور ان کا نام تمام عالم میں مشہور ہے ولادت آپ کی ۱۱۹۵ھ میں ہوئی اور ابتداء سے طالب خدا ہوئے، چھٹپن ہی میں حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر رہتے اور توجہ لیتے بلکہ اسی زمانہ میں خواجہ میر درد سے بیعت کی تھی جبکہ آپ کا سن شریف دس برس کا ہوا تو خواجہ میر درد علیہ الرحمہ نے وفات پائی اور درد جدائی کا آپ کے نصیب ہوا، آپ ہمیشہ اپنے پیر کی جدائی میں دل شکستہ اور جان خستہ رہا کرتے تھے۔ آپ کو اکثر علوم میں خصوصاً ریاضیات میں خوب دخل تھا علم موسیقی بہت خوب جانتے تھے اور تال اور لے سے ایسے واقف تھے کہ بڑے بڑے استادان کے سامنے کان پکڑتے تھے اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے، علم حساب کو اس سے زائد جانتے تھے اور مسائل حساب میں وہ مہارت بہم پہنچائی کہ مسائل لاینحل بآسانی حل فرماتے تھے چنانچہ تال اور حساب میں ان کی تصنیفات سے رسالے موجود ہیں، یہ تو صفات ظاہری تھیں (باقی صفحہ ۲۶۲ پر)

حاجی لال محمد : فخریہ سلسلے کے بہت مشہور بزرگ حاجی لال نامی تھے، چھوٹے مدرسے میں رہتے تھے، ضعف پیری کے باوجود ہر چھوٹے بڑے کے لئے سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے اور اس کبرسنی میں خواجہ بزرگ معین الدین اجمیری کے عرس کے زمانے میں تلقین کرتے ہوئے یہاں (دہلی) سے اجمیر تک جاتے تھے اور باوجودیکہ اس سلسلے میں میر شمس الدین کا ہاتھ پکڑ کر مولانا فخر الدین کے طریقے سے آشنا ہوئے تھے، لیکن میر صاحب کی وفات کے بعد چند روز مولانا کی خدمت میں رہ کر درمیانی واسطہ کا تذکرہ ہٹا دینے پر فخر کرتے تھے ظاہری علم کچھ نہ تھا، مشائخ کے قصے بہت بیان کرتے تھے۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۱ سے آگے) اور کمالات باطنی میں ان سب سے رتبہ بڑا تھا اور وہ مقام ہی اور تھا، کمالاتِ باطنی خواجہ میر اثر سے کم خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کے بھائی تھے حاصل کئے، جبکہ خواجہ میر اثر علیہ الرحمہ کا انتقال ہوا خواجہ صاحب میر علیہ الرحمہ خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کے فرزند ارجمند جانشین ہوئے، جبکہ ان کا بھی انتقال ہوا تو آپ کی ذات فیض آیات سے اس مسند جانشینی کو رونق تازہ حاصل ہوئی، ہر مہینہ دوسری اور چوبیسویں کو مجلس بین نوازی کی آپ کے روبرو ہوا کرتی آپ کو صبر میں درجہ کمال حاصل تھا اور دنیا سے مطلق لگاؤ نہ تھا...... ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء کو آپ نے وفات پائی"

(۱) اخبار الصناد ید باب چہارم ص ۲۱-۲۲

[1] حاجی لال محمد حضرت شاہ فخر الدینؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے، انھوں نے پیر کے وصال کے بعد دہلی میں ان کی روایات کو قائم رکھا، شجرۃ الانوار میں تحریر ہے:-

"مریدان و خلفاء بسیار دارند، ذات گرامی صفات حضرت حاجی محمد لعل صاحب در مدرسہ و شہر از مغتنمات است"

حاجی لال محمد صاحب نہایت کریم النفس اور منکسر المزاج بزرگ تھے بڑی بڑی ریاضتیں کی تھیں ۱۲ سال تک خواجہ بزرگ اجمیری کے آستانہ پر حاضر رہے، تین مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے، ان کی روحانی طاقت بہت زبردست تھی، ۱۲ رمضان المبارک ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء کو وصال فرمایا، سلطان المشائخ کے مزار مبارک کے قریب مزار ہے، حاجی لال محمد کے بعد مرزا بخش اللہ بیگ نے ارشاد و تلقین کا سلسلہ شروع کیا، مرزا صاحب کا انتقال ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں ہوا، ان کے بعد خواجہ محب اللہ اور پھر خواجہ میاں محمد سجادہ نشین ہوئے، آج کل خواجہ علی محمد شاہ صاحب سجادہ نشین ہیں۔

تاریخ مشائخ چشت ص ۵۲۸-۵۲۹

میر محمد :- ایک بزرگ میر محمد نام ہیں، دوسروں کی بہ نسبت رندوں کی تلقین میں زیادہ مصروف رہتے ہیں، شہر کے دوسرے لوگ جو عقل کے چکر میں ہیں اتنی عقیدت نہیں رکھتے، مگر قلعہ مبارک کے سلاطین سب کے سب ان کے ساتھ جتنا کہ چاہیئے اس سے کہیں زیادہ اعتقاد رکھتے ہیں۔[1]

حقیقت تصوف :- ایک گروہ تصوف اور صوفیوں کا منکر ہے اور دوسرا گروہ ان کے قول کو وحی اور حکم الٰہی سمجھتا ہے، مگر دونوں گروہ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، سُنّی، شیعہ، علماء، اور عوام سب اسی آفت میں مبتلا ہیں، اس سلسلے میں محققین نے جو کچھ کہا ہے اور جو میرے

---

[1] نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں لکھتے ہیں :-

"جلالت نسب و حسب از چہرہ نمایاں سیمائش چون شعشۂ آفتاب تابان است و عظمت شکوہ مرتبہ فقر و عرفانش بذروۂ عیوق و کیوان صولت و ضعفش کہ مسبق از بادہ شجاعت است زہرہ زائران را گداز می دہد و صدمہ گفتگویش کہ مستنبط از مہابت است جگر مخاطبین را خون می کند جلال و جبروتش از ہیئت جلسہ شریفہ اش پیدا است و کمال فقر و فنا عتش از ورود تجلی آثار ہویدا در استقامت وضع عدیم المدل و در اعلان کلمۃ الحق باسلاطین و امراء ضرب المثل از زمان خلد مکان ترک منصب کردہ بہ نزہت آباد گوشۂ فقر کوس شاہی می زند و باستغنائے تمام تعین ما لا کلام اوقات بابرکات بسر می برد، درین بین از سلاطین و امراء و کبار اقسام تضرّع و ابتہال در بارۂ قبول سیورغال بعمل آید، لیکن بے نیازی ہائے منصب فقر بگوشۂ چشم ملتفت نگردید و از قبول فتوح دلاور ہم ہمین عالم است مگر از غریبے. پسران و خویشانش در سلک ارباب مناصب انتظام دارند و آرزو می کنند کہ بفرمائش آبروئے دارین حاصل نمایند لیکن میسر نیست محاورہ شریفش خیلے رنگین است و گفتگویش نہایت شیریں اداۓ کلامش مبنی بر لطائف و ترشش خوئے احوال طائفین ناشی از ظرائف باعتراف کمالاتش جمہور سکنۂ دہلی متفق اللفظ و المعنی و زبان خاص و عام بمجاہدات معنوی آمالش ناطق و گویا و این شعر مولوی نظامی مصداق کرامت اشتمال است ؎

تا بعہد جوانی از بر تو　　بدر کس نرفتہ از در تو
ہمہ را بر درم فرستادی　　تا نمی خواستم تو میدادی

(مرقع دہلی ص ۲۲ - ۲۳)

دل نشین ہوا ہے وہ عرض کرتا ہوں۔

گروہ صوفیہ ملکات فاضلہ کے حاصل کرنے اور صفات رذیلہ کے دور کرنے میں بہت زیادہ کوشاں رہتا ہے اور ایسے لوگ ہر مذہب وملت میں ہوتے ہیں اگر دین کے پابند ہیں تو یہی لوگ ہیں ورنہ حکمائے اشراق ہیں ہر مذہب میں ان کا نام جدا ہے، یہ لوگ اخلاق حسنہ کو طبعی اور مذمومہ کو مرض سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر چھوٹے بچے سے کچھ پوچھیں تو جو کچھ اس نے دیکھا ہوگا وہی کہے گا، اور اگر اس کو ماریں یا باندھیں تو روئے گا اور رنجیدہ ہوگا، مگر اس کے رنج وانتقام کا ارادہ دیر تک نہیں رہتا اور جب بچے کو اس کے حسب منشاء کچھ مل جائے تو زیادہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور رنج والم میں جب تک اس نے سینہ کوبی کرتے، سر پیٹتے اور کپڑے پھاڑتے ہوئے دوسرے کو نہ دیکھا ہو خود ایسی حرکت نہیں کرتا، اسی پر عقلمندی اور امور شرعیہ کا حکم لگاتے ہیں اور شریعت کو امراض روحانی کی طب سمجھتے ہیں، صوفیہ کوشش کرتے ہیں کہ دل کے تعلقات اس آب وگل کے خاکدان سے کم ہوجائیں اور قلب کی طاعت ومعصیت کو عمل جسمی کے حسن وقبح سے زیادہ گراں شمار کرتے ہیں اور اس کو سلوک کہتے ہیں، یہ نام دوسرے علوم کے اسماء کے مانند اگرچہ نیا ہے مگر یہ فن تمام مذاہب میں موجود ہے ان میں سے بعض ایسے ہیں جو فضائل سے مزین اور رذائل سے بچنے کے لئے شریعت کے ظاہری احکام کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں، جن کا مذہب حکم دیتا ہے یہ لوگ اہل سنت میں اصحاب ظواہر کا مرتبہ رکھتے ہیں اور شیعوں میں فرقہ اخباری کا[1] ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

ایک گروہ ہے جو اجتہاد میں مشغول ہے اور جس چیز میں تزکیہ کی قوت پاتے ہیں اس کو شریعت کا مغز اور معنی سمجھکر اس پر کاربند ہوجاتے ہیں اور دوسروں کو بھی سکھاتے ہیں، ظاہری

---

[1] شیعوں میں اخباری فرقہ اجتہاد وقیاس کا دشمن ہے، اس اخباری جماعت کی ابتدا ملا محمد امین (ابن محمد شریف استرآبادی) المتوفی ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳ء سے ہوئی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:

(۱) نجوم السماء از مرزا محمد علی (مطبع جعفری لکھنؤ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء) ص ۴۱-۴۲۔

(۲) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد دوم از مولانا مناظر احسن گیلانی (ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۴۴ء) ص ۲۶۲-۲۷۰

علماء اس گروہ کا انکار کرتے ہیں، انصاف یہ ہے کہ قیاس اور اجتہاد والوں کا اتنا زیادہ انکار بھی نہیں کرنا چاہیئے، جتنا کہ دوسرے مجتہدوں کا، یہ بھی کہتے ہیں کہ جب تک نفس یقین اور وہم میں امتیاز کر لینے کا عادی نہ ہو جائے، استدلال اطمینان بخش نہیں ہوتا کیونکہ تفرقہ پیدا کرنے والے مقدمات کی ترتیب میں غلطی کا ازالہ نہیں ہو سکتا، لہذا صحیح سے نتیجہ غلط ظاہر ہوگا اس لئے کہ غلط کا منشاء یہی ہے کہ مسلّم، مقبول، مشہور، مظنون اور عادی کا بدیہی سے التباس ہو جائے۔ اول وہ تقلید امکان و طاقت میں کیفیت حاصل کرتے ہیں، پھر ابتداء و انتہا میں غور کرتے ہیں، اور وجدان جس چیز کا حکم دے اس پر اعتقاد کر لیتے ہیں اور نصوص ظاہری کو تاویل کے ذریعے اس کے موافق بنا لیتے ہیں، چنانچہ جس جگہ استدلال تنزیہ کا حکم کرتا ہے وہاں متکلم بھی آیات تشبیہ کی تاویل کرتا ہے، مثلاً خلق افعال وصفات رویت، وجوب عدل اور حسن وقبح عقلی وشرعی کا اختلاف جو علماء اُمت میں ہے اسی بنا پر ہے اور اس قدر تصوف اور سلوک میں کوئی عیب نہیں، اس کا انکار بعینہٖ ایسا ہے کہ نادان شافعی اپنے حنفی ہونے کو قمار بازی سے بھی بُرا سمجھے اور جاہل حنفی کو شافعی کہنا امرد پرست اور کبوتر باز کہنے سے بھی زیادہ ناگوار معلوم ہو اسی طرح اخباری کو اگر اصولی یا بالعکس کہہ دو تو بہت جلد انکار کرے گا، برخلاف اس کے کہ اس کو اوباش کہہ دو یہ سارا فساد خود نماؤں اور خود پرستوں کی کرتوتوں کا نتیجہ ہے کہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچ کر خدا سے باز رکھتے ہیں۔

متصوفین کی فریب کاریاں:- ایک گروہ ایسا ہے جو اپنے کو صوفی ظاہر کرتا ہے۔ یہ اعمال عام طور سے اس کے ساتھ مخصوص ہیں، دکھاوے کے لئے کمبل، خرقہ، کشکول اور لٹھ رکھنا، بدن پر راکھ ملنا، داڑھی مونچھ کا صفایا کرانا۔ قبریں پوجنا، آئندہ واقعات اور مردوں کا حال بتانا، مریضوں کی شفا اور لوگوں کی تسخیر کو بذریعہ عمل اپنی طرف منسوب کرنا، مریدوں کو نجات کا امیدوار بنانا، مشائخ کے ملفوظات بطور تلاوت پڑھنا، بزرگوں کے نام اسماء حسنیٰ (خدا کے اسماء) کی طرح وظیفہ بنانا اور حل مشکلات میں مستند اور محترم سمجھنا اور استغاثہ ومناجات میں خدا کی طرح یاد کرنا اور ان لوگوں کے طریقے کو واجب اور سنت کی برابر سمجھنا اور ان کی صورت کے تصوّر کو عبادت سمجھنا اور ان کے لئے القاب تجویز کرنا، یہ سب بدعتیں ہیں، بعض کفر کی حد

میں آجاتی ہیں اور بعض فسق ہیں، کچھ لوگ ہیں کہ بزرگوں کے نام کے ساتھ لفظ "پاک" ملاتے ہیں، دوسرے ہیں کہ اپنے پیر کے مسکن کو "پاک" بولتے ہیں. کسی کو "معشوق خدا" اور کسی کو "محبوب کبریا" کہتے ہیں یہ لوگ پیٹ کے بندے ہیں معاش کا اچھا ذریعہ نکال رکھا ہے، معاد کی حقیقت سے بالکل واقف نہیں ورنہ جو ساز وسامان قبروں پر رکھتے ہیں، محتاجوں کو دے کر اسی عالم میں پہنچا دیتے، ایسے لوگوں سے پرہیز واجب ہے، ورنہ زمانہ پریشان کر دے گا، ان لوگوں کے سامنے دُنیا کے تذکرے کے سوا دین کا ذکر ہرگز نہیں کرنا چاہیئے، ورنہ یا توصحبت میں برہمی پیدا ہو جائے گی یا دین ہاتھ سے جاتا رہے گا.

جب کسی کو نیکیوں میں غالب اور بہ نسبت دوسروں کے خود کو زیادہ نصیحت کرنے والا، جائز ماکولات وملبوسات میں دوسروں کی مثل اور قیود وتکلفات سے آزاد پائیں تو اس کی صحبت غنیمت شمار کریں، اور جو شخص خود کو انگشت نما بنائے خواہ مے نوشی سے خواہ خرقہ پوشی سے اور اپنی نشستگاہ کو سب سے ممتاز رکھے خواہ مسند وتکیہ سے خواہ موٹے بوریئے اور پا انداز سے ہر وقت تسبیح ہاتھ یا گلے میں رکھے، معتقدوں سے برادرانہ اور دوستانہ رویہ نہ رکھے، بلکہ ان کو نوکروں اور غلاموں کی طرح سمجھے کہ برابر نہ بیٹھیں اور راستے میں اس کے آگے نہ چلیں اور معتقدوں میں بجز حضرت اور جناب کے کچھ نہ کہ سکیں اور جو کوئی اس کے سامنے چار زانو یا گھٹنا اٹھائے ہوئے بیٹھے تو اس کو ناگوار گزرے اپنی اور اپنے پیروں کی کرامات کے تذکرے سے اس کے چہرے پر بشاشت کے آثار ظاہر ہوں اور اپنے توکل، بے پروائی اور استغناء کو اشارے کنائے سے ظاہر کرے وہ شخص راہِ راست پر نہیں ہے بلکہ دُکاندار ہے

شعرائے دہلی:۔ اس شہر میں شعراء بہت ہیں بلکہ اُردو زبان میں ریختہ شعر کی ابتداء یہیں سے ہوئی ہے۔

نصیر دہلوی:۔ اس سلسلے میں نصیرالدین نصیرؔ مشہور ہیں ان کا یہ مطلع مشہور زمانہ ہے[1]

---

[1] نصیرالدین نام نصیر تخلص والد کا نام شاہ غریب تھا، شاعری کا شوق شروع سے تھا، (باقی صفحہ ۲۶۷ پر)

پشت لب پر ہے تری بخط ریحاں ایسا نہ تو دیکھو لکھے یاقوت رقم خان جیسا

سعادت یار خاں رنگین :- سعادت یار خاں رنگینؔ کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو چکی ہے [۱] اب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۶ سے آگے) شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہوئے چند روز کی مشق میں اچھا کہنے لگے، شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ تھا وہ خود شاعر تھے اس وجہ سے بآسانی دربار تک رسائی ہوگئی، لکھنؤ اور حیدر آباد کے بھی سفر کئے اور انعام واکرام سے مالا مال ہو کر واپس آئے چوتھی بار راجا چندو لال نے سات ہزار روپے بھیجکر حیدر آباد دکن بلایا، پچیس روپیہ یومیہ مقرر ہوا مگر افسوس کہ اس مرتبہ ان کو دلی آنا نصیب نہیں ہوا، وہیں ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء میں انتقال ہوا، چراغ گل سے سن وفات نکلتی ہے، شاہ نصیر نے اپنا دیوان خود مرتب نہیں کیا، ان کے مرنے کے کچھ دنوں بعد میر حسن تسکینؔ کے بیٹے میر عبدالرحمٰن نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ ان کے کلام کا جمع کیا، جس کو نواب رامپور نے خرید لیا۔ حیدر آباد دکن میں ان کی غزلوں کا مکمل دیوان ان کے کسی شاگرد کے پاس تھا وہ چھپ گیا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے :-

(۱) گل رعنا ص ۲۷۲ - ۲۷۸ (۲) آبحیات ص ۳۹۴ - ۴۱۰

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۴۳۶ - ۴۴۱ (۴) یادگار شعراء ص ۲۰۸

[۱] سعادت یار خاں رنگینؔ کے والد کا نام طہماسپ بیگ خاں تھا، رنگین سنہ ۱۱۷۰ھ / ۱۷۵۶ء میں سرہند میں پیدا ہوئے۔ پندرہ سال کی عمر سے نظمیں لکھنا شروع کیں، شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے سنہ ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء میں اپنا پہلا دیوان "دیوان ریختہ" کے نام سے مکمل کیا، اس وقت سپاہ گری کا مشغلہ تھا، لکھنؤ میں شہزادہ سلیمان شکوہ کے ملازم رہے۔ آصف الدولہ کی وفات کے بعد لکھنؤ سے نکلے مرشد آباد ڈھاکہ اور بنگال کی سیر کی، اس کے بعد مختلف دیار و امصار میں گھومے پھرے، رنگین تصانیف کثیرہ کے مالک ہیں، دیوان ریختہ، دیوان ریختی، دیوان آمیختہ، دیوان انگیختہ، مجموعہ رنگین مجالس رنگین، امتحان رنگین، شش جہات رنگین، عجائب غرائب رنگین، مثنوی مثلث رنگین، چہار چمن رنگین، پنجۂ رنگین، نظم رنگین، داستان رنگین خمسۂ رنگین، جنگ نامۂ رنگین، نصاب ترکی، حکایات رنگین نصاب رنگین، داستان رنگین، مجموعہ سبع سیارہ رنگین، گلدستۂ رنگین، رنگین نامہ، ساقی نامہ، تجربات رنگین، کلام رنگین، فرسنامۂ رنگین وغیرہ رنگین کی تصنیفات ہیں یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ رنگین کی اکثر تصنیفات انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں، رنگین کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان سے بہت عقیدت تھی، شاہ صاحب کے ایک وصیت نامہ کو جس میں بچے کی پیدائش سے مرنے کے بعد تک کے مراسم کا رد اور بیان ہے، اس کا منظوم ترجمہ تصنیف رنگین کے نام سے کیا ہے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے اکثر واقعات کو اخبار رنگین میں قلمبند کیا ہے ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء یا ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں رنگین کا انتقال ہوا مقام انتقال میں بھی اختلاف ہے تصنیف رنگین راقم الحروف کے مقدمے اور حواشی کے ساتھ (باقی صفحہ ۲۶۸ پر)

تک ان کے کلام کی شوخی نوجوان ہے، مختلف اصناف سخن میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں، ریختی میں میر تبو
اور میر انشاء اللہ خاں سے اور ہزل میں صاحبقران[1] سے بڑھے ہوئے ہیں، اُن کی یہ دو بیتیں ہ
چھوٹے بڑے کی زبان پر ہیں ؎

آہ کیجے تو آن جاتی ہے
اور نہ کیجے تو جان جاتی ہے
وہ نہ آئے تو تو ہی چل رنگین
اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۷ سے آگے) مجموعہ وصایا اربعہ میں شامل ہو کر شائع ہو چکا ہے

(۱) سعادت یار خاں رنگین از ڈاکٹر صابر علی خاں (انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۵۶ء)

(۲) مجموعہ وصایا اربعہ (مرتبہ محمد ایوب قادری، (شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ ۱۹۶۴ء) ص ۱۰۵ - ۱۲۳

(۳) دلی کا دبستان شاعری از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۴۹ء) ص ۲۱۰ - ۲۱۵

(۴) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۲۹۶ - ۲۵۹

(۵) مسدس رنگین مرتبہ تحسین سروری (ادارۂ ترقی ادب کراچی ۱۹۵۲ء)

(۶) تذکرہ خندۂ گل از مولوی عبد الباری آسی (نگار مشین پریس لکھنؤ ۱۹۲۹ء) ص ۲۳۵ - ۲۴۴

[1] امام علی ابن غلام حسین نام تھا، بلگرام ضلع ہردوئی کے رہنے والے تھے ریختی، ہزل اور ظرافت ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، اکثر جگہ کلام فحش کے درجہ تک پہنچ گیا ہے ۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا، خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھتے ہیں :-

نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد میں لکھنؤ آئے تھے بہت قدر دانی کی گئی تھی، دہلی کے مقلد تھے، بہت پرمذاق ہزل گو ظریف پھبتی برمحل کہتے تھے، ان کے ایک نواسے سید حسن عسکری نابینا حکیم زندہ ہیں، باوجود تنگدستی و افلاس کے وضع کے پابند، حد کے منکسر مزاج، مزار کا ابتک پتہ نہیں ملا، ان کا قلمی دیوان ملا ہے"

(۱) تذکرہ خندۂ گل ص ۲۹۵ - ۳۰۰ (۲) گلشن بے خار ص ۱۲۴

(۳) ریاض الفصحا ص ۱۰۴ (۴) یادگار شعراء ص ۱۲۴

(۵) آب بقا (تذکرہ) از خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت (مرتبہ مرزا جعفر علی فصیح) ہی پریس لکھنؤ ۱۹۱۰ء (ص ۱۶۸)

اُردو زبان میں ان کا ایک فرس نامہ[1] ہے، جو سب فرس ناموں سے اچھا ہے، پہلے ان مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں کا گھوڑا عمدہ ہوتا ہے، پھر اس کے خط و خال جن سے سوداگروں میں ان کی قیمت کم و بیش ہوتی رہتی ہے، اس کے بعد اچھے اور بُرے رنگ، پھر اس کا طرز پرورش اور حفظ صحت و افزائش قوت کے قواعد، پھر مرض پر استدلال کا طریقہ اور اقسام مرض میں مرض کی تعیین و تشخیص اور پھر معالجہ کا بیان ہے، سواری بھی عمدہ جانتے ہیں، اور گھوڑے کی بُری عادتوں کو شائستگی میں لا سکتے ہیں باین ہمہ لکھنے پر قدرت نہیں رکھتے[2]
رضی دہلوی:۔ نواب سعید رضی خاں بھی شہر کے شاعروں میں تھے، ان کا یہ مطلع دل

---

[1] رنگین نے گھوڑوں کی شناخت اور ان کے امراض و علاج سے متعلق فرس نامہ لکھا ہے، جو ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے، گھوڑے کے علاج کے متعلق وہی نسخے نقل کئے ہیں جو خود ان کے مجرب اور آزمودہ تھے، گھوڑوں کے پانچ عیب پانچ فصلوں میں بیان کئے ہیں، کتاب کا آخری حصہ بیطاری سے متعلق ہے، اس میں بیماریوں کی پہچان اور ان کے علاج نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں، فرس نامہ ۱۸۶۵ء میں لکھنؤ میں اور ۱۸۷۴ء میں کانپور میں شائع ہو چکا ہے اور انگریزی میں اس کا ترجمہ لفٹنٹ کرنل ڈی، سی فلٹ نے کیا تھا جو ۱۹۱۱ء میں لندن میں طبع ہوا تھا، انڈیا آفس میں رنگین کے ہاتھ کا لکھا ہوا فرس نامہ رنگین موجود ہے
(سعادت یار خاں رنگین ص ۳۹۴ - ۴۰۰)

[2] ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:۔
"رنگین کی علمی لیاقت، ہمہ گیری اور زبان دانی کا اندازہ ان کی نظم اور نثر کی تحریروں سے بخوبی ہو سکتا ہے وہ بلا تکلف عربی ترکی، فارسی، اُردو، پنجابی، پوربی، گجراتی، مرہٹی، پشتو بول اور لکھ پڑھ سکتے تھے اور ان سب زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے۔ علمی فضیلت کا حال یہ ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا اُردو شاعر ان کی ہمہ دانی کے مقابلہ میں آنے کی جرأت کرے ان کے معاصرین میں انشاء کے فضل و کمال کا بڑا شہرہ ہے، لیکن رنگین کی تمام تصانیف شائع ہو جائیں تو شاید انشاء ان سے بہت پیچھے نظر آئیں گے، زبان دانی سے قطع نظر انھوں نے شعر و ادب، فلسفہ و حکمت اور قرآن و حدیث کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا کلام اس کی شہادت دیتا ہے، خاص طور پر متقدمین اور متوسطین شعرائے فارسی کے کلام پر ان کی نظر بہت وسیع اور گہری تھی، انھوں نے نہ صرف ان اساتذہ کے کلام کو پڑھا تھا، بلکہ ان کے خاص رنگ میں لکھنے کی کوشش بھی کی تھی" (لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۳۰۳ - ۳۰۴)

میں ہے [1]

اگر مرنے سے ہے وہ کام جاں راضی تو مر دیکھو — یہی تا بیر باقی ہو میاں دل پہ بھی کر دیکھو

حکیم مومن خاں مومن [2]: نوجوان شاعروں میں مومن خاں مومن ہیں، کوچہ چیلاں سے متصل کالا محل کے بہت قریب مکان ہے، بزرگوں کا مسکن کشمیر ہے، ان کے دادا، دادا کے بھائی، باپ اور چچا فن طبابت میں مشہور و معروف ہیں، ان لوگوں کی جاگیر کے دیہات خالصہ

---

[1] سیف الدولہ رضی خاں بہادر صلابت جنگ، اکبر شاہ ثانی کے دربار کے امیر تھے ذوق کے والد ان کی سرکار میں ملازم تھے سرکار کمپنی کی طرف سے شاہی دربار میں وکیل تھے ایک ہزار روپیہ مشاہرہ پاتے تھے، "از اہل شاہ جہان آباد و از امرائے والا نہاد بدانستگی مسائل اثنا عشریہ معروف بود" (گلشن بیخار ص ۸۶) ۱۲۵۰ھ میں انتقال ہوا (خم خانۂ جاوید از سری رام جلد سوم (دہلی ۱۹۱۶ء) ص ۴۵۰ - ۴۵۹، سخن شعرا ص ۱۸۶، مجموعہ نغز ص ۲۶۹-

[2] محمد مومن خاں مومن تخلص حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے شاہ عبد القادر دہلوی سے عربی کی تحصیل کی والد اور چچا حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں، اہل کمال سے علم نجوم کی تحصیل کی اور اس فن میں بڑا کمال حاصل کیا، شطرنج سے بھی ان کو شوق تھا، شعر و سخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا، انھوں نے ابتداء میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا، پھر ذہن خداداد کے اطمینان پر اصلاح لینی چھوڑ دی بعض ضرورتوں سے جہانگیر آباد، بدایوں، سہسوان، رامپور اور سہارنپور گئے سید احمد شہید کے معتقد و مرید تھے۔ آخری عمر نہایت صلاح و تقوی میں گزری، کلیات میں ایک مثنوی جہادیہ ہے جو اس وقت لکھی تھی، جب سید احمد شہید سکھوں پر جہاد کر رہے تھے کلیات مومن اور دیوان فارسی مومن طبع ہو چکا ہے

اس جامع کمالات ہستی کا انتقال ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں کوٹھے سے گر کر ہوا، گرنے سے پہلے خود ہی تاریخ "دست و بازو بشکست" کہی تھی۔

تفصیل کے لئے دیکھئے:۔ (۱) آبحیات ص ۴۱۱ (۲) گل رعنا ص ۲۹۷ - ۳۰۸

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۴۲۴ - ۴۲۹ (۴) دلی کا دبستان شاعری ص ۲۴۲ - ۲۴۸

(۵) مجموعہ قصائد مومن مرتبہ ضیاء احمد ایم اے بدایونی (الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۲۵ء)

(۶) گلستان سخن از مرزا قادر بخش صابر (دہلی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) ص ۴۳۷ - ۴۲۸

شریف (جائداد صرف خاص) میں شامل ہو گئے، اب دہلی کے دوسرے پرانے خاندانوں کی طرح تنگی سے بسر کرتے ہیں، ریختہ اور فارسی میں بہت اشعار ہیں، ایک بیت مجھے یاد ہے

اگر وہاں نہیں نقشہ تمہارے گھر کا سا ۔ نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا

وافی دھلوی[1]:- ایک بالکل بے پڑھا شخص ہے، وافی تخلص ہے، ایک شعر اس کا میں نے سنا تھا ؎

زیست ہوتی اگر انسان کی انساں کے ہاتھ ۔ تو ہے وہ دشمن جانی کہ نہ جینے دیتا

مفتی صدرالدین آزردہ[2]:- مولوی صدرالدین، مفتی و صدر امین شاہ جہاں آباد، مولوی فضل امام کے نامور شاگرد ایک عرصے تک جنرل اختر لونی بہادر کے ساتھ اجمیر، نیمچ اور جے پور کے

---

[1] وافی کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

[2] مفتی صدرالدین ابن شیخ لطف اللہ کشمیری ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، شاہ عبدالعزیز شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین شاہ محمد اسحاق اور مولانا فضل امام خیر آبادی سے تحصیل علم کی، فن خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے۔ مفتی اور صدرالصدور کے عہدے پر رہے، انگریزی سرکار میں بڑی عزت تھی طلبہ کو گھر پر درس دیتے تھے، مدرسہ دارالبقاء کو از سر نو جاری کیا، طلبہ کے جملہ مصارف کے کفیل ہوتے تھے، دہلی میں مفتی صدرالدین آزردہ کی ممتاز حیثیت تھی، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جہاد کے فتوے پر دستخط کئے، جس کی وجہ سے گرفتاری، عزل منصب اور ضبطی جائداد کی نوبت پہنچی، چند ماہ کے بعد رہائی ہوئی، نصف جائداد واگذاشت ہوئی، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، سرسید احمد خاں بہادر نے آثار الصنادید میں ہر زبان کا نمونہ کلام درج کیا ہے۔ رسالہ منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد والرحال دار المنضود فی حکم امراۃ المفقود اور مجموعہ فتاویٰ یادگار ہیں، ریختہ گو شعراء کا ایک تذکرہ بھی لکھا، قریب تین لاکھ کی مالیت کا کتب خانہ تھا جو ۱۸۵۷ء میں ضبط ہو گیا، اس کے حصول کے لئے لارڈ لارنس کے پاس لاہور پہنچے مگر کچھ حاصل نہ ہوا، مرزا غالب، مومن، مصطفےٰ خاں شیفتہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے خوب تعلقات تھے، سرسید احمد خاں بہادر، نواب یوسف علی خاں والی رامپور، نواب صدیق حسن خان قنوجی مولوی محمد قاسم نانوتوی مولوی محمد منیر نانوتوی اور مولوی رشید احمد گنگوہی وغیرہ مفتی صاحب کے شاگرد تھے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں انتقال ہوا، شمس الشعراء مولوی ظہور علی نے یہ تاریخ انتقال لکھی ہے ؎

(باقی صفحہ ۲۷۲ پر)

سفر میں رہے، جنرل اور اس کے داماد کی کلید دانش رہے، چار سو روپے تنخواہ ملتی تھی صاحب ممدوح نے ان کی تعریف میں دفتر صدر کو لکھ مارے اور اس قدر ان پر اعتماد تھا کہ اول سہ سال اور راجہ جے پور کی والدہ کے درمیان تکرار کے قضیئے میں مفتی صدر الدین کو پولٹیکل ایجنٹ پر امین مقرر کیا، فاضل، زود فہم، خوش تقریر دوست نواز اور دشمن گزار ہیں، ان کے بزرگوں کی اصل کشمیری ہے اور اقربا مولوی رشید الدین خاں ہیں، جس وقت بندے (مولوی عبد القادر) نے ان کو دیکھا تھا ان کی توجہ اشعار ریختہ اور فارسی کی طرف مطالعہ کتب علمیہ سے زیادہ تھی اسی بناء پر میں نے ان کا ذکر شعراء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۱ سے آگے) چہ مولانائے صدر الدین کو در عصر | امام اعظم آخر زمان بود
زہے صدر الصدور نیک محضر | بعدل و داد چون نوشیروان بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت | کہ این عالم نہ جائے جاودان بود
ربیع الاول و بست و چہارم | وداع او سوئے دار الجنان بود
ظہور افسوس آن استاد ذی قدر | پدر وارم ہمیشہ مہربان بود
چراغش ہست "تاریخ ولادت | کنون گفتم "چراغ دو جہان بود"

سنہ ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء — سنہ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:-

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۴۲ - ۵۱
(۲) حدائق حنفیہ ص ۴۸۱ - ۴۸۳
(۳) تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۰ - ۲۴۹
(۴) ابجد العلوم ص ۹۱۷
(۵) تاریخ داستان اردو ص ۱۸۳ - ۱۸۴
(۶) گلشن بے خار از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ سنہ ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء) ص ۱۰ - ۱۱
(۷) العلم کراچی جولائی ستمبر ۱۹۵۹ء ص ۱۰۴

کے سلسلے میں کیا ہے ورنہ ان کا کام یہ نہیں ہے بلکہ یہ بات ان کے لئے باعث عار ہے، ان کا یہ شعر مجھے یاد ہے ؎

یا تنگ نہ کر، ناصح نادان مجھے اتنا یا مجھکو دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

ایک دوسرے شخص کی زبان سے ایک شعر اسی غزل کا سنا جو خود کی طرف نسبت کرتا تھا

مکھڑا وہ بلا، زلف سیاہ فام وہ کافر کیا خاک جئے جس کی شب ایسی سحر ایسی

میری رائے میں یہ دونوں شعر ممکن ہے کہ ایک شخص کا کلام نہ ہوں مگر دوسرے کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جاسکتا۔

مولوی امام بخش صہبائی:۔ تخلص ان کا صہبائی[1] ہے، فارسی کتابیں پڑھانے میں اس شہر کے

---

[1] مولوی امام بخش صہبائی ابن مولوی محمد بخش، آبائی وطن تھانیسر تھا، دہلی میں مولانا عبد اللہ خاں علوی سے تحصیل علم کی فارسی زبان کے بڑے عالم محقق تھے، ۱۸۴۰ء میں چالیس روپیہ ماہانہ پر دہلی کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے اس زمانے میں (۱۸۴۲ء) شمس الدین فقیر کی تصنیف حدائق البلاغت کا اردو ترجمہ کیا، مولانا امام بخش صہبائی نے فارسی کی بعض نہایت ادق کتب درسیہ "سہ نثر ظہوری" وغیرہ کی شرحیں بڑی تحقیق کے ساتھ فارسی میں لکھی ہیں، سر سید احمد خاں سے صہبائی کے خاص تعلقات تھے انھوں نے آثار الصنادید کی ترتیب میں سر سید احمد خاں کو بڑی مدد دی تھی، آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا اس میں عمارتوں کے حالات صہبائی نے لکھے تھے، قلعہ شاہی سے بھی صہبائی کی رسم و راہ تھی شاہی خاندان کے بعض افراد ان کے شاگرد تھے، شعر و سخن میں ان سے مشورہ کرتے تھے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں جن لوگوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ان میں صہبائی بھی تھے، مولوی امام بخش صہبائی کو مع ان کے دو فرزندوں کے گولی ماردی گئی اور مکان کو کھود کر زمین کے برابر کردیا گیا، مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے کس درد سے کہا ہے ؎

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مولوی امام بخش صہبائی نے شعرائے اردو کا ایک انتخاب کیا تھا اور اردو صرف و نحو پر ایک اچھی کتاب لکھی جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی شامل ہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۹۸-۱۰۳ (۲) غدر کے چند علماء از مفتی انتظام اللہ شہابی مطبوعہ دہلی ص ۵-۲۸ (۳) مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۲/۱۵۳ (۴) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۲۲۳/۲۲۴ (۵) خطبات گارساں دتاسی ص ۹۴/۹۵ (۶) گلستان سخن ص ۲۲۴/۲۲۵

ناموروں میں سے ہیں۔ اگرچہ عربی علوم درسیہ سے چنداں لگاؤ نہیں، نثر فارسی بھی اچھی لکھتے ہیں اور فارسی نظم کے مختلف اقسام میں فارسی اشعار کہتے ہیں، مگر اس وقت مجھے اس میں سے کچھ یاد نہیں، نہایت سلیم الطبع اور نیک دل ہیں، ان کے حسن خلق کو دیکھتے ہوئے مجھے تعجب ہے کہ جناب مولوی صدرالدین سے فن فارسی بلکہ ہر بات میں کیوں جھگڑتے رہتے ہیں۔

علم و ہنر کی کساد بازاری کی وجہ سے معلمی پر گذر اوقات ہے، ایک ہندو سیٹھ کے دو لڑکوں کو جنہیں دوسرے معلم ان کی تعلیم "طوطی کی زبان کوے کے بچوں کو سکھانا" سمجھ رہے تھے ایسا لکھنا پڑھنا سکھایا کہ گفتار میں انسان جیسے ہو گئے، لیکن لڑکوں کے وحشی سیرت باپ نے جس معاوضے کا وعدہ کیا تھا، اس کے پورا کرنے میں پہلوتہی کی اور اس مظلوم (مولوی امام بخش صہبائی) نے اپنا حال صاحب عدالت تک پہنچایا معلوم نہیں فریاد رسی ہوئی یا نہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کی زبان:۔ اکثر لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے محاورے میں جب اختلاف ہو تو ترجیح کس کو دی جائے یہ اختلاف بھی آپس میں تعصب کی وجہ سے شیعہ اور سنی اختلاف کے قریب قریب ہو گیا ہے، میری رائے یہ ہے کہ زبان ریختہ اردو کا مولد شاہ جہان آباد اکبرآباد، لاہور اور سندھ ہے، اس لئے کہ مسلم سلاطین کا قیام ان ہی مقاموں میں رہا ہے اور ہندوستان کے باشندوں کی ضرورت سے شاہی لشکریوں کے بعض الفاظ ہندی میں داخل ہو گئے اور اکثر ہندی الفاظ لشکریوں کی زبان پر جاری ہو گئے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان دونوں زبانوں کا اختلاط اس حد تک پہنچا کہ لشکری ہندو بعض ہندی الفاظ کے معانی بھول گئے اور بعض ہندی الفاظ فارسی زبان میں داخل ہو گئے، خصوصاً دفتر مال اور محاسبے میں، اب ان الفاظ کی ریختے میں گنجائش نہیں رہی جنہیں شہری ہندو کبھی زبان پر نہیں لاتے۔

تذکیر و تانیث کے متعلق اس کا سماعی ماخذ ہندوؤں کی زبان برج ہے جو اس سرزمین میں مدتوں سے ہندو اور مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں رہی ہے، پنجاب اور بنگال کے محاورے میں اصل تذکیر و تانیث ہندی الفاظ کی سنی ہوئی ہے، اسی طرح وہ شہر جو دریائے شور کے قریب ہیں، البتہ سندھ اور ملک مارواڑ جو سندھ سے ملا ہوا ہے اس میدان میں نہیں ہے، بلکہ ملک وسط جو دوآبے میں ہے، دریائے جمنا اور گنگا کے قریب بقدر پچاس پچاس کوس،

کاشی، اودھ، مالوہ اور بندیل کھنڈ بھی اس میں شریک ہیں، مگر اس کا یہ ہے کہ سرحد کے باشندوں کو زیادہ تر دوسرے ملک کے آنے والوں سے معاملہ رہتا ہے اس لئے وہ آنے والوں کے طرز کلام اور لہجے کو بہت جلد لے لیتے ہیں، بلکہ اگر آنے والے شاہی لشکر ہوں تو لشکر کے طرز گفتگو کو دوسرے لوگوں پر اپنے رعب اور شان و شوکت کا سبب سمجھتے ہیں، مثلاً بنگال میں مش کو بھیڑ کی آخر میں "ی" کی زیادتی سے کہنا انگریزی لہجے کی تقلید میں رواج پا گیا، اسی طرح کالا مٹی، اور رامپور میں لفظ آواز کی تذکیر افغانوں کی پیروی سے ہندیوں کی زبان پر بھی جاری ہے پنجابیوں کی تقلید میں لفظ دہی یعنی جغرات کو مونث نہیں کہنا چاہیئے بلکہ دوسرے ہندوؤں کے محاورے کے مطابق مذکر کہنا چاہیئے، دوسری زبانوں کے الفاظ جو ہندی زبان میں مستعمل ہیں اور مغلوں نے ان کو اپنے محاورے میں مذکر استعمال کیا ہے، ان کو مذکر بولنا چاہیئے لیکن وہ الفاظ کہ جن کے ہم معانی یا جن کے آخری حروف ہندی الفاظ کے موافق مونث سنے ہوں، یا ہندی میں ان کے انواع واقسام کو مونث پایا ہو۔ مونث بولنے چاہئیں، ایسے الفاظ میں اکثر یہ طریقہ رہا ہے کہ دہلی آگرہ اور فیض آباد میں تذکیر و تانیث کا فرق نہیں ہوتا اور اگر اب لکھنو اور دہلی میں فرق ہو جائے تو ان دونوں مقاموں کے لوگوں کا محاورہ جس کے بھی موافق ہوگا اسی کو ترجیح ہوگی، اور ہندی کے علاوہ سُنے ہوئے الفاظ کی تذکیر و تانیث میں لکھنو والوں کو چاہیئے کہ دہلی کے ان شعراء کی اقتداء نہ کریں جو فیض آباد اور لکھنؤ میں آ گئے ہوں بلکہ نواب سالار جنگ کے خاندان اور ابو المنصور ..... صفدر جنگ کی اولاد کی تقلید کریں۔

دہلی کے محاورے سے مراد شہر پناہ سے باہر کی زبان نہیں ہے جیسا کہ مغلپورے کے باشندے پتھر یعنی سنگ کو پھتر بولتے ہیں اور نہ شہر کے اندر سب کی زبان کا نام ہے کیونکہ کشمیری کٹڑے کے لوگ "خدا کے واسطے" کی بجائے "خدا کا واسطا" کہتے ہیں، اور پنجابی دہی کو مونث اور دائیں بائیں یعنی چپ و راست کو "سَجا کھبا" اور علاقہ سونی پت وغیرہ کے لوگ جو شاہجہاں آباد میں آبسے ہیں، اب تک "یہ بات کہنی نہیں" یعنی "این سخن گفتنی نیست" کی بجائے "یہ بات کہنی نہیں" بولتے ہیں اور روشن پورے کے باشندے نکلی کی بجائے "جو بمعنی آمد" کے معنی ہیں "نکسی" اور "چچا" یعنی عمو کو چاچا "کہتے ہیں، بندیلکھنڈ اور کابلی کے لوگ "والہ" کی جگہ جو نسبت کا کلمہ ہے۔ "ہارا"

کہتے ہیں یہ محاورے شاہ جہاں آبادی اُردو کے نہیں ہیں بلکہ بنگالی، مغل بچے یا ہندی فرنگی دوغلے کلمہ "ہارا" کو اُردو ظاہر کرتے ہیں، سندی محاورہ قلعہ مبارک، قلعہ کے دہلی دروازے کھڑ کی فراشخانہ اور بازار خانم تک ہے

تخفیف الفاظ میں مثلاً ادھر بجائے ایدھر" اور کدھر بجائے کیدھر" میں لکھنؤ حق بجانب ہے، شاہ جہاں آباد کے لوگ جن کو اس سلسلے میں خود اختیاری حاصل ہے، حتیٰ کہ مقامات کے ناموں میں بھی تخفیف کر کے سُونی پت کو سنیپت کر دیا اور دوسرے الفاظ میں بھی کہ" چاچا" کو "چچا" بنالیا جب لکھنؤ میں جا کر مقیم ہونے تو کیوں مجبور ہوئے۔ محاورے کی سند میں شہر دو طرفہ پتھر اور اینٹ کی دیوار نہیں ہے، بلکہ اس شہر کے فصحاء کا نام ہے کہ جہاں بھی ہوں [1]

اس زمانے میں دونوں شہروں (دہلی اور لکھنؤ) کے فصحاء نے بعض الفاظ کے ترک میں اتفاق کر لیا ہے[2]، جیسے اُور (طرف) جگ (جہاں) بھیتر (اندر) بعض دوسرے الفاظ مثلاً تروار اور تلوار یعنی شمشیر کہ دہلی کی بول چال میں پہلا (تروار) اور لکھنؤ کے محاورے میں دوسرا (تلوار) استعمال ہوتا ہے، چونکہ یہ ہندی لفظ ہے اور دیہاتی ہندو تروار بولتے ہیں، اس لئے دہلی کا محاورہ پختہ دلیل ہے، انصاف یہ ہے کہ دہلی کی پیروی کریں اور اگر اس وجہ سے کہ اب وہاں (لکھنؤ) کا ہر ایک امیر و فقیر انگریز کی حمایت کی بنا پر دہلی کے اتباع سے غیرت رکھتا ہے تو انھیں اختیار ہے، لیکن دوسروں کو بے جا مواخذے سے معاف رکھیں۔

ایک لفظ ہے کہ ہندوؤں میں "بھاری" مستعمل ہے اور شاہجہاں آباد والے "بھاری" کو چھوڑ دیتے ہیں، اسی طرح اندھیاری یعنی تاریکی کہ دہلی کے استعمال میں شروع سے "اندھیری" تخفیف کے ساتھ ہے، اب کسی کو اندھیاری بڑھا کر لکھنا اور کلمات فارسی و عربی کو اُردو زبان کے اشعار میں نئے سانچے میں ڈھالنا نہیں چاہئے، اہیر کھتری اور دوسرے نو مسلم جو ابھی اپنی

---

[1] اس بحث کے لئے ملاحظہ ہو دریائے لطافت از انشاء اللہ خاں انشاء (انجمن ترقی اُردو ہند اورنگ آباد ۱۹۱۶ء) صفحہ ۹ - ۳۱

[2] اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو دلی کا دبستان شاعری ص ۴۲-۳۹۸

مادری زبان کو بھولے نہیں تھے کہ اسی زمانے میں لکھنؤ میں ایک گروہ عہد آصفی سے برگشتہ ہوگیا اور بہت کچھ پس وپیش کرنا پڑا۔ اس نے ان لوگوں میں جن کی اصلی زبان پچاس سال پہلے "متفکری ما فکر یہ" ہے اور آپ کی تقسمتی بڑا اعتبار حاصل کرلیا اور جو چاہا کہہ ڈالا۔

گھوڑے کی ایک آنکھ بند ہوتی ہے، جس کو اصل ہندی زبان میں اندھیری تخفیف کے ساتھ بولتے ہیں، حاکم اودھ کے اصطبل میں بھی اس لفظ کے علاوہ دوسرا نہیں ہے اگرچہ میرتقی سے لیکر میر انشاء اللہ خاں اور مصحفی تک بلکہ دہلی اور لکھنؤ کے تمام شعراء اندھیاری، اسی معنی میں بولتے ہیں، لیکن جب تک لشکریوں اور سائیسوں میں عام نہ ہو جائے لغت گرشمار ہوں گے نہ کہ محاورہ داں اور مرزا رفیع سوؔدا نے ایک شعر میں جو شیدی فولاد خاں کی ہجو میں ہے

"چور جاتے رہے کہ اندھیاری"

کہا ہے، لوگوں نے گمان کیا کہ اس زمانے میں "اندھیاری" بمعنی تاریکی اردو میں مروج تھا، یہ نہ سمجھے کہ یہ ایک مشہور مثل ہے۔ اور امثال میں تغیر جائز نہیں اگر اب کوئی انگریزی یا رومی لفظ اُردو میں نیا داخل کریں تو اس کی تذکیر وتانیث اس جیسے فارسی اور عربی لفظ کی تذکیر وتانیث کے مطابق ہوگی اور آج کل لکھنؤ میں "جان وگمان" کے نون کو شعر میں ظاہر کرنا چھوڑ دیا ہے اور شاہ جہاں آباد میں جاری ہے، یہ خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی ہے کیونکہ نثر میں نون کو نہیں چھوڑا ہے اور ہر جگہ بعض چیزیں نظم میں جائز رکھی ہیں اور نثر میں منع کرتے ہیں اور تعلقات وزن وقافیہ کے علاوہ کونسی چیز ایسی ہے جو نثر میں جائز ہو اور نظم میں ناجائز، اور اگر کوئی ہائے مختفی (پردہ، بندہ) کو الف (دعویٰ، چلنا) کے قافیہ میں جو ریختہ میں مروج ہے ترک کردے تو بہتر ہے، مگر دوسروں کو منع نہیں کرسکتے۔ بادشاہی جلوس کے آرائشی سامان میں دہلی، آگرہ بلکہ شوالہ بنارس کے محاورے کو لکھنؤ کے محاورے پر ترجیح ہے، کیونکہ ان مقامات پر تین سو سال سے یہ سامان مروج ہے اور لکھنؤ میں تیس سال بھی ابھی نہیں ہوئے پس "چنور، ڈھلنا" بالکل فصیح ہے۔ کیونکہ دہلی کے ہر شاہ و گدا کے روزمرہ میں شامل ہے، ماخذ اس کا راجپوتانہ ہے اور ایک کلیہ

لہ لفظ "فکر" کے مؤنث ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، جو اہل دہلی میں عموماً مذکر بولا جاتا ہے۔

بتاتا ہوں جس سے زباں داں کو بوزنہ سرشت مقلد سے ممتاز کر سکو گے۔

اُردو زبان میں عربی و فارسی لغات۔ جس کسی کی اُردو نظم و نثر میں فارسی، عربی اور ترکی کے الفاظ کے مقابلے میں ہندی کے رائج الفاظ زیادہ ہوں تو وہ زبان داں ہے اور اگر دوسری زبان کے لغت کا ہندی پر غلبہ ہے تو وہ اس راستے کا مرد نہیں ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس حیلے سے اپنی کم مائگی کا عیب چھپالے، خاص طور سے وہ لفظ جس کو عام اُردو دانوں کے علاوہ فارسی جاننے والے بھی نہ سمجھتے ہوں، غرابت کے عیب کی وجہ سے فصاحت میں خلل انداز ہے خواہ شہر دہلی کا استاد کہے یا لکھنؤ کا سحبان فرمائے خواہ آگرہ کی ہزار داستان زبان سے یا بلب گڑھ کے طوطی دہن سے نکلے[1] عصافیر[2]، ثناء، نشیمن چشم غول اُردو کی عاشقانہ غزل میں اور رکوب آمادہ[3]، تعالی اللہ چہ فندق[4] چہ انگشت، نادرہ کار، حبذا[5]، یلے[6]، مثنوی افسانۂ عشق میں ایسے کان میں کھٹکتے ہیں گویا کوئی سر شام ہی بے ہودہ راگ گا رہا ہے البتہ جہاں خواص مخاطب ہوں جیسا کہ اکثر قصائد اور مسائل علمیہ کے بیان میں اتفاق پڑتا ہے تو اس جماعت کے مستعمل الفاظ لانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مثلاً اگر کوئی احمد شاہ درانی اور بھاؤ کی جنگ کو اس عبارت سے بیان کرے کہ:

"جب دلی سے لے اودھ تک مغل پٹھان کا مرہٹے کی چڑھائیوں سے جی ناک میں آیا، سب نے آپس میں ایک ہو کے یہ ٹھیرایا کہ نجیب خاں کو بیچ میں ڈال کے ٹوپی والوں کو بلا دیں اور لیے ساتھ لے کر برگیوں پر چڑھ جاویں جب بات پکی ہوئی تو اسے لکھا کہ آپ جس دن سے ادھر کو چلیں اور ان دکھنی لٹیروں سے جب ہمارا سامنا ہو تو آپ ہمارے سر پہ ہاتھ رکھیں جو ٹھیرا دیں سو ہم سے جھگڑا ابنٹے پیچھے ترت لیں وہ یہ سنتے ہی نجیب خاں سے سب بات ٹھیک کر کے اپنے کیل کانٹے، گھوڑے ہتھیار سے بن سنور سورما تر وریوں کو اپنے ساتھ لے کے چلا اور دکن سے

---

[1] مؤلف کے ذہن میں ہر مقام کی ایک خاص شخصیت ہے جس کا اس نے اظہار نہیں کیا ہے بلب گڑھ کے طوطی دہن سے مراد مصحفی ہیں۔

[2] چڑیاں		[3] آمادہ سواری

[4] کیا ناخن کے پورے اور کیا انگلیاں ہیں		[5] تعجب خیز

[6] مرحبا		[7] نعرہ تحسین

برگی ٹیڑھی دل دوڑے، بات کی بات میں پانی پت پر دونوں دلوں کا جماؤ ہوا، ادھر والوں نے دیکھا کہ ہم برگیوں کے آگے جیسے آٹے میں لون ہیں، سنگرا اپنے آس پاس باندھا اور برگیوں نے گھیرا ڈالا سنگر والے بھوک سے مرنے لگے تو مرتا کیا نہیں کرتا سب نے یوں ٹھانی کہ باہر نکل کے برگیوں سے دو دو ہاتھ کریں، ٹوپی والے تو ادھر سنگر سے نکلے اور کچھ دائیں بائیں بچکر گوبند پر جب وہ دکن سے آتا تھا گئے اور ادھر مرہٹوں کی مت کٹ گئی کہ انھوں نے سنگر باندھا اب تو ٹوپی والوں کا کھیل بن گیا اور وہ چال چوکے، ادھر کے تو چھکے چھوٹ گئے اور ادھر پو بارہ، اور جب ٹوپی والے گوبند کا سر کاٹ لائے اور احمد شاہ نے بھاؤ پاس بھیجا وہ دیکھتے ہی نیچے اوپر دیکھنے لگا اور سر پکڑ کر رہ گیا، اور بولا کہ پانسا پڑے سو داؤ، دیکھا چاہیئے کون جیتے کون ہارے، گوبند کا مارا جانا مجھے پکار سے کہتا ہے کہ جگ لوٹا کوٹ مری، اس کے پیچھے ایک دن دونوں دل آپس میں بھڑ گئے یہاں تک کہ لہو کی ندیاں بہیں اور بھاؤ مارا گیا، برگی سب کے سب جس کا جدھر کو منہ اٹھا چل دیا کھیت ٹوپی والوں نے لیا اور لوٹ بہت ہاتھ لگی، دکھنی نربدا پار اتر گئے، مغل پٹھان کا منہ اجالا ہوا، ٹوپی والے کا بول بالا ہوا وہ یہاں سے جو ٹھیرا تھا وہ بھی اور بہت سا کچھ لے کے اٹک پار گیا، یہ سب اپنے اپنے ٹھکانے دندناتے منگل گاتے آئے ۔"

اس داستان میں نہ اردو کے خلاف کوئی لفظ ہے نہ کوئی فارسی وغیرہ کا لغت اور دوسرے کا طرز بیان اس طرح ہے کہ :۔

"جب دارالخلافہ شاہجہاں آباد سے لے تا بصوبۂ اودھ قوم مغلیہ وافاغنہ کے قلوب جنوبیوں کی یورش سے قریب حناجر کے پہنچے کلھم اجمعین نے باہم کنفس واحدہ ہو کے یوں استقرار دیا کہ بوساطت نجیب خاں کے صاحب القلنسوہ کو بلاویں اور اس کی معیت میں جنوبیوں پر یورش کریں جب یہ رائے اذہان میں مستقر و مستحکم ہوئی تو اس سے درخواست کی کہ جناب والا جس یوم مسعود سے اس سمت کو نہضت فرما ہوں اور ان جنوبی قطاع الطریق سے جب ہماری رویا روئی ہو ظل عاطفت ظل الٰہی ہمارے مفارق پر رہے اور جو امر فیصل معین فرماویں معتقدین با اخلاص سے بعد طے منازعت کے بہ تعجیل رقم قبض میں لاویں وہ

بمجرد استماع کے نجیب خاں سے کل امور متیقن الوقوع فرما کے اپنے مسمار و قلاب و خیل و
اسلحہ سے مرتب و مزین ہو کے ابطال سیافون کو اپنی معیت میں لیکے روانہ ہوا اور جنوبی برگی
بھی بجنود لاقبل لہا کبرق خاطف آئے مستقر عسکرین کالمح البصر میں، پانی پت ہوا اس جماعت
نے بعیون بصیرت مشاہدہ کیا کہ برگیوں کے جنب میں باعتبار قلت کالملح فی الدقیق ہیں، حصار
خشبات حول اپنے نصب کیا اور برگیوں نے محاصرہ کیا، متحفر جوع سے معدوم ہونے لگے،
بقول مشہور الفریق یتشبث بکل حشیش یوں عزم جزم کیا کہ بروز کر کے برگیوں سے ضرب و
حرب کرلیں اصحاب القلانس تو ادھر حصار سے بارز ہوئے اور بعضے یمین و یسار بچسکر
گوبند پر جو وہ جنوب سے جاتے تھا، گئے اور ادھر مرہٹوں کی حبل عقل قطع ہوگئی کہ انھوں
نے حصار خشبی نصب کیا، اب اصحاب القلانس کا لعب درست ہوگیا اور سلوک مسلک
خیر کے ناشی ہوا، اور ادھر خیلان الکعاب حسب طلب واقع، اور جب اصحاب القلانس
راس گوبند قطع کر لائے اور احمد شاہ نے بھاؤ پاس ارسال کیا، بمجرد معاینہ اس نے نظر
بجانب تحت و فوق کی اور اخذ الراس بالید کر کے یہ مقال کیا کہ بناء فخار وقوع خیلان الکعاب
ہے، اب تذبذب ہے کہ کون مظفر اور کون منہزم ہو، قتل گوبند باعلیٰ صوت مجھے کہتا ہے کہ
تفرقہ جمع موجب قتل افراد ہے، من بعد ایک یوم میں تلاقی فئتین عظیمتین ہوا، اور قتال ہوا
اور برگی باجمعہم متفرق خار ہوئے اور معرکہ مقبوض اصحاب القلانس ہوگیا، اور غنائم
وافرہ پر متصرف ہوئے، جنوبی زبدا سے عبور کر گئے مغل پٹھان کا وجہ انور ہوا، اور صاحب
القلنسوہ کا قول ادفع، وہ ما تقرر کے علاوہ مال کثیر یہاں سے اخذ کر کے نہر اٹک سے عابر
ہوا اور بتخترانہ غنا کرتے ہوئے اپنے اپنے مقر میں آئے"

پہلی عبارت انشاء اللہ خاں کے افسانہ کی سی ہے کہ اس میں سوائے ہندی الفاظ
کے دوسری زبان کا لغت نہیں آیا اور دوسری عطا حسین خاں کے قصہ چار درویش کا طرز
ہے۔ جو عربی فارسی کے الفاظ شہری اور دیہاتی عوام کی زبان پر جاری ہیں، ان کے
بدلے ہندی الفاظ لانا ریختہ سے دور ہے جیسے باغ و بہار، گلاب، عرض (گذارش) حاکم،
راضی، خوشی، عقل، یاد، حویلی، تنور، دیوار، شہر، شاید لوگ یہ خیال کریں کہ اردو نظم اس

طرز کی بدنما معلوم ہوگی اس لئے اُردو زبان کی تھوڑی ہر قسم کی نظم جو دوسرے نکات سے خالی ہے قلم برداشتہ لکھتا ہوں۔

مثنوی

میلے میں ایک بنیا رات بیٹے سے کہتا تھا بات
بڑا بول مت مُنہ سے نکال اور چلا چل سیدھی چال
پوچھیں مول تو جھوٹ نہ بول جو تو لے سو پورا تول
چاول آٹا گڑ اور دال سب کی ایک ایک ڈھیری ڈال
چھان پھٹک کر بیچا کر مول پرکھ، تھیلی میں دھر
ایک تو دیوے پیسے چار ایک کہے دس کرے اُدھار
چار کو لے اور دس کو چھوڑ بیچ چکے تب بکری جوڑ
پھر یہ جانچ کہ آیا کیا کیا رکھا اور کھایا کیا
پونجی کو مت ہاتھ لگا بڑھتے میں کچھ رکھ کچھ کھا
اسی ڈول سے تو دن کاٹ نہیں تو بیٹھ اُلٹ کر ٹاٹ

رباعی

جبتک چلیں ہاتھ پاؤں پھر چل کے کما کچھ اس میں سے کھا اور بھوکوں کو کھلا
مت ڈر کہ جو تھک جاؤں گا کیا کھاؤنگا جب پیٹ میں تھا ماں کے تو کیا کھاتا تھا

قطعہ

جی لگا اس سے جو تجھے چاہے اور مرتے تلک کر ایسی نباہ
کہ جو وہ ڈالدے کنویں میں تجھے رہے ویسی ہی جیسی تھی تیری چاہ
جو کرے وہ سو تو کہے اچھا جو کہے تو، تو سن کے وہ کہے واہ

غزل

ملے ہم روٹھ کے ان سے جب سے — نہ رہی بات ہماری تب سے

اب وہ سُنتے ہی نہیں بات مری — ہنستے ہیں بولتے ہیں اور سب سے

آج تک تو ہے ڈھٹائی سے نباہ — دیکھئے آگے بنے کس ڈھب سے

پھر دل رہتا ہوں کھڑا، تو بھی یہ بات — نہیں کہتے کہ کھڑے ہو کب سے

چین دے جی تو یہی ٹھانی ہے — کہ نہ جاؤں میں گھر ان کے اب سے

میدان سخن تو بہت کشادہ ہے اور فرصت کم اس وقت اسی پر بس کرتا ہوں اور اس پر بحث کا اختتام کرتا ہوں۔

میر تقی میر[1]:۔ دوسری زبان کے الفاظ خواہ فارسی ہوں یا عربی غلط نہیں لاتے ان کی نظم میں جہاں بھی جو حرکت ہے نرالی ہے، تعقید بھی ان کے کلام میں کم ہے، کلمات کو با موقع استعمال کرنا اور تراکیب کی چستی میں میرؔ اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، لیکن کوئی تازہ مضمون ان کے دیوان میں

---

[1] محمد تقی نام ۳۶-۱۱۳۵ھ / ۲۳-۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے، اکبر آباد کے رہنے والے تھے، باپ کے مرنے کے بعد دہلی آئے ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی، پہلے مختلف رؤسا اور امراء سے وابستہ رہے لیکن جب دہلی بالکل تاراج ہو گئی اور سوداؔ کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا تو ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ پہنچے طبیعت میں نزاکت اور گرفتہ مزاجی بہت تھی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا، میرؔ کے کلمات میں قصائد، مستزاد، مثنویاں، واسوخت، مخمس، ترجیع بند، مثلث اور مربع قطعات سب کچھ موجود ہیں، لیکن غزل کے چار دیوان اور بعض مثنویاں میرؔ کا ایسا سرمایہ ہیں جن سے ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا، فارسی نثر میں تذکرہ نکات الشعراء، رسالہ فیض میر اور ذکر میر چھوڑا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔

(۱) ذکر میر از میر تقی میرؔ مرتبہ مولوی عبدالحق (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۲۸ء)

(۲) میر تقی میرؔ حیات و شاعری از خواجہ احمد فاروقی (انجمن ترقی اردو ہند علیگڈھ ۱۹۵۴ء)

(۳) دلی کا دبستان شاعری ص ۱۲۲ - ۱۶۹

(۴) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۴۰ - ۱۴۹

(باقی صفحہ ۲۸۳ پر)

کم ملے گا۔ فارسی اشعار کا بعینہٖ ترجمہ ان کی ابیات میں بہت [۹] ہے، غالباً میر نے دوسروں کو نظم کا ترجمہ نظم میں کرنے کا طریقہ سکھانے کے لئے قصداً ایسا کیا ہوگا، میر فرماتے ہیں:۔

تیرے قدم کا ہوگا جس جا نشاں زمیں پر
رکھیں گے سر کو اکثر صاحبدلاں زمیں پر

حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

میر حروف جار مثلاً سے، پر، کو، تک وغیرہ خوب موقع سے لاتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ریختے میں شہریوں کے لئے ایسا استاد چاہیئے جس کے یہاں ہندی اور دوسری زبانوں کے مفردات برابر کے ہوں، کیوں دوسری زبان کے الفاظ کی چست یا سست بندش اور حروف روابط کا استعمال خواہ عام شہریوں کی بول چال میں ہو یا خاص لوگوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۲ سے آگے) (۵) تذکرہ ریختہ گویاں از فتح علی حسینی گردیزی (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء) ص ۱۳۷-۱۳۸

(۶) تذکرۃ الشعرائے اردو ص ۱۵۱-۱۵۷

(۷) نکات الشعراء از میر تقی میر مرتبہ مولوی عبد الحق (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء) ص ۱۷۴-۱۷۸

(۸) مخزن نکات از شیخ محمد قیام الدین قائم مرتبہ مولوی عبد الحق (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۲۹ء) ص ۴۰-۴۱

[۹] ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:۔

"میر کی کرشمہ آفرین طبیعت نے ہندی اور فارسی کے خوبصورت امتزاج سے اردو زبان کو وسعت بخشی اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ مختلف مضامین کو نظم کر سکے خود میر کے یہاں انداز بیان کا اتنا تنوع ہے کہ اس کو دیکھ کر اس کی قادر الکلامی پر ایمان لانا پڑتا ہے، اس نے مذہب حکمت، تصوف، اخلاق نفسیات، خمریات، حیات و کائنات کے ہر ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور سچ یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے"

میر تقی میر، حیات اور شاعری
(از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۳۹۶)

کی، باموقع ہونا چاہیئے، اور مفردات کلام سب کے یکساں ہوتے ہیں، ان چیزوں سے کلام کے حسن و قبح کے مراتب میں بہت فرق ہوجاتا ہے اور جناب میرؔ کے مفرد الفاظ اچھے نہیں کیونکہ کبھی ایک دم دیہاتی ہندی لے آتے ہیں اور کبھی قاموسی لغت [۱]

مرزا محمد رفیع **سوداؔ** :۔ مرزا سوداؔ قصیدہ گوئی اور تعریف و تنقیص کے تازہ مضامین میں اپنے زمانے کے سردار تھے [۲] مگر دوسری زبان کے الفاظ کی صحت کا چنداں خیال نہ رکھتے تھے آفتاب کی بجائے

---

[۱] ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں :۔

"میرؔ کی ذاتی زندگی اور اُن کے پُرآشوب ماحول دونوں نے ان کے عشق اور عقیدہ حیات دونوں کو یاس انگیز بنا ڈالا، وہ اس یاسیت کو اتنے موثر پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ دوسروں کے دل میں بھی نشتر کی طرح اُتر جاتے ہیں، اپنی بے کسی و بربادی اور دُنیا کی بے کسی و بربادی ان کے خاص موضوع ہو کر رہ گئے ہیں، اس حسرت زدگی کے باعث ان کے انداز میں ایسی صفائی و شستگی، سادگی و روانی آگئی ہے جسے متبسم سادہ پرکاری کہا جاسکتا ہے لیکن وہ محض ایک یاس انگیز لے ہوکر نہیں رہ گئے ہیں انھیں شاعرانہ فن بھی آتا ہے۔ اپنی تصویریں بہت مکمل اور لطافت کے ساتھ کھینچتے ہیں۔

اگر ان کے کلام سے رسمی شاعری کے اجزاء (جن سے ان کے دیوان بھرے پڑے ہیں) نکال دیئے جائیں تو یہ انتخاب دنیا کے بہترین انتخاب میں سے شمار ہوگا۔" (دلی کا دبستان شاعری ص ۱۶۴)

[۲] مرزا محمد رفیع سوداؔ دلی میں پیدا ہوئے، تاریخ پیدائش (۱۱۲۵ھ، ۱۱۱۳ھ) میں اختلاف ہے، بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا، باپ بسلسلہ تجارت ہندوستان آئے سوداؔ پہلے سلیمان قلی خاں کے اور بعد کو شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے، شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ان کی شاعری عروج پر تھی، رؤسا میں بسنت خاں خواجہ سرا اور مہربان خاں زیادہ مہربان تھے، جب مرہٹہ گردی میں دلی برباد ہوگئی تو سوداؔ نے باہر کا رُخ کیا پہلے فرخ آباد میں مہربان خاں رند کے یہاں رہے، ۱۱۸۳ھ مطابق ۱۷۶۹ء کے قریب فرخ آباد سے رخت سفر باندھا اور نواب شجاع الدولہ والی اودھ کے زمانے میں فیض آباد پہنچے، آصف الدولہ کے زمانے میں ان کی زندگی خوب فراغت سے بسر ہوئی، ۱۱۹۵ھ / ۱۱۸۱ھ میں انتقال ہوا، ان کی کلیات میں ۴۴ قصیدے رؤسا اور ائمہ اہل بیت کی مدح میں ہیں ان کے علاوہ ہجویں، مراثی، مثنویاں، رباعیاں، مستزاد، قطعات، تاریخیں پہیلیاں اور واسوخت وغیرہ (صفحہ ۲۸۵ پر)

آفتا ڈا، مُحَل متحرک کی جگہ مُحْل ، دوسرا حرف ساکن اور مُبرّہن میں ب مفتوح اور ر ساکن بجائے مُبَرْہن ب ساکن اور ر مفتوح لائے ہیں۔

جو لفظ عربی اور فارسی وغیرہ میں جس معنی میں مستعمل ہو اور وہ معنی اردو میں چھوڑ دیئے گئے ہوں اور دوسرے معنی میں اس کا استعمال عام ہوگیا ہو تو اردو میں اس کو اصلی معنی میں استعمال کرنا نہیں چاہیئے اور اگر کریں گے تو غرابت کے عیب کی بناء پر فصاحت سے گر جائے گا، جیسا کہ لفظ لحد کہ عربی اور فارسی میں قبر کے معنی میں مستعمل ہے اور اردو کے محاورے میں وہ جگہ ہے جہاں مردے کو غسل دیتے ہیں، اب اردو میں اس کو قبر کے معنی میں لانا بیلے اور ثناء کے استعمال سے بھی زیادہ بُرا ہے، کیونکہ یہ دونوں الفاظ اردو میں اجنبی اور دریافت طلب ہیں اور سننے والا ان کو اپنے اصلی معنی میں سمجھ کر پریشان ہوجائے گا، اور اس کی صورت ایسی ہوجائے گی کہ کوئی اردو میں کہے کہ "دم نکل گیا" اور مطلب اس کا یہ ہو کہ "خون نکل آیا" یا کال اور کالا کہکر یہ امید رکھے کہ مخاطب یہ اس نے وزن کیا یا اُنھوں نے وزن کیا" کے معنی میں سمجھ لے گا۔ یا "کانَ" کو بمعنی "تھا" اور ناک" کو بمعنی" جماع کیا" استعمال کرے تو ہندوستانی فاضل اگرچہ عربی لغت میں یہ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۴ سے آگے) سب چیزیں موجود ہیں، فاخر مکیں کے جواب میں ایک رسالہ تنبیہ الغافلین ہے ایک رسالہ سبیل ہدایت کے نام سے لکھا ہے۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:-

(۱) سودا از شیخ چاند ایم۔اے (انجمن اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ء)

(۲) دلی کا دبستان شاعری ص ۱۵۰-۱۶۱ (۳) لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۸۹-۹۹

(۴) میر و سودا کا دور از ثناء الحق (ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی ۱۹۶۵ء) ص ۲۷۰-۲۹۷

(۵) گل عجائب یعنی تذکرہ شاعراں از اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ء) ص ۵۰-۶۰

(۶) دو نایاب زمانہ بیاضیں اور ان کا انتخاب مرتبہ عبدالباری آسی (ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۱۹۳۲ء) ص ۲-۷۳

(۷) مخزن نکات ص ۳۵-۴۰

ع کرم خوردہ

معنی دیکھ چکا ہو لیکن اُردو میں ہرگز نہیں سمجھے گا، یا کوئی "مشفق" کو "خائف" کے معنی میں لادے اور کہنے لگے کہ قرآن شریف اور فوائد ضیائیہ میں اسی معنی میں ہے اور سودا کے مصرعہ "صید خائف کی طرح رو بقضا" جاتا ہوں کو "صید مشفق کی طرح" پڑھنے لگے تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اُردو میں لحد کے دوسرے حرف ح کو حرکت بھی دیدے کہ عربی لغت کی معتبر کتابوں میں ساکن ہے، خواہ عربی لغت والے ہوں یا ہندوستانی اُردو داں سب کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔[1]

کسی دوسری زبان کے لغت کو ریختے میں ہندی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی طریقہ پر صفت یا اضافت کا سا جوڑ لگانا سمجھدار کے لئے تو عیب ہے مگر مسخروں کا ہنر ہے، جیسے یہ مذاقیہ شعر ہے ؎

ٹانگِ افسریں جب لگا کولا بخت جھگٹ پکار کر بولا
ٹیکیٔ ہی قوت اب ضعیف ہوئی ہیزم آتش حریف ہوئی

اور اگر دوسری زبان کا کوئی لفظ جو ہندی لفظ کی جگہ پر اُردو میں مستعمل نہ ہو (اور بولنا چاہیں) تو بہتر یہ ہے کہ ہندی ترکیب کے طریقے پر ہو۔

جس قدر خرابیاں بیان ہوئیں ان سے مقصد اساتذہ کی عیب جوئی نہیں ہے، ہفت ہزاری[2] کو سب کچھ روا ہے لیکن دوسروں کے لئے قابل اقتدار نہیں کیونکہ بہت سی خوبیاں تھوڑی سی بُرائیوں کو چھپا لیتی ہیں، مجھ جیسے علوم شرعیہ عقلیہ اور قواعد ادبیہ، میں بے مایہ کو چاہیئے کہ جب کبھی بھلے آدمی کی غلطی کا یقین ہو جائے تو اس کی عیب جوئی نہ کرے اور نہ اس کو اپنا دستور العمل بنائے کیونکہ اگرچہ معاف ہو جائے مگر پھر بھی یہ اچھی بات نہیں ہے اور ایک قسم کی خطا ہے۔

---

[1] مصنّف کی یہ بحث نہایت صحت مندانہ رجحانات کا پتہ دیتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لسانیات کے اصولوں سے کما حقہ، واقف ہے۔

[2] بطور تعریض استعمال کیا ہے۔

یہاں پر میں نے اندازے سے زیادہ بے ہودہ سرائی اس لئے کی ہے کہ ایک گروہ کو میں نے دیکھا ہے کہ بزرگوں کے عیب نکالنا اس نے اپنا شیوہ بنا رکھا ہے، اور ان لوگوں کی روش شتر بے مہار کی طرح ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو پیر اور استاد کی اندھی تقلید کرتا ہے اور بلا تحقیق خطا کو صواب سمجھتے ہوئے اس کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کر لیا؟ جہاں تک ہو سکا میں نے افراط و تفریط کو اعتدال سے جدا کر دکھایا ہے۔

اکبر شاہ ثانی:۔ اب میں بادشاہ اور سلاطین قلعہ دھلی کا ذکر کرتا ہوں۔ جہاں پناہ معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی[1]، غصے کے بھوت پر جیسا قبضہ رکھتے ہیں ————

---

[1] اکبر شاہ ثانی، شاہ عالم کے بیٹے ۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے، علوم رسمی سے واقف تھے، صوفیائے کرام سے خاص تعلق تھا ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں تخت نشین ہوئے، رزیڈنٹ اور دیگر حکام کمپنی نے مراسم دربار ادا کئے، تیموری عزت کا ہمیشہ خیال رکھا جب لارڈ ہاٹرا نے دہلی کا رخ کیا تو نشست کے سلسلے میں سابقہ طریقے میں تبدیلی گوارا نہ کی، کمپنی سے تعلقات کچھ اچھے نہیں رہے، راجہ رام موہن رائے کو سفیر و وکیل بنا کر لندن بھیجا، راجہ رام موہن رائے نے ذاتی مفاد پر آقا کے مفاد کو قربان کر دیا، لہذا سفارت سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی میں بڑے بڑے علماء، فضلاء، شعراء، حکماء اور ادباء موجود تھے، سر سید احمد خاں بہادر نے کیا خوب قطعہ تاریخ کہا ہے:۔

چون برفت از جہان شہ اکبر — شد سیہ آسمان ز دود جگر
پائے شادی شکست و احمد گفت — سال تاریخ او "غم اکبر"

۱۲۶۳ - ۱۰ = ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء

تفصیل کے لئے دیکھئے:۔

(۱) THE PROCEEDINGS OF THE PAKISTAN HISTORY CONFERENCE (THIRD SESSION HELD AT DACCA 1853) KARACHI, 1955 (P. 269-280)

(۲) سیرت فریدیہ از سر سید احمد خاں بہادر (مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۶ء) ص ۱۰۶ - ۱۱۸)

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ سوم ص ۲۸۰

(۴) TWILIGHT OF THE MUGHULS, BY P. SPEAR LONDON 1951 (P. 2, 5, 29, 63, 64)

شاہ و گدا میں بہت کم مل سکے گا۔ گناہ کی پردہ پوشی میں یکتا ہیں، کہتے ہیں کہ ایک روز مشائخ کی محفل میں کسی نے مصافحہ کرتے ہوئے انگشت مبارک سے انگوٹھی نکال لی اور اُنھوں نے اب تک کسی پر اس مردود کا پردہ فاش نہ کیا بلکہ جان بوجھ کر چھپایا۔ کتابوں میں نوشیرواں کا ایک قصّہ ہے کہ ایک شخص نے سونے کا ایک گلاس چُرا لیا اور بادشاہ نے اسے دیکھکر کچھ نہ کہا، لوگ تلاش کر رہے تھے بادشاہ نے فرمایا۔

"جس نے دیکھا ہے وہ بتائے گا نہیں اور جو لے گیا ہے وہ واپس نہیں لائے گا" اس کے بعد وہ بہادر چور عمدہ لباس پہن کر بادشاہ کے سامنے آیا، بادشاہ نے اس سے کہا "یہ اسی کی رونق ہے"

انصاف تو یہ ہے کہ جس جگہ نوشیرواں کا قصہ لکھیں وہیں اکبر شاہ ثانی کے واقعے کو بھی سُنہرے حروف سے لکھیں اور دونوں کے فرق پر غور کریں۔ یعنی نوشیرواں نے اس شخص کو اس بات سے شرمندہ کر دیا اور دوسروں پر جب اُنھوں نے بادشاہ کا ارشاد سُنا، پردہ فاش ہوگیا اور بے انتہا مال و دولت کے باوجود آخر نوشیرواں نے چور کو متنبہ کر ہی دیا اور صبر نہ کر سکا اور یہ عالی ہمت (اکبر شاہ ثانی) اب بھی کہ اس کے قبضے میں سوائے دولتِ قناعت اور ملک مروت کے کچھ بھی نہیں ہے، اس جڑاؤ انگوٹھی کو اپنی سخاوت کی کنجی کے خوشنما چھلے سے بھی کم سمجھتا ہے، ان دونوں واقعات میں بندہ خدا (اکبر شاہ ثانی) اور آتش پرست (نوشیرواں) کا فرق دیکھ لیں۔

سلاطین قلعہ دہلی مرزا ابوجعفر:۔ نیکوکار، بے آزار، روزہ نماز کا پابند عربی خط (نسخ) میں خوشنویس اور اردو زبان کا شاعر ہے [1]

مرزا سلیم:۔ اس کا مبارک نقشہ کیخسرو جیسا ہے، اور اس کا کام قبلۂ عالم (اکبر شاہ ثانی) کی متعین حاضر باشی ہے، اکثر حضور والا ہاتھی کی سواری میں اسکو خواصی کا اعزاز بخشتے تھے [2]

---

[1] مزید حال معلوم نہ ہوسکا

[2] مرزا سلیم پر اکبر شاہ ثانی بہت اعتماد فرماتے تھے، ۱۸۱۶ء میں جب لارڈ ایمہرسٹ نے (باقی صفحہ ۲۸۹ پرملاحظہ)

مرزا جہانگیر:۔ اس کے عمر کے گھوڑے نے چالاکی سے اس کو عالم جاودانی میں پہنچا دیا، اپنے زمانے کا اچھا شہسوار تھا۔ [لہ]

مرزا بابر:۔ اس کا حقیقی بھائی الطاف سلطانی کا مرکز ہے[۵۲] بڑے بڑے صاحب مرتبہ لوگ بھی اس کا توسل رکھتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۸ سے آگے) اکبر بادشاہ کی ملاقات کے لئے دہلی آیا تو بادشاہ کی طرف سے گورنر جنرل کے استقبال کے انتظامی امور کے نگراں اعلیٰ مرزا سلیم تھے

RECORDS OF THE DELHI RESIDENCY AND AGENCY. (CHAPTER X) LAHORE. 1911)

P. 357-338

لہ مرزا جہانگیر، اکبر شاہ ثانی کے فرزند اکبر تھے، ولیعہدی کے قضیئے میں ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں انھوں نے سٹین رزیڈنٹ دہلی کے طپنچہ مار دیا اس سبب سے انگریزوں نے ان کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ ۳ر صفر ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء کو بڑے ساز و سامان کے ساتھ لکھنؤ کے ارادے سے دہلی سے روانہ ہوئے اور بعد قطع منازل رونق افروز لکھنؤ ہوئے نواب سعادت علی خاں نے کوئی دقیقہ ان کی عظمت و پاسداری میں فروگذاشت نہیں کیا، مگر رزیڈنٹ اور کونسل کلکتہ کو مرزا جہانگیر کا لکھنؤ قیام پسند نہ تھا، لہذا پہلے کانپور اور پھر الہ آباد چلے گئے۔

مرزا جہانگیر کو حضرت شاہ غلام علی دہلوی سے بڑی عقیدت تھی "مکاتیب شریفہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی" میں، شاہ صاحب کا ایک خط مرزا جہانگیر کے نام ہے، جس میں حضرت نے مرزا جہانگیر کے ایک خواب کی تعبیر ارشاد فرمائی ہے، الہ آباد میں ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں انتقال ہوا، قطعہ تاریخ وفات یہ

این گردش چرخ این ستم ایجاد چہ اشد ۞ کان فخر زمانی
افسوس کہ عازم سوئے فردوس سرا شد ۞ در عین جوانی
تاریخ وے از کلک قضا منشی تقدیر ۞ بر لوح محفوظ
بنوشت جہانگیر جہان دار بقا شد ۞ از منزل فانی

۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء = ۲۷۶ + ۹۶۰

شہزادہ کی والدہ نواب ممتاز محل نے خواجہ وحید الدین احمد خاں کو الہ آباد بھیجا، اور ان کی نعش منگوا کر (باقی صفحہ ۲۹۰ پر)

مرزا غلام حیدر :- برادران حضور (اکبر شاہ ثانی) کے خاص مشیروں میں ہے مرزا لکھو اور مرزا ملہو اس کے دونوں بیٹے بادشاہ کے ہم نشینوں میں ہیں۔

امرائے دہلی :- اب میں شہر دہلی کے امراء اور رؤسا کا ذکر کرتا ہوں۔

بخشی محمود خاں :- نواب نجف خاں کے رشتہ داروں میں ہے، خوش بیان اور شاہی سواروں کا افسر ہے امامیہ مذہب رکھتا ہے [1]

اشرف بیگ :- نجیب کی پلٹن اس کے سپرد ہے، فوج کا کام اچھا جانتا ہے۔

محمد میر خاں :- شاہ نظام الدین کا بیٹا، حضرت شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ایک مدت تک قلعہ مبارک کے تمام کاموں کا مختار اور شہر کا حاکم رہا ہے، وہ سلسلۂ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کا پیرزادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۹ سے آگے) کرو ہاں مجر محمد شاہ بادشاہ کے قریب دفن کی گئی ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں مجر تیار ہوا۔

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی ص ۹۷، ۹۸ (۲) تاریخ اودھ حصہ چہارم ۶۲

(۳) مکاتیب شریفہ ص ۱۶ (۴) سیرت فریدیہ ص ۱۰۴ - ۱۰۵

[2] سراج الدین بہادر شاہ ظفر مراد ہیں۔

[1] مجموعہ حالات عزیزی میں بخشی محمود خاں کی شادی کے سلسلے میں تحریر ہے کہ جب ان کی شادی ہوئی تو شادی کے موقعہ پر لوگوں کو شرکت کے لئے رقعے لکھے گئے ایک رقعہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی خدمت میں بھی پہنچا حضرت شاہ صاحب نے رقعہ کی پشت پر یہ شعر لکھوا کر رقعہ واپس بھجوا دیا۔

در محفل خود راہ مدہ، ہچو منے را افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

سرسید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں کہ بخشی محمود خاں ایرانی نژاد تھے، ہندوستانی لفظوں کا جس میں ٹ اور ڈ ہوتی ہے تلفظ نہیں ہو سکتا تھا، اس سلسلے میں نواب فرید الدین خاں بہادر دبیر الدولہ کے خاندان کے بچوں سے خوب دلچسپ بحث رہتی تھی بخشی محمود خاں نہایت خوش مزاج اور ظریف آدمی تھے، بادشاہ کے دربار میں نہایت خوش بیانی سے جھوٹے سچے قصے بیان کرتے تھے

(۱) مجموعہ حالات عزیزی حصہ اول ص ۵

(۲) تذکرہ عزیزیہ از قاضی بشیر الدین ص ۱۹ - ۲۰

(۳) سیرت فریدیہ ص ۱۲۲ - ۱۲۴ (۴) اخبار رنگین ورق ۷، ب

ہے، شیخ عبدالقادر جیلانی پدری سلسلے کے دادا اور خواجہ باقی باللہ مادری سلسلے کے نانا ہیں، علوم درسیہ کی تحصیل تو کر لی ہے، لیکن احتیاطاً اپنے پر اعتماد نہ کرتے ہوئے ہمیشہ دوسروں سے پوچھکر کام کرتا ہے اکثر دینی مسائل میں مولوی رشید الدین خاں کے قول پر اور معاشیات میں منشی فیض الحسن کے مشورے پر اعتماد کرتا ہے۔

نواب ناظر:- اس کی خوش خلقی اس کے لازمی مرتبہ پر غالب ہے

خواجہ وحید الدین خاں:- خواجہ وحید الدین خاں پسر خواجہ فرید الدین خاں دبیر الدولہ ایک مدت تک جنرل اختر لونی بہادر کا مصاحب خاص رہا، ملکہ عالم جناب عصمت مآب نواب رحیم النساء بیگم کی مہربانی پر بسر کرتا تھا[1]

نبی بخش خاں مرد ہے:- حضور والا (اکبر شاہ ثانی) کے فدائیوں میں سے ہے اور جہاں پناہ اور ملکۂ زماں کی عنایت کا مرجع ہے[2]

---

[1] دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین خاں کے فرزند اکبر اور سید احمد خاں بہادر کے ماموں تھے، ان پر نواب ممتاز محل بیگم اکبر شاہ ثانی کی خاص نظر عنایت تھی، خواجہ وحید الدین ہی مرنا جہانگیر کی لاش الہ آباد سے لائے تھے، نواب ممتاز محل خواجہ وحید الدین کو مثل فرزند کے سمجھتی تھیں اور انھوں نے اپنے فرزند اصغر تیمور شاہ کا ان کو مختار کل مقرر کیا، مختار الدولہ کا خطاب ملا یہ واقعہ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء کا ہے، خواجہ وحید الدین نواب محل کے انتقال سے برس ڈیڑھ برس پہلے کسی بات سے ناراض ہو کر لکھنؤ چلے گئے جبکہ نواب علی نقی خاں نائب تھے۔ چند سال وہاں بھی نہایت اعزاز سے رہے، پھر وہاں سے آئے تو دلی میں رہنے لگے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی سرکار میں بعض معاملات خصوصاً مالی پالیسی کے سلسلے میں ان کی بھی طلبی ہوئی، فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج کے کچھ سپاہی خواجہ وحید الدین خاں کے مکان میں گھس آئے اور عین حالت نماز میں ان کے گولی ماردی۔

(۱) سیرت فریدیہ ص ۱۲۸-۱۲۹

(۲) حیات جاوید حصہ اول از خواجہ الطاف حسین حالی (مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۰۳ء) ص ۲۲

[2] نبی بخش خاں دہلی کے نامور لوگوں میں تھے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں زندہ تھے، دہلی میں جب جنگ کا آغاز ہوا اور انگریزوں کو گرفتار کر کے قلعہ میں لایا گیا تو نبی بخش خاں نے بہادر شاہ ظفر کو ایک عرضی اس مضمون کی لکھی تھی (باقی صفحہ ۲۹۲ پر)

حافظ الہٰی بخش مرد ہیہ:۔ بادشاہ کے عقیدت مندوں میں سے ہے، نیک طنیت ہے، حضرت ظل سبحانی (اکبر شاہ ثانی) کی ذات کے علاوہ کسی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔

جبار بیگ خاں:۔ سمجھدار، معقول اور جہاندیدہ شخص ہے، پرانی وضع رکھتا ہے

حکمائے دہلی:۔ دہلی کے حکماء میں نامور حضرات یہ ہیں:۔

حکیم شریف خاں[۱]:۔ اس شہر میں خاص شاہی طبیبوں میں اپنے فن میں شہرت رکھتے تھے، طبی کتابوں مثلاً شرح اسباب اور نفیسی پر حاشیہ بھی لکھا ہے، ابھی تک بندے کی نظر سے نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۱ سے آگے) کہ مذہب اسلام میں عورتوں اور بچوں کا قتل ممنوع ہے اور بھی کسی مذہب میں یہ جائز نہیں ہے، اگر حضور عورتوں اور ناکردہ گناہ بچوں کے قتل سے باغیوں کو روکیں تو یہ بات حضور کے حق میں دنیا اور عقبیٰ میں بہتر ہوگی جب دہلی فتح ہوئی تو اتفاق سے یہ عرضی دفتر سے برآمد ہوئی اس صلہ میں نبی بخش خاں کو پانچ سو روپے انعام ملے اور سرکاری خیر خواہوں میں ان کا شمار ہوا چنانچہ سر سید احمد خاں نے لائل محمڈنس آف انڈیا میں ان کا ذکر کیا ہے۔

LOYAL MOHAMMADANS OF INDIA BY SYED AHMAD KHAN MEERUTT 1860-61)(1)

(۳) تاریخ عروج عہد سلطنت انگلیشیہ از خان بہادر شمس العلماء محمد ذکاء اللہ دہلوی (شمس المطابع دہلی ۱۹۰۴ء) ص ۳۳۲

(۴) دہلی کی سزا (نصرت نامہ گورنمنٹ) مرتبہ خواجہ حسن نظامی (دہلی پرنٹنگ پریس ۱۹۲۶ء) ص ۶۰، ۱۷

(۵) دہلی کا آخری سانس از خواجہ حسن نظامی (مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۲۵ء) ص ۳۷-۳۸

[۱] حکیم شریف خاں کے والد حکیم محمد اکمل خاں اپنے عہد کے نامی گرامی طبیب تھے، حکیم شریف خاں علم وفضل اور شہرت و ناموری میں باپ سے سبقت لے گئے، شاہ عالم بادشاہ (۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء) تا (۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) کے عہد میں شاہی طبیب رہے، اشرف الحکماء کا خطاب ملا، سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:۔

"اپنے عصر میں سرآمد حکماء اور سر حلقہ اطباء تھے آج تک ان کے کمالات کا شہرہ گنبد دوار میں از بس بلند ہے، جالینوس وارسطو کا غلغلہ اس کے سامنے ایسا ہے جیسا طوطی کی آواز نقار خانے میں اور فی الحقیقت اس روزگار کے اکثر اطباء نامی انھیں کی نسبت شاگردی سے سرمایہ اعتبار کا رکھتے ہیں۔"

حکیم شریف خاں تصنیف و تالیف کا بھی شوق رکھتے تھے، مشکوٰۃ شریف کا فارسی ترجمہ (باقی صفحہ ۲۹۳ پر)

گزرا، مفردات میں بھی ایک کتاب "تالیف شریفی بخواص ادویہ ہندی" ہے، اس سے لوگوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ ہندی دواؤں کی خاصیت بھی معلوم ہو گئی۔ بعض ہندی، یونانی، فارسی اور عربی دواؤں کے ناموں کی مطابقت بھی کی ہے۔

بعض لوگوں سے میں نے سُنا کہ حکیم شریف خاں فرماتے تھے کہ قطب فلک الافلاک کا سکون محال ہے، بلکہ اس دعوے کو قلم بند بھی کر دیا ہے، مگر بندے نے نہ خود دیکھا نہ سُنا۔ یا انہوں نے ستارۂ جدی (؟) کے متعلق لکھ دیا ہو جو قطب شمالی میں ہے اس لئے کہ نقطہ بھی اسی میں مشہور ہو گیا ہے، نقل کرنے والوں نے ان کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے اس طرح ظاہر کر دیا یا بڑھاپے میں ان کے خیال میں اسی طرح آ گیا ہو ورنہ ہر کوئی جانتا ہے کہ محوری خط کے کنارے کو قطب کہتے ہیں اور محور اس خط کو کہتے ہیں جو مرکز پر گزرتے ہوئے قطبین کو ملا دے اسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۲ سے آگے) کاشف المشکوٰۃ کے نام سے کیا حاشیہ نفیسی، حاشیہ شرح اسباب، آثار نبوت، علاج الامراض مجالہ نافعہ۔ دستور الفصد، شرح مبحث حمیات قانون اور تالیف شریفی وغیرہ متعدد عربی و فارسی کی تصانیف ان سے یادگار ہیں، حکیم شریف خاں کا بڑا کارنامہ قرآن شریف کا اُردو ترجمہ ہے جو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی سے تقریباً بیس[2] سال پہلے کا ہے، حکیم محمد احمد خاں دہلوی (متوفی ۱۹۳۶ء) کے پاس یہ پورا ترجمہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا۔ تذکرہ علمائے ہند میں حکیم شریف خاں کا انتقال ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء میں لکھا ہے اور یہ قطعہ تاریخ درج ہے۔

دریغا ازین دار فانی گزشت حکیم و طبیب و لطیف و ظریف
خرد گفت سال وفاتش بمن صد افسوس مرزا محمد شریف ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء

مگر حکیم شریف خاں کے مزار پر جو لوح کندہ ہے اس پر ۱۲۱۶ھ تحریر ہے۔ لوح مزار اس طرح ہے:۔

ھو الحکیم

ھذا مرقد اشرف الحکماء الحکیم محمد شریف خاں الدھلوی دخل الجنۃ بلا حساب ۱۲۱۶ھ

تفصیل کے لئے دیکھئے۔

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۳۷ (۲) تذکرہ علمائے ہند ص ۲۳۳ - ۲۳۴ (۳) مختصر سیر ہندوستان ص ۸۱
(۴) حیاتِ اجمل از قاضی عبدالغفار (انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ) ص ۹ - ۱۰ (باقی صفحہ ۲۹۴ پر)

خط پر کرہ کی گردش ہوتی ہے، اور منطقہ کی جگہ پر کرہ کی حرکت ان سب دائروں سے تیز ہوتی ہے جو منطقہ کی سیدھ میں ہوں، کیونکہ وہ جتنی مدت میں بقدر قطر مسافت طے کرے گا، دوسرے دائرے بقدر استار نمبر وار کم ہوتے جائیں گے اور یہ حرکت محور میں جہاں کرہ کی انتہا ہے ختم ہوجاتی ہے اور محور وہی قطب ہے، غالباً محور یا ایک ستون اور دائرے کا قطب بہت چھوٹا خیال میں آگیا۔

اس خیال سے اس بزرگوار کے فن طب کے کمال میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا کیوں کہ بہت سے علماء جن کا ذہن امور عامہ اور طبیعات کی مشق میں شک کا عادی ہوگیا ہو، ریاضی کے یقینی تخیل کو بھی ہلا ڈالتے ہیں، چنانچہ محقق دوانی نے شرح مواقف کے حاشئے میں ماتن کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان دو دائروں کے محیط کا انتہائی بُعد جو درمیان میں ملے ہوئے ہوں دونوں کے مرکز کے فاصلے کے برابر ہوگا، اس پر دلائل دئے ہیں اور غصے میں آکر مقدمات ہندسیہ کو پوچ کہہ دیا، حالانکہ مشاہدہ اور دلیل میں دوگنا فرق ہوتا ہے، اس کا مشاہدہ ہر شخص کرسکتا ہے، اتنا ذرا سا فرق نہیں جو محسوس نہ ہو سکے اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر ملے ہوئے دائرے کے ایک مرکز سے ایک اتنا بڑا دائرہ کھینچیں جو دوسرے دائرے کے قطر سے مل جائے تو اگر ان دونوں مرکزوں میں ایک انگشت کا فاصلہ ہوگا تو دائرے کا قطر بڑے دائرے کے قطر سے دو انگشت چھوٹا ہوگا کیونکہ قطر کے دونوں جانب ایک ایک انگشت فاصلہ ہوگیا، اس صورت میں ملی ہوئی جانب میں ایک انگلی کا فاصلہ کم ہوگیا اور دوسری جانب بڑھ گیا، ورنہ جزء کا کل کی برابر ہونا لازم آجائے گا یعنی ج ط، ج ب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۳ سے آگے) (۵) داستان تاریخ ادب اُردو ص ۱۴۴ - ۱۴۵

(۶) LIST OF MUHAMMADAN AND HINDU MONUMENTS Vol III PP. 42 - 43

(۷) نزہتہ الخواطر جلد ہفتم ص ۲۱۰ - ۲۱۱

(۸) رسالہ اُردو جنوری ۱۹۳۶ء

منشاء محقق دوانی
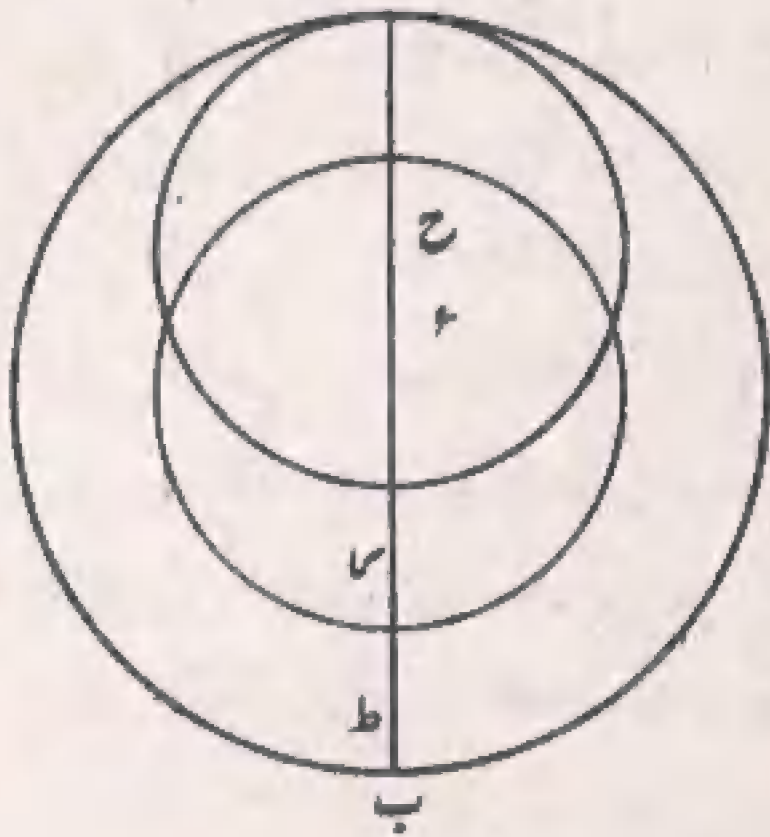
یعنی ج اور د کا فاصلہ اتنا ہی ہوگا جتنا کہ ا اور ب میں ہے

منشاء مولوی عبدالقادر
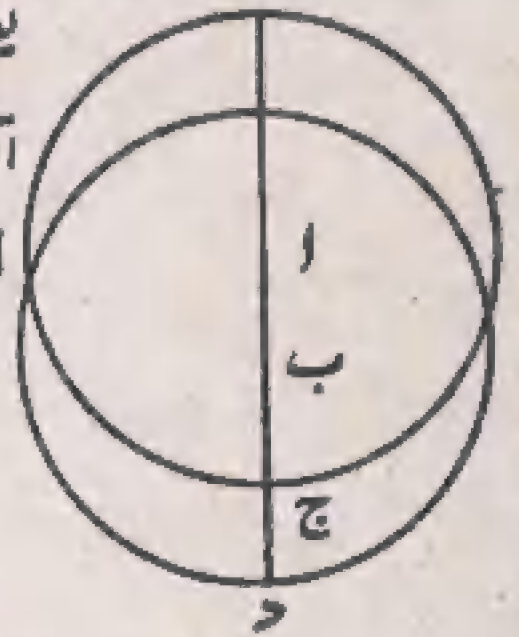
حکیم ذکاء اللہ خاں :- حکیم ذکاء اللہ خاں حاذق الملک تشخیص اور علاج میں بہت مشہور تھے، معالجات میں ان کی بھی ایک کتاب ہے بندہ (مولوی عبدالقادر) نے معالجات ذکائی اور معالجات شریف خانی دونوں کتابیں دیکھی ہیں، ان دونوں بزرگوں نے دونوں کتابوں میں پہلے لوگوں کی تصانیف پر اپنے تجربات اضافے کئے ہیں جیسا کہ اس فن کے مصنفوں کا طریقہ ہے، ایک کا تجربہ دوسرے کو یقین کا فائدہ نہیں دیتا اور اپنے تجربے کی روشنی میں یقین حاصل کرتے ہیں، مگر وہ بھی عام طور پر ہر ملک، ہر شخص اور ہر زمانے میں مشکل سے مفید ہوتا ہے، جملہ "سقمونیا صفرا کا مسہل ہے" اتنا مشہور ہے کہ منطقی رسالوں میں مثال کے طور پر لاتے ہیں علامہ قطب الدین درۃ التاج میں لکھتے ہیں کہ ملک صقلاب میں سقمونیا ہرگز اسہال کا فائدہ نہیں دیتا، میری یہ رائے ہے کہ اگر یہ بزرگ (حکیم ذکاء اللہ خاں) اتنی ہمت کر جاتے کہ ایک چھوٹا سا رسالہ ایسا لکھ دیتے جس میں ہر مرض کی خاص خاص علامتیں ہوتیں اور مشترکہ علامتوں کو چھوڑ دیتے تو بہت مفید ہوتا اور یقیناً وہ اس پر قادر تھے اور

---

[1] ایک دوا کا نام ہے، جسے انگریزی میں SACMONY کہتے ہیں۔

دوسروں کے لئے مشتبہ صورت میں نفع دیتا یا کوئی ایسا رسالہ لکھ دیتے جس میں اقسام نبض کی تصویریں ہوتیں تاکہ سیکھنے والا ہر قسم کی تصویر دیکھ سکتا، اب کسی اُستاد یا شاگرد کے اختیار میں نہیں کہ ایک قسم کی نبض کے مریضوں کو ایک مطب میں جمع کر سکے، اس تصنیف کی صورت یہ ہوتی کہ معتدل نبضہ کا ایک خط کھینچتے، پھر چونکہ ہر نبضہ میں دو حرکت اور دو سکون ہیں، انبساطی و انقباضی اور مرکزی ومحیطی، اس خط کو چار حصوں میں ہر ایک کے زمانے کے اعتبار سے معتدل نبضہ میں تقسیم کر دیتے، اس کے بعد دوسری قسمیں لکھتے اور ہر قسم کے خط کو لکھ کر حرکات و سکنات میں فرق زماں کے لحاظ سے حصے کر دیتے تو اس قدر دردسری اور دُشواری نہ ہوتی جتنی کہ موٹی موٹی کتابوں کی تصنیف میں فرمائی ہے، البتہ غور و فکر کی زیادہ ضرورت پڑتی کیا کیا جائے کہ ایک عرصے سے تمام فنون کے علماء نے کسی نئی کارآمد اور نئی ایجاد پر ہمت نہیں باندھی اور جان سے زیادہ جسم کو تحصیل علم میں کھپا دیا[1]۔

دھلی کے ہندو فضلاء:۔ دہلی کے ہندوؤں میں علم و فضل کے اعتبار سے یہ لوگ ہیں۔

پنڈت مرلی دھر:۔ کہتے ہیں کہ اس شہر کے ہندوؤں میں پنڈت مُرلی دھر تمام علوم ہندیہ سے واقفیت رکھتے تھے لیکن بندہ نے اُنھیں نہیں دیکھا۔

پنڈت کنانند (؟) پنڈت کنانند بہاری لال کی سفارش سے چند روز اجمیر میں عدالتی پنڈت رہے، علوم ریاضیہ کے علاوہ ہندوؤں کے دوسرے علوم سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے اور اپنے مذہب کے مطابق فتوی جس کو ہندی زبان میں "بوستا" کہتے ہیں اچھا لکھتے تھے، ایک مرتبہ ایک گوہ (یا ناکہ) پھکر کے تالاب میں ایک آدمی کو لے گیا تھا، صاحبان انگریز کی طرف سے یہ سوال ہوا کہ انسان کو مار ڈالنے والے جانور کو ہلاک کر ڈالنا چاہیئے یا نہیں اس سلسلہ میں اس پنڈت نے نہایت زیرکی سے جواب لکھا کہ انسان پر حملہ کرتے وقت یا کسی انسان کو مار ڈالنے کے بعد ضرور ہلاک کر دینا چاہیئے لیکن اس مخصوص ذات کو اور نہ اس جنس میں سے ہر ایک کو، صرف اس

---

[1] سنہ ۱۲۰۹ھ / ۹۵-۱۷۹۴ء میں انتقال ہوا، ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر جلد ہفتم ص ۱۷۰-۱۷۱ نیز دیکھئے اطبائے عہد مغلیہ از حکیم علی کوثر چاندپوری (ہمدرد اکیڈمی کراچی ۱۹۶۰ء) ص ۹۲

خیال ہے کہ یہ جنس، انسان کو ستاتی ہے اس جنس ہی کے پیچھے پڑ جانا ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے، جیسے کہ بے ارتکاب جرم وقتل، غارت پیشہ قوم کے مار ڈالنے کا کوئی جواز نہیں ہے سب نے ان کے جواب کو پسند کیا۔

پنڈت کنا ندے بندے کا میل جول تھا، اس لئے میں نے اپنے طور سے پوچھا کہ اگر کبھی صاحب علم وعمل پنڈتوں نے ایسا کیا ہو تو سند ہو سکتا ہے یا نہیں جواب دیا سند ہے، میں نے کہا کہ راجہ جنمی جی نے اس بنا پر کہ راجا پری چھت کو ایک سانپ نے کاٹ لیا تھا، پنڈتوں سے فرمایا کہ سارے سانپوں کو منتر سے مار ڈالیں، چنانچہ ان لوگوں نے بہت سے سانپ مار ڈالے اس پر پنڈت جی نے جواب دیا کہ راجا پری چھت کو مارنے والے سانپ کا نام تجھک تھا جو ہندوؤں کے اعتقاد میں تمام سانپوں کا بادشاہ ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ افسر کے جرم میں لشکر پٹا کرتا ہے۔

آرتھ رام (؟) سرا وگیوں میں آرتھ رام نامی جے پور کے باشندے سگن چند کی پیشی میں رہتے تھے ان کے مذہب کے لوگ کہتے تھے کہ آرتھ رام کوئی بڑے عالم وعامل نہ تھے مگر خوش بیان اور زود فہم تھے، ایک روز ان کے چیلوں میں سے ایک نے بندے سے پوچھا کہ کسی جاندار کو بغیر اس کے کہ وہ کسی کو ستائے یا اس سے نقصان کا اندیشہ ہو، اس کو مارنا اور ستانا برا ہے یا نہیں، میں اس وقت سگن چند کے گھر سے نکلا تھا، میں نے فوراً جواب دیا کہ میں اپنی تحقیق اور عقلی رائے تو کسی سے نہیں کہتا، لیکن آرتھ رام کے اصول کے مطابق اس کا جواب ظاہر ہے کہ کوئی جاندار اپنی زندگی میں اس لئے تکلیف اُٹھاتا ہے کہ اس سے پہلے جنم میں دوسروں کو ستایا تھا اور اسی بنا پر وہ مارے جاتے ہیں کہ پہلے جنم میں مار چکے ہیں یہ جواب سُنکر وہ شخص چلا گیا اور پھر نہ آیا۔

چرنداس :- شاہ عالم بادشاہ کے ابتدائی زمانے میں چرنداس نامی ایک درویش تھا، ہندو مذہب کی کتابوں سے خوب واقف تھا، مسلمانوں کے رسم ورواج بھی جانتا تھا، اس کے چیلے بہت ہیں، یہ لوگ بُت نہیں پوجتے اور عبادت فکر سے کرتے ہیں، اس درویش نے ایک کتاب فن سرود میں بزبان ہندی لکھی ہے، جو ہندی نظم کی ایک قسم چوبولے کے وزن میں ہے، یہ

کتاب بہت رواج پاگئی ہے اور یہ فن سانس کے دائیں اور بائیں نتھنے سے نکلنے پر چند امور کی دلیل بن جاتا ہے اور اس فن میں بہت سی چیزیں ہیں جن میں سے کچھ مجھ کم عقل کی سمجھ میں بھی آتی ہیں یعنی متنفس کی حالت صحت و مرض اور موت و حیات کے دلائل اور دوسرے استدلال مثلاً گذشتہ واقعات و دوسرے حالات پر ہیں اور متنفس کی غربت و مالداری اور آرام و تکلیف علیحدہ انداز پر ہیں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی اور اگر سمجھ میں آ بھی جائے تو میں اس کو علم ہی نہیں سمجھتا بلکہ فال دیکھنے والوں، رمالوں اور ہاتھ دیکھنے والوں کی باتیں سمجھتا ہوں

دہلی کے ارباب موسیقی :- دہلی کے ارباب موسیقی میں یہ حضرات قابل ذکر ہیں:-

نعمت خاں و فیروز خاں :- اس شہر میں نعمت خاں سدا رنگ[1] اور فیروز خاں ادا رنگ کا خاندان موسیقی جاننے والوں میں مشہور عالم ہے۔ یہ دونوں محمد شاہ کے زمانے میں تھے۔

دوسرے (فیروز خاں ادا رنگ) کی ساز زندگی کا تار شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں ٹوٹ گیا[2]

---

[1] نعمت خاں کے متعلق درگاہ قلی خاں لکھتے ہیں:-

"در ہندوستان وجودش از نعمت ہائے عظمیٰ است در اختراع نغمات و ایجاد شعبات ید طولیٰ دارد و با نایکان پیشین پہلوی زند و موجد خیالہائے رنگین است، در چندین زبان تصانیف دارد، بالفعل سرجمع مغنیان دہلی است و بمقتضائے تمنائے ذاتی غیر از بادشاہ بہیچکس سر فرو نمی آرد و در عہد محمد معز الدین طرقہ سازو برگی داشت در عرس ہائے بزرگان حاضر میشود و خود ہم یازدہم می کند رؤسا و اعیان شہر ہر ماہے روز یازدہم بخانہ اش ہجوم می کنند بشابہ کثرت میشود کہ جا بہم نمی رسد لہذا از صبح مردم سبقت می کنند و این صحبت تا سفیدۂ صبح می کشد .... در نواختن بین مہارتے دارد کہ شاید در عرصۂ وجود بہتر ازیں خلق نشدہ باشد"

(مرقع دہلی ص ۵۵)

[2] فیروز خاں کے متعلق درگاہ قلی خاں لکھتے ہیں:-

"در تمہید آلات طرفہ دستے دارد تا چہار ساعت بچندین رنگ بہ نغمات مختلف و آہنگہائے بیشی متترنم می شود و بقوت استعداد اعادہ باصل آہنگ می نماید ہوش در تصنع آواز کہ مغنیان می پردو این قسم صنعت قدرت ہیچکس نیست خوانندنش بکیفیت است"

اس نے کئی سروں کو ملا کر ایک سر نکالا اور "سندورا" نام رکھا، جو رواج بھی پا گیا ہے اکثر لوگ بسنت کی راتوں میں ہوری، اسی سر میں گاتے ہیں اور ستار پر پردے کی بجائے سندری باندھی جس سے عمدگی پیدا ہو گئی اور ہندیوں کے نزدیک اس فن کا گر یہ تھا کہ تین "سپتک" گلے سے ادا نہیں کئے جا سکتے، مگر فیروز خاں نے ادا کئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ وہ مشق سے ایک "سپتک" کو سینہ کی آواز سے ادا کرتا تھا اور اس کے سینے کی آواز بلندی کی وجہ سے گلے کی آواز جیسی ہو جاتی تھی اور یہ ہو سکتا ہے کیونکہ بہت سے بھکاری مشق کرکے بھیک کے لئے سینہ سے کلام کرتے ہیں۔

راگ رس خاں:- ہمارے زمانہ میں نور خاں، رس بین خاں اور راگ رس خاں[1] بین بجانے والے تھے۔

ناصر احمد:- جب بندہ (مولوی عبد القادر) اس شہر میں پہنچا ناصر احمد[2] کی بین اور

---

[1] سرسید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں: "فن بین نوازی میں یکتائے روزگار اور یگانۂ شہر و دیار، اس کی بین کا ہر تار شیرازۂ کتاب معرفت تھا، جیسا ہمت خاں فن نغمہ میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا، یہ صاحب کمال بین نوازی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا، ہمت خاں کے ساتھ دوسری اور چوبیسویں کو حضرت موصوف (سجادہ نشین درگاہ حضرت میر دردؔ) کے روبرو صحبت بین نوازی سے گوش شوق کو ممنون اور سامعہ تمنا کو مرہون کرتا تھا چند سال گزرے کہ عالم فانی سے عالم باقی کو راہی ہوا۔" آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۲۳ - ۱۲۴

[2] سرسید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:

"چونکہ اس صاحب کمال نے اپنے نانائے مرحوم (ہمت خاں) کی صحبت میں رشد و بلوغ بہم پہنچایا۔ اس کی فیض تربیت سے فن موسیقی میں یکتائے عہد ہو گیا، وہ مغفور (ہمت خاں) فن نغمہ سرائی میں مشہور روزگار تھا، یہ یکتائے زمانہ نغمہ سرائی اور بین نوازی دونوں میں معروف روزگار ہوا اور ان دونوں کاموں کو ایسا کیا کہ گوش اہل روزگار نے کہن ترانہ ہائے سابقین کو فراموش کیا اور کملائے دہر کو یہ اعتقاد ہے کہ جیسا ان چیزوں کو انھوں نے برتا اساتذۂ سلف کو مجال نہ تھی کہ اس کے عشر عشیر پر بھی قادر ہو سکتے، اپنے نانا (ہمت خاں) کی وفات کے بعد بدستور قدیم حضرت خواجہ محمد نصیر مرحوم (سجادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ میر درد) کے سامنے یہ بھی (باقی صفحہ ۳۰۰ پر)

ہمت خاں کا گانا سُنا۔

ہمت خاں:۔ ہمت خاں بیشک اس فن (موسیقی) کا ماہر تھا، لیکن سکھانے میں بہت دھوکے دیتا تھا راگ میں "پوریا" اور "ہمیر"[۱] دونوں کا گلے سے نکالنا مشکل کام ہے، لیکن میں ایک محفل میں موجود تھا، اس میں ہمت خاں نے خوب ادا کیا[۲]

قائم خاں:۔ قائم خاں پسر عالم خاں بھی فن موسیقی میں مشہور رہے ہیں میں نے رامپور میں نواب نصراللہ خاں[۳] کے زمانہ میں بارہا اس کا گانا سُنا ہے وہ ایک طرز پر گاتا تھا اور اس کے تین ساتھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۹ سے آگے) نغمہ سرائی اور بین نوازی ان ہی دونوں تاریخوں (دوسری اور چوبیسویں) میں کرتے رہے...... اب گردشِ آسیائے گردوں سے بتقریب تلاش رزق نواح صوبہ اودھ کی جانب روانہ ہوگئے ہیں۔

(۱) آثار الصنادید باب چہارم ص ۲۲ (۲) سیرت فریدیہ ص ۱۳۰-۱۳۱

(۳) عین الانسان از قاضی علی احمد محمود اللہ شاہ بدایونی (وکٹوریہ پریس بدایوں قریب ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء) ص ۲۵

[۱] پوریا، اور ہمیر، راگوں کے نام ہیں۔

[۲] سرسیّد احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:۔

"باریداس کا شاگرد تھا...... دھرپد کے گانے میں اس کا نظیر نہ تھا، اگر تان سین زندہ ہوتا زانوئے شاگردی طے کرتا اور اگر بیجو باورا قید حیات میں ہوتا خط غلامی لکھ دیتا، ہرچند اطراف عالم سے رؤسائے ذوی الاقدار اور راجہ ہائے عالی تبار نہایت آرزو سے بطمع خط پر خط لکھ کر تمنا کرتے تھے کہ یہ صاحب کمال قصد ان کی ملازمت کا کرے، باستغنائے استغنائے خداداد جو ارباب کمال کے لوازم ذاتیہ سے ہے، تمام عمر ان کی طرف منہ نہ کیا اور دلی سے قدم باہر نہ رکھا، جو نغمہ سرا کہ ممالک دور دست سے مدعی اس فن کا ہو کر وارد شاہجہاں آباد ہوا، اس کی ایک تان کے سنتے ہی نہ تال کی خبر رہی نہ سر کی اور اس کے قدم کی خاک کو اپنی اپنی آنکھ کا کحل الجواہر بنایا، حضرت بابرکت شاہ محمد نصیر صاحب مرحوم سجادہ نشین خلافت حضرت خواجہ میردرد علیہ الرحمہ کے سامنے بنا بر رسم مستمرہ کے دوسری اور چوبیسویں ہر مہینے کو مجلس نغمہ گرم کیا کرتا تھا اور درو دیوار اس کی الحان داؤدی سے مست ہو جاتے تھے۔"

آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۲۳

[۳] نواب نصراللہ خاں کے لئے ملاحظہ ہو باب اول ص ۶۵

تین تال گاتے تھے اور سم برابر پڑ رہا تھا، بہت سے لوگ اس عجیب صفت پر اس کے کمال کی تعریف کرتے تھے، حالانکہ یہ کوئی بڑی کاریگری نہیں اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگرچند تال میدان میں ادا ہوں توان کی باہمی نسبت دوگنی، آدھی، تہائی چوتھائی یا برابر کی ہوگی، جیساکہ روپک کہ چوتال آرہ کی ادھیائی ہے، اور جیسے ک (۹) میدان میں آرہ چوتالہ کی برابری رکھتا ہے۔ اور سم پر برابر آجاتے ہیں[1]

نظام خاں:- قائم خاں کا لڑکا نظام خاں اپنے باپ کا بہترین جانشین تھا[2] اور مان خاں اس فن میں اتنا کمال رکھتا تھا کہ بعض اس کو ہمت خاں پر ترجیح دیتے تھے، یہ لوگ دھرپت گانے والے تھے (رجبی اور رجپال مشہور تھا اور اجپل الفاظ کی ترکیب میں مشہور، ٹپہ اور ٹھمری، بہت عمدہ گاتے ہیں) صاحب حیثیت لوگوں میں خواجہ میر دردؒ کا خاندان اس فن کو خوب جانتا ہے، شاہ نظام الدین عرف بڑے صاحب کا بھتیجا بین بجانے میں اور غلام حسین خاں پسر فیض اللہ بیگ خاں کا لڑکا ستار بجانے میں سب سے بہتر شمار ہوتا ہے۔

موسیقی کی اصطلاحات:- اب اس فن کے اصطلاحی الفاظ کی کچھ تشریح کرتا ہوں جو ذہن میں آگئے ہیں۔

دھرپد:- بھاشا زبان کا لفظ ہے، چار تک رکھتا ہے، پہلی تک کو استھائی دوسری کو انترا،

---

[1] سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:-

"دھرپد نوازی میں ایسا کامل تھا کہ مقامات دوازدہ گانہ راگ (بارہ راگ) کو کہ کمال صعوبت سے ہفت خوان رستم کا حال رکھتے ہیں، اس کے انفاس معجزہ اساس نے بآسانی سپر کیا تھا، عہد آدم سے اس دم تک ایسا ماہر پیدا نہیں ہوا اور اس زمانہ سے نفخ صور تک اس کے نظیر کا پیدا ہونا متصور نہیں عرصہ چند سال سے عالم فانی سے کوچ کیا۔" آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۲۸

[2] سر سید احمد خاں بہادر لکھتے ہیں:-

"دھرپد سرائی میں بے مثل و مانند اور ثناث گردانی کا بیجوباؤرا کو خیال میں نہیں لاتا تھا، عرصہ قلیل ہوا کہ شبستان عالم بغیر اس کے وجود عشرت آمود ماتم سرا ہوگئی۔" آثار الصنادید باب چہارم ص ۱۲۵

تیسری کو جھوک اور چوتھی کو ابھوگ کہتے ہیں اس میں حسن وعشق کا بیان ہوتا ہے، اگر مہادیو
کی تعریف ہو تو اِستُت، وشنو کی تعریف ہو تو لشن پد، بادشاہی دبدبے کے بیان کو
'سارا'، بہادری اور لڑائی کے بیان کو کڑکا کہتے ہیں حقیقت سب کی ایک ہے، اور وہ ساز
جس پر یہ گایا جاتا ہے، بین، رباب قانون پکھاوج، منڈل اور مردنگ ہیں اور وہ تالیں
جو اس میں اچھی معلوم ہوتی ہیں، چوتالہ، سور بھاکتا جس کو سور فاختہ کہتے ہیں اور دھمالہ
تتالہ ہیں اور راگ روانی کے قریب ہو اس کا اس میں گاتا اچھا معلوم ہوتا ہے اور اس
میں آواز کی نیچی اونچی ہلکی بھاری لوٹ پھیر کرنے کی تانیں مقرر ہیں [1]

ہوری :- ہوری بھی اسی طرح ہے، مگر اس کی تکیں دھرپد کی تکون سے چھوٹی ہیں پرانی ہوری
کی تال دھمال ہے اس کے بعد دیپ چندی بھی پیدا ہوگئی اس میں موسم بہار اور عورتوں کی
عیش پرستی کا بیان ہوتا ہے۔

دھرپد کا موجد مان سنگھ گوالیاری کو بتایا جاتا ہے اور خیال سلطان حسین شرقی کی
ایجاد ہے، کتاب تحفۃ الہند سلطان کی یادگار ہے، اس سے قبل اس (خیال) کو استاد کے
تجویز کردہ نام سے گاتے تھے نعمت خاں اور فیروز خاں نے اس میں اپج شروع کی اس
میں آواز کی طاقت اور ورزش کا اظہار ہوتا ہے اب تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اپجوں کی
زیادتی سے راگ اور تال دونوں جاتے رہے۔

اس فن کا اصلی مقصد پریشان دل کو سکون بخشنا تھا، مگر اب اس کے خلاف کیفیت
ظاہر ہوتی ہے اور موسیقی کا اصل منشاء تناسب، فوت ہوجاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر علم و
فن میں خودنما مدعی پیدا ہوگئے ہیں، زہد کا مقصد آزادی اور بے تکلفی حاصل کرنا تھا، مگر اب
نام نہاد زہاد، بادشاہوں اور امیروں سے زیادہ تکلفات کے عادی ہیں، منطق کا مطلب معلومات
کی ترتیب میں غلطی سے بچنا تھا، اب جس قدر زیادہ مغالطے کوئی جمع کردے، یہاں تک کہ خود
بھی ان سے نہ نکل سکے بس وہی اس فن میں نامور ہے، فلسفہ کا منشاء عقل سے چیزوں کا معلوم

---

[1] ملاحظہ ہو مطلع العلوم مجمع الفنون از واجد علی ساکن ہوگلی دکلکتہ مطبوعہ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۴ء ص ۲۶۵

کرنا تھا، آج فلسفی کا بس یہ کمال ہے کہ مصطلحات کو رٹ رٹ کر دوسروں کے سامنے کہہ دے جس کو نہ خود سمجھے اور نہ اس کا مخاطب سمجھے، متکلم کا یہ مقصد ہوتا تھا کہ شریعت کی باتوں کو عقلی طور سے سچ کر دکھائے اور جو بات عقلاً محال ہو وہاں شرعی قول کی تاویل کر دی جائے لیکن اس زمانے میں متکلم کا یہ کام ہے کہ خواہ مخواہ اپنے ملک کے گزشتہ متکلمین کی آراء کو کلام الٰہی کی طرح تسلیم کروائے اور اگر کسی کے دل میں نہ اُترے تو بُرا بھلا کہنے لگے۔

ٹپہ :- پٹہ میں چھوٹی سی دو تکیں ہیں، پہلے پٹہ پنجابی زبان میں اور اس کے بعد مارواڑی اور دوسری زبانوں میں جاری ہو گیا، اس میں اپج کا رواج بہت ہے، مگر اچھا کم لگتا ہے اور ٹھمری اس سے زیادہ مختصر ہے، کہروا، اور دادرا بندیل کھنڈ میں نکلا اور سارے بنگالہ میں ٹھمریاں ہی ہیں، ٹپہ اور ٹھمری وغیرہ بچوں اور عورتوں کی نرم آواز کے مناسب ہیں اور دھرپد بھاری آواز کے لئے موزوں ہے۔ الفاظ کو وزن سے گانے کا نام تال ہے، راگ اس پر موقوف نہیں کیونکہ الاپ میں راگ ہے تال نہیں اور پکھاوج، ڈھولک، منڈل اور دف میں تال ہے راگ نہیں۔

بین :- بین ایک ساز ہے کہ ایک لکڑی میں دو کدو باندھ دیتے ہیں اور اس لکڑی پر بہت سے تار باندھتے ہیں اور ان تاروں کے نیچے اکیس جگہ چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھتے ہیں، جن کو سار کہتے ہیں اور اس کو دونوں ہاتھوں سے بجاتے ہیں کبھی مضراب سے اور کبھی ناخن سے اور ستار، بین کا مختصر ہے جو ایک کدو تین تار اور چودہ لکڑیوں کا ہوتا ہے اس کو سندری بھی کہتے ہیں۔

آواز کی پستی و بلندی کے سات درجے مقرر کئے ہیں پہلے درجہ کو کھرج اور شر بھی کہتے ہیں، دوسرے کو رکھب، تیسرے کو گندھار، چوتھے کو مدھم، پانچویں کو پنجم، چھٹے کو دھیوت اور ساتویں کو نکھاد کہتے ہیں اور جب نکھاد سے اوپر کو جائیں تو کھرج ہو جاتا ہے جو پہلے کھرج سے بہت اونچا ہوتا ہے کیونکہ ان سروں کا فرق مدارج کی تیزی اور سستی پر ہے، نہ کہ آواز کی پستی و بلندی پر، اور ایک تار کے جب دونوں سرے کھینچکر باندھ دیں اور ایک جانب انگلی کر ماریں تو ایک آواز نکلے گی پھر اس کے قریب تر اس سے تیز یہاں تک کہ آدھے تار تک آواز تیز ہوتی جائے گی اور آدھے کے بعد پھر وہی پہلی سی ہو جائیگی، لیکن صدا (گونج) بڑھ جائیگی [1]

---

[1] فن ستار پر اُردو میں ایک مفصل رسالہ مرزا رحیم بیگ ولد مرزا باقر بیگ نے ۱۸۸۸ء میں بمقام لاہور (باقی صفحہ ۳۰۴ پر)

اس سلسلے میں بیان کو اگر طول دیا جائے تو ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے اور اس کتاب کے مطالعے سے معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ راگ، سر اور تال کی کونسی قسم ہے اس سلسلے میں دو تین باتیں ذہن نشین رکھنی چاہئیں کہ جب کوئی گن بھار والا سر گا رہا ہوگا تو یقیناً اس کے دونوں نتھنے پھیلے ہوئے ہوں گے اور دمیوت کے ادا کرنے میں ناف ہلتی ہے، اسی طرح ہر ایک کی ایک خاصیت ہے، دوسرے راگوں کے بھی پہچاننے کا یہی طریقہ ہے، لیکن چونکہ آج کل کے بہت سے لوگ ہمہ دانی کے مدعی ہیں حالانکہ جانتے کچھ نہیں، اس لئے ان اسرار و رموز کو بیکار نہیں کہنا چاہیئے، موسیقاروں نے راگوں کے لئے جو صورتیں اور اوقات مقرر کئے ہیں، وہ ہندوؤں کے اعتقاد کی بناء پر ہیں۔

شہر دہلی میں چونے والوں کی عورتیں شادیوں میں ناچنے گانے کے لئے خود بخود (بغیر بلائے) چلی جاتی ہیں اور مزدوری لیتی ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۳۰۳ سے آگے) اور بانس بریلی تسہیل الستار کے نام سے مرتب کیا، اس میں مؤلف نے اس فن کو نہایت آسان کر کے بیان کیا ہے مطبع نولکشور سے یہ رسالہ ۱۹۱۶ء میں (بار ششم) شائع ہوا ہے۔

باب ششم

دہلی کی رزیڈنسی :- دہلی کی رزیڈنسی کا تعلق جودھپور، جے پور، کوٹہ، بوندی، سروہی، اودے پور جیسلمیر، بیکانیر، الور، بھرت پور، پٹیالہ، جیند، کیتھل، لاہور اور کشن گڑھ سے ہے۔ کشن گڑھ، بیکانیر اور جودھپور میں راٹھور، جے پور اور الور میں ہاڑہ، کچھواہہ، اودے پور میں سیسودیہ، کوٹہ اور بوندی میں ہاڑہ، سروہی میں دیوڑہ، جیسلمیر میں بھائی، بھرت پور میں جاٹ، پٹیالہ، جیند کیتھل اور لاہور میں سکھ حکمراں ہیں۔

سکھ :- سکھوں کے مذہب کے بانی گرو نانک[1] تھے۔ اور آخری گرو گوبند سنگھ تھے، سکھ مرید کو

---

[1] سکھ مذہب کے بانی گرو نانک قوم کے کھتری تھے ۱۴۶۹ء میں بمقام تلونڈی صوبہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں سید حسین شاہ درویش کی خدمت میں رہ کر انھوں نے کچھ لیاقت حاصل کی پھر تارک الدنیا ہو کر عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے اور ایک نئے مذہب کے بانی ہوئے۔ گرو نانک کی وفات کے بعد گرو انگد گدی پر بیٹھا وہ ۱۵۵۲ء میں مرگیا۔ اور امرداس کھتری اس کا قائم مقام ہوا، امرداس کھتری ۱۵۷۴ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد رام داس گدی نشین ہوا۔ اس نے شہر "چاک" کو بڑی رونق دی اور ایک تالاب تعمیر کرایا جو کہ "امرتسر" کے نام سے مشہور ہوا۔ بعض لوگوں نے جو یہ لکھا ہے کہ اس نے شہر امرتسر کی بنیاد ڈالی ہے یہ بات صحیح نہیں اس لئے کہ یہ بہت قدیم شہر ہے، سابق میں یہ شہر "چاک" کے نام سے مشہور تھا البتہ رام داس نے اس شہر کو رونق ضرور دی رام داس ۱۵۸۱ء میں مرگیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا ارجن دیو جانشین ہوا اس نے آدگرنتھ یعنی سکھوں کی مذہبی کتاب کی پہلی جلد مرتب کی اور چند قواعد مذہب کے انتظام اور ترتیب کے لئے مقرر کئے یہ شخص ۱۶۰۶ء میں فوت ہوا اس کی بجائے اس کا لڑکا ہرگوبند گدی پر بیٹھا۔ یہ شخص سپاہی تھا اسی نے سب سے پہلے سکھوں کو گائے کے گوشت کے علاوہ دوسرے جانوروں کے گوشت کھانے کی اجازت دی، یہ شخص ۱۶۴۵ء میں مرگیا۔ اور اس کا پوتا ہر رائے اس کا قائم مقام ہوا ۱۶۶۱ء میں ہر رائے کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا ہری کرشن اس کا جانشین ہوا جو ۱۶۶۴ء میں (باقی صفحہ ۳۰۶ پر)

اور سنگھ شیر کو کہتے ہیں، گانٹھ میں کوڑی نہ تھی تو سکھ تھے اور روپئے والے ہوئے تو سنگھ ہو گئے۔ سکھ بت پرستی کو بُرا جانتے ہیں بدن کے بال نہ لینے کو عبادت سمجھتے ہیں۔ خدا کی یاد اور نانک کے کلام کو اچھا سمجھتے ہیں نانک کے کلام کا نام گرنتھ ہے اور یہ کلام عقل کے مطابق اور بہت اعلیٰ ہے۔ سکھ تمباکو سے بیحد پرہیز کرتے ہیں چوری کو ناجائز اور لوٹ مار کو اچھا سمجھتے ہیں۔ مُردے پر ماتم نہیں کرتے بلکہ گاتے بجاتے ہوئے لاش کو لے جاتے ہیں۔ گائے کا گوشت نہیں کھاتے، بلکہ بکری کا گوشت کھاتے ہیں غیر عورت سے بہت بچتے ہیں بلکہ لوٹ مار کے ہنگامے میں بھی اُس کے زر و زیور پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ بول چال میں اُس کو مائی کہتے ہیں جو لوگ مذہب کے پابند ہیں وہ ان اصولوں پر چلتے ہیں۔ البتہ من مانی کرنے والے ہر مذہب میں ہیں، جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ اور مذہب کی چنداں پابندی نہیں کرتے۔ برہمنوں کے گھروں میں مسلمان رنڈیاں ہیں اور اسلام کے مدعی شراب پیتے ہیں، جمعرات کو قبروں پر ناچ گانے میں شریک ہوتے ہیں، البتہ عاشق مزاج عیسائیوں کو اپنے مجمع سے دور رکھتے ہیں۔ جبلپور میں اتوار کے دن گیند بلے کے کھیل میں کچھ لوگ جوا کھیلتے تھے، یہ کھیل انگریزی طریقے پر کھیلا جاتا تھا۔ اس کھیل میں بعض لوگ کنگال ہو گئے اور کچھ لوگ اپنے ورثا کے لئے مال و دولت چھوڑ گئے، یہ سب کچھ لارڈ لیک کی سپہ لاری اور سر جان مالکم صاحب بہادر کی مہربانی سے رواج پذیر ہوا۔

نواح دہلی کے رؤسا و جاگیردار — بخشی بھوانی شنکر ۔ بھوانی شنکر جسونت راؤ ہلکر کے لشکر سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۵ سے آگے) دہلی میں فوت ہوا اس کے بعد تیغ بہادر گدی نشین ہوا جو ۱۶۷۵ء میں ختم ہوا اور اُس کے بجائے اُس کا بیٹا گرو گوبند سنگھ گدی نشین ہوا۔ اُس نے سکھوں کے اصول و ضوابط بالکل بدل ڈالے اور سکھوں کو سپاہی پیشہ بنا دیا۔ سکھ سے ان کا نام سنگھ کر دیا۔ اس نے سکھوں کو سر کے بال اور ڈاڑھی مونڈوانے سے کلی ممانعت کی یہ شخص عہد اورنگزیب میں مسلمانوں سے بہت لڑا، شہر لاہور سے اس کا اخراج ہوا شہر ناندیڑ دکن میں ۱۷۰۸ء میں فوت ہوا یہ سکھوں کا آخری گرو تھا۔ اس کے بعد سکھوں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں نے ان کی قیادت کی۔

"تاریخ پنجاب مسمّی بہ گلشن پنجاب مؤلفہ پنڈت دیبی پرشاد طالب علم اعلیٰ سابق، مدرسہ سرکاری بریلی"

(مطبع عمدۃ الاخبار بریلی ۱۸۷۲ء ص ۳۰۱)

جدا ہو کر انگریزوں کے فتحمند لشکر میں آملا تھا۔ اسی کے بدلے میں بھوانی شنکر کو نجف گڑھ انگریزوں کی طرف سے مل گیا تھا، یہ شخص متواضع، سخی اور درویش دوست تھا اکثر مسلمانوں کی سی رسمیں اور عبادت کرتا تھا۔

ایک نائی کے ہاتھ سے بھوانی[1] شنکر مارا گیا۔ جس کی بھوانی شنکر نے بے عزتی کی تھی، واقعہ یہ تھا کہ ایک نائی اپنی بہن اور بہنوئی کو لارہا تھا، راستے میں نجف گڑھ سے گذرا۔ بہنوئی نے ایک کاشتکار کے کھیت میں سے جَو کی ایک بال توڑلی محافظ اس شخص کو پکڑ کر بخشی کے پاس لے گیا

---

[1] منشی بھوانی شنکر ذات کا کھتری تھا۔ مرہٹہ گردی میں یہ شخص بڑا سربرآوردہ رئیس اور دولتمند بن گیا۔ یہ منشی پہلے ریاست گوالیار میں بخشی تھا۔ جب مرہٹوں نے دلی پر تسلّط کیا تو اس کو ایک بڑی ذمہ داری کی خدمت پر دلّی بھجوایا۔ لیکن بھوانی شنکر انگریزوں سے مل گیا۔ مرہٹوں نے اس سازش کے الزام میں اسے موقوف کردیا۔ لیکن انگریزوں نے منشی کو پنشن دی جو اس کی اولاد کے لئے بھی جاری رہی چونکہ منشی بھوانی شنکر انگریزوں سے مل گیا تھا اس لئے مرہٹے اسے نمک حرام کہنے لگے اور دلّی میں اس کا مکان "نمک حرام کی حویلی" مشہور ہوگیا۔ منشی بھوانی شنکر کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اس نے انگریزوں سے شکایت کی جو اس زمانے میں دلّی پر قابض تھے۔ چنانچہ انگریزی حکام کی طرف سے احکام جاری ہوئے اور عام منادی کی گئی کہ نہ تو کوئی منشی جی کو نمک حرام کہے اور نہ اُن کے مکان کو نمک حرام کی حویلی لیکن یہ منادی بمصداق "الانسان حریص علی ما منع" اور زیادہ شہرت کا سبب ہوئی، اور ہر شخص کی زبان پر یہی لفظ چڑھ گیا۔ یہ نہایت عالی شان حویلی ہے جس کے دو پھاٹک جنوب و مغرب رویہ ہیں مغرب کی طرف کا پھاٹک بہت بلند اور شاندار ہے۔ جس پر سنگین نشیمن بنے ہوئے ہیں۔ اسی طرح بھوانی شنکر کی کچہری کی عمارت بھی نہایت عمدہ، شاندار اور دو منزلہ ہے۔ جس میں متعدد دالان اور کمرے ہیں، اسٹیشن کی طرف سے جو سڑک ملکہ کے باغ کے برابر فتحپوری کو آتی ہے اسی پر یہ حویلی واقع ہے۔ دو منزلے کوٹھے کے بیچ میں ایک برآمدہ نشیمن کی طرح کا آگے کو نکلا ہوا بہت خوشنما سنگین ہے جس میں پچیکاری کا کام بھی ہے۔

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ص ۲۴۷-۲۴۸ (۲) اخبار رنگین از سعادت یار خاں رنگین ورق ۱۳ (قلمی مملوکہ محمد ایوب قادری)

اس نائی نے جو اس وقت آگے یا پیچھے رہ گیا تھا اور شاہجہاں آباد کا باشندہ تھا، بخشی کے سامنے آکر بہت کچھ منت سماجت کی اور کہا کہ تاوان یا جرمانہ لے کر مجھ پر احسان کریں یا میرے بہنوئی کے بدلے میں مجھے سزا دیں کیونکہ میں اس کو مہمان لایا ہوں اس کی ذلت میں میری بڑی بے عزتی ہے۔ بخشی بھوانی شنکر نے غصے میں اس کے کہنے پر توجہ نہ کی بلکہ اس کی بہن اور بہنوئی کو سر محفل جوتوں سے پٹوایا نائی نے کہا کہ بھوانی شنکر بہتر یہ ہے کہ مجھے اب تم قتل کر دے ورنہ ایک روز تو میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔

بخشی نے تینوں کو باہر نکال دینے کا حکم دیا۔ وہ نائی اُس وقت سے ایک کٹار اپنے ساتھ رکھنے لگا اور موقعہ کی تلاش میں رہا، دسہرے کے دن بخشی نے اپنی نوتعمیر حویلی کے دیکھنے کی عام اجازت دی وہ نائی بھی حویلی دیکھنے پہونچا اور اس نے دیکھا کہ بھوانی شنکر ایک طرف بیٹھا ہے فوراً نائی اس کے قریب گیا اور کہا کہ آج تیرا کام تمام کرتا ہوں اور یہ کہتے ہی اس پر حملہ کیا اور کٹار کے زخم سے بخشی بھوانی شنکر کو ملکِ عدم پہونچا دیا۔ بخشی نے غل مچایا، لوگ نائی کے پکڑنے کو دوڑے، اس نے خود کو چھت سے نیچے گرا دیا۔ گرتے ہی اس کے دونوں پیر بیکار ہو گئے، پکڑ کر کوتوالی لے گئے اس نے قتل کا اقرار کر لیا اور قصاص میں مارا گیا۔ بخشی کی جاگیر سرکار میں ضبط ہو گئی کچھ تھوڑی سی رقم چارلس مٹکاف صاحب رزیڈنٹ کی مہربانی سے اس کے پسماندوں کے لئے مقرر ہو گئی۔

نواب مرتضیٰ خاں بنگش رئیس پلول:۔ نواب[1] مرتضیٰ خاں شکستہ حال مگر قسمت کے دھنی تھے۔ ہلکر کے

---

[1] نواب ولی داد خاں بنگش پٹھان تھے وہ شاہ عالم ثانی کے عہد میں کوہاٹ سے دہلی آئے اُنھوں نے اپنے صاحبزادے نواب مرتضیٰ خاں کی شادی اس زمانے کے مشہور سپہ سالار اسمٰعیل بیگ ہمدانی کی صاحبزادی نواب اکبری بیگم سے کی، نواب مرتضیٰ خاں انگریزوں کی اس فوج میں جو مرہٹوں سے برسرِ پیکار تھی عہدہ دار ہوئے سنہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی کے قریب ہوڈل پلول کا علاقہ نواب مرتضیٰ خاں کو بطور جاگیر عطا کیا اس دور میں جو سات رئیس با اختیار بنائے گئے تھے ان میں نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں صاحب بہادر مظفر جنگ بھی تھے سنہ ۱۸۱۳ء میں نواب مرتضیٰ خاں نے جہانگیر آباد کا علاقہ جو پہلے راجہ کھودمس رائے کی ملکیت تھا خرید لیا کیونکہ یہ علاقہ (باقی صفحہ ۳۰۹ پر)

لشکر میں سروسامانی حاصل کرلی۔ ایک لڑائی میں انگریزی سپہ سالار کی فوج میں شامل ہو گئے نوابی کا خطاب اور تاحین حیات علاقہ پلول خرچ کے لئے مل گیا۔ شاہ جہاں آباد میں ایک حویلی بنوائی ایک شب بالاخانے کے صحن میں سو رہے تھے آندھی کے جھونکے سے آنکھ کھلی چاہا کہ اندر جائیں اندھیرے اور نیند کے غلبے کی وجہ سے باہر کو بھاگے اور بازار میں گر پڑے۔ سخت چوٹ آئی ہر چند تدبیریں کیں مگر کچھ فائدہ نہ ہوا آخر راہی ملک عدم ہوئے، علاقہ پلول خالصہ شریف میں شامل ہو گیا اور ان کے فرزندوں کے لئے بطور قوت لایموت کچھ نقد رقم صاحب رزیڈنٹ دہلی کی نوازش سے مقرر ہو گئی۔

فیض اللہ بیگ خاں رئیس ہتن :- احمد بخش خاں کے چچازاد بھائی تھے۔ پرگنہ ہتن زندگی بھر کے خرچ کے لئے سرکار انگریزی سے مل گیا تھا۔ بیمار ہوئے اور مر گئے، علاقہ سرکار میں ضبط ہو گیا بیٹوں کی بسر اوقات کے لئے کچھ نقد رقم ملتی ہے [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۸ سے آگے) بعلت عدم ادائے مال گزاری نیلام ہوا تھا۔ اور گورنمنٹ سے سند تعلقہ داری عطا ہوئی۔ نواب مرتضیٰ خاں کی وفات کے بعد گورنمنٹ نے ہوڈل پلول کے علاقے کو واپس لے لیا اور اس کے بدلے میں ارکان خاندان کی پنشن مقرر کردی جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک جاری رہی۔ نواب مرتضیٰ خاں کے نامور فرزند نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (المتوفی ۱۸۶۹ء) تھے۔ تلامذہ غالب (ص ۱۰۷) میں مالک رام کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ نواب محمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد اور مرتضیٰ خاں بنگش کا خاندان ایک ہی تھا۔

ملاحظہ ہو (۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم ص ۲۳۰ و "نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا ایک تاریخی وصیت نامہ از محمد ایوب قادری (مجلہ علمی لاہور جولائی ۱۹۶۲ء) ص ۴۱، ۴۴

[1] چھٹی صدی عیسوی میں خاندان علوی کے ایک بزرگ باب ارسلان (ترکستان) میں نقشبندی سلسلہ کے مشہور شیخ تھے ان کی اولاد میں خواجہ عبدالرحمن بڑے صاحب حیثیت شخص ہوئے جن کے تین بیٹے قاسم جان عالم جان اور عارف جان تھے۔ قاسم جان کے بیٹے شرف الدولہ فیض اللہ بیگ خاں تھے۔ ان کے نام سے دہلی میں گلی قاسم جان مشہور ہے۔ نواب فیض اللہ خاں کے دو بیٹے تھے اول غلام حسین خاں مسرور جو اسد اللہ خاں غالب کے ہم زلف اور زین العابدین خاں عارف کے باپ تھے۔ دوسرے غلام حسن خاں محو۔ (۱) (خطوط غالب حصہ اول مرتبہ غلام رسول مہر (کتاب منزل لاہور ۱۹۵۱ء) ص ۳ (باقی صفحہ ۳۱۰ پر)

احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھرکہ ؏۔ ان کے بزرگوں کا وطن سمرقند محلہ زرگراں ہے۔ ان کے باپ اور چچا عارف جان اور قاسم جان ؔ نے نجف خاں کے دور میں جمعداری حاصل کرلی مگر دانش مندی سے بادشاہ کے دربار میں بھی رسوخ رکھا۔ اکثر شاہی لشکری، سردار کی اطاعت، سرتابی اور مستعدی میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰۹ سے آگے) غدر کی صبح و شام، (شائع کردہ خواجہ حسن نظامی (ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۶ء) ص ۳۹-۴۰

(۳) دلی کی سزا ص ۶-۷

لہ قاسم جان کے بھائی عارف جان کو صوبیدار اٹک مرزا محمد بیگ نے اپنی دامادی میں لے لیا۔ عارف جان کی شہرت دور دور پہونچی، مرزا عارف جان کے چار بیٹے۔ احمد بخش خاں، الٰہی بخش خاں، نبی بخش خاں اور محمد علی خاں تھے اُن میں احمد بخش خاں اور الٰہی بخش خاں نے شہرت دوام حاصل کی۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف حضرت شاہ فخر الدین کے مرید و خلیفہ اور مرزا غالب کے خسر تھے ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء میں انتقال ہوا۔ احمد بخش خاں اٹک میں ۱۷۶۵ء میں پیدا ہوئے دہلی میں نشوونما ہوئی گوالیار میں سواروں میں ملازم ہوئے لیکن کسی وجہ سے یہ روزگار ہاتھ سے جاتا رہا تو گھوڑوں کی تجارت شروع کی اس کی بعد ریاست الور میں ملازمت کرلی، مہاراجہ بختاور سنگھ راجا الور نے احمد بخش خاں کو دہلی میں لارڈ لیک کے یہاں اپنا وکیل مقرر کردیا۔ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کو اس خوش اسلوبی سے ادا کیا کہ ایک طرف انگریز ان کی معاملہ فہمی کے مداح تھے تو دوسری طرف راجا الور ان کی وفاداری سے ہر طرح مطمئن تھے ۱۸۰۴ء میں بھرت پور میں قلعہ ڈیگ پر انگریزوں نے چڑھائی کی، احمد بخش خاں کی درخواست پر راجا الور نے انگریزوں کا ساتھ دیا بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی، ایک موقع پر انگریز جنرل فریزر کی جان کے لالے پڑ گئے۔ احمد بخش خاں اپنی جان پر کھیل کر اسے دشمنوں کے نرغے میں سے نکال لائے۔ میدان تو انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ لیکن جنرل فریزر کے زخم مہلک ثابت ہوئے مرنے سے پہلے اُنھوں نے احمد بخش خاں کو ایک سند خوشنودی لکھ دی جس میں انگریزی حکومت سے سفارش کی کہ احمد بخش خاں کی خدمات کا مناسب صلہ دیا جائے۔ چنانچہ جب دہلی میں فتح کا دربار ہوا تو لارڈ لیک نے انھیں فیروز پور جھرکہ، سانگرس، پونہانہ بچھور اور نگینہ کا علاقہ استمراری جاگیر میں عطا کیا اور فرمان میں ان کا نام لکھوایا "فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ" مہاراجہ بختاور سنگھ نے اس پر اپنی طرف سے پرگنہ لوہارو کا اضافہ کردیا۔ نواب احمد بخش خاں ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں فوت ہوئے۔ نواب احمد بخش خاں نے چار بیٹے چھوڑے، پہلی بیوی سے نواب شمس الدین احمد خاں اور ابراہیم علی خاں اور دوسری بیوی سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے (باقی صفحہ ۳۱۱ پر)۔

ان دونوں کے مشورے سے کام کرتے تھے۔ اس وجہ سے ایرانی گروہ کے لوگوں میں ان کا بہت وقار تھا۔ اس ریاست کی بربادی سے (سقوطِ دہلی) کے بعد سب لشکریوں کی طرح یہ بھی مشکل سے دن گزار رہے تھے۔ فیض اللہ بیگ خاں جنرل پیرون کے زمانہ میں ٹھیکے کے کام میں کبھی فائدہ اُٹھا لیتے اور کبھی رقم کے مطالبے کی وجہ سے مشکلات میں مبتلا ہو جاتے۔ سوامی بختاور سنگھ راجا الور کی سرکار میں احمد بخش خاں کی رسائی ہوگئی تھی یہاں تک کہ ارکان ریاست میں شمار ہونے لگے۔ جب انگریزوں نے جمنا کی جانب راجا الور کے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے ہنگامہ کیا تو احمد بخش خاں وکیل بنکر انگریزی افواج کے سپہ سالار لارڈ لیک بہادر کی خدمت میں پہنچے، ان کے ذریعے سے سرکار انگریزی اور راجا الور کے درمیان عہد نامہ مستحکم ہوگیا، مشہور سپہ سالار سرجان مالکم بہادر کی نظرِ عنایت سے نواب احمد بخش خاں نے الور کی ریاست کے علاقہ فیروز پور کی سند نسلاً بعد نسل حاصل کرلی نیز بحالی جاگیر وعہدہ کا کام بھی عہد نامے میں شامل ہوگیا۔ اور دونوں چچازاد بھائیوں نے نوابی کا خطاب پایا۔ نواب فیض اللہ بیگ خاں مرد سادہ، مسکین اور باہمت تھا، اور نواب احمد بخش خاں دانشمند، زمانہ ساز مُدبّر اور منتظم شخص تھا۔ تمام رزیڈنٹوں سے شیر وشکر کی طرح مل جاتا اور اس کی بات منظور ہو جاتی تھی۔

حالاتِ ریاستِ الور: سوامی بختاور سنگھ راجا الور کے کوئی لڑکا نہ تھا، اس لئے اُس کا بھتیجا، ہندو مسلمان اور اہل کتاب ہر ایک کے مذہب کی رو سے ریاستِ الور کا وارث تھا۔ لیکن چارلس مٹکاف صاحب بہادر نے ریزیڈنسی کے زمانے میں ایک رنڈی بچے کو ریاست میں شریک کردیا۔ جس کی شرکت راجپوت قوم اپنے دسترخوان پر بھی پسند نہیں کرتی تھی اُس وقت سے اب تک ریاست الور میں ہنگامے برپا ہیں [۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۰ سے آگے) (۱) "تلامذہ غالب" ص ۲۸۵-۲۸۹۔

(۲) دیوان معروف (نواب الٰہی بخش خاں معروف) مرتبہ مولوی عبدالحامد قادری بدایونی (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۵ء) ص ب، ر

(۳) اخبار رنگین ورق ۱۱ ب۔

[۱] الور کا راجا بختاور سنگھ ۵ا صفر ۱۲۳۰ھ کو فوت ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء میں (باقی صفحہ ۳۱۲ پر)

جنرل آکٹر لونی کو رزیڈنٹی کے زمانے میں ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۲ء تک نواب (احمد بخش خاں) سے بے انتہا موافقت تھی۔ حتیٰ کہ اجمیر، جے پور اور نیمچ میں ہر جگہ جنرل صاحب راستے میں ایک گاڑی میں نواب کے ساتھ ہوتے تھے۔ رات کو جب تک نواب میز پر آکر نہ بیٹھ جاتے کھانا بھی نہ کھاتے تھے اور نواب کی قد آدم تصویر نیمچ کے نو تعمیر مکان میں سامنے لگا رکھی تھی۔ آکٹر لونی جب دہلی واپس آئے تو نواب سے اس درجہ رنجش ہوئی کہ صاحب کے حکم سے ان کی تصویر جلا دی گئی اور صاحب کے سامنے نواب کا کوئی نام بھی نہ لیتا تھا۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۱ سے آگے) اس کی داشتہ موسیٰ نام طوائف ہے جو اس کے ساتھ ستی ہو گئی تھی ایک بیٹا بلونت سنگھ اور ایک لڑکی چاند کنور باقی رہے اور راجا کا ایک بھتیجا بنے سنگھ تھا۔ ٹھاکروں نے بلونت سنگھ کی مسند نشینی ناجائز قرار دے کر بنے سنگھ برادر زادہ بختاور سنگھ کو مسند نشین کرنا چاہا لیکن مسلمان اس بارے میں ان سے متفق نہ ہوئے اور انھوں نے بلونت سنگھ کی حمایت کی، بالآخر دونوں مسند نشین ہوئے، نواب احمد بخش خاں نے سب سے اقرار نامہ تحریر کرایا کہ بعد بلوغ نصف نصف مال و ملک ان کو تقسیم کیا جاوے۔ اس کے تین برس کے بعد نواب احمد بخش خاں نے پرگنہ تجارا و چھو کرلہ ٹھیکے میں لے لئے جس پر ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۷ء میں نواب کا دخل ہو گیا، کالے خاں منتظم مقرر ہوا جب دونوں راجے سن بلوغ کو پہنچے تو آپس میں جھگڑنے لگے۔ اب ریاست کے اہلکاروں کے دو فریق ہو گئے۔ نواب احمد بخش خاں کھلم کھلا بلونت سنگھ کے طرفدار تھے۔

(۱) تاریخ راجگان ہند موسوم بہ وقائع راجستھان از مولوی حکیم محمد نجم الغنی خاں رامپوری (ہمدم برقی پریس لکھنؤ ۱۹۲۷ء) ص ۳۶۸

(۲) کارنامہ راجپوتاں از مولوی حکیم محمد نجم الغنی خاں رامپوری (کارخانہ روزنامہ اخبار پنجابی گورنٹ پریس بریلی) ص ۵۲

[1] راؤ راجا بنے سنگھ اور راجا بلونت سنگھ الور کے مالک مانے گئے راج کا سب کام اہل کار کرتے تھے۔ لیکن سمبت ۱۸۸۰ مطابق ۱۸۲۳ء میں سرداروں نے بنے سنگھ کی طرفداری کی اور نواب احمد بخش خاں نے بلونت سنگھ وغیرہ کی حمایت کی اس سے نزاع کی عملی صورت پیدا ہو گئی۔ اس معاملے میں جنرل آکٹر لونی روڈیڈنٹ نے راؤ راجا بنے سنگھ کو جائز حقدار سمجھ کر صدر کو رپورٹ کی لیکن نواب احمد بخش خاں نے آکٹر لونی کے خلاف بلونت سنگھ کی طرفداری میں گورنر جنرل کی خدمت میں تحریر بھیجی گورنر جنرل کے یہاں سے رزیڈنٹ کو ہدایت پہونچی کہ نواب احمد بخش خاں کی رائے کے مطابق کام کیا جائے۔ مجبوراً رزیڈنٹ کو گورنر جنرل کے یہاں کی ہدایات کے مطابق کام کرنا پڑا اور آکٹر لونی بنے سنگھ کی پوری حمایت نہ کر سکا (باقی صفحہ ۳۱۳ پر)

نواب احمد بخش خاں کے قتل کی سازش:- میں نے سُنا ہے کہ مینہ قوم کے دو آدمیوں نے جو الور کے رہنے والے تھے دو شریر گھوڑوں کو نواب کے اصطبل کے پاس لاکر چھوڑ دیا۔ ان دونوں گھوڑوں کی باہمی جنگ سے طویلے کے گھوڑے رسّیاں تڑا کر آزاد ہو گئے اور ہنگامہ ہو گیا۔ نواب نے اپنے پاس کے لوگوں کو طویلے بھیجدیا تاکہ گھوڑوں کو باندھ دیں اور خود بستر پر لیٹ گیا۔ ان دونوں مینوں میں سے ایک نے آکر نواب کے سر پر تلوار ماردی اتفاق سے نواب کا ہاتھ سر پر تھا اس لئے انگلیوں پر زد پڑی نواب فوراً اُٹھا تلوار ڈھال سنبھالی اور شور مچایا تاکہ لوگ آ جائیں۔ اُنھوں نے گھوڑوں کے ہنگامے میں یا تو سُنا نہیں اور اگر سُنا ہو تو یہ سمجھا ہو گا کہ گھوڑے پکڑنے کی تاکید ہے۔ چنانچہ یہ لوگ دیر کے بعد پہونچے مینے بھاگ چکے تھے۔ نواب کو زخمی دیکھا زخم علاج سے اچھا ہو گیا۔ فسادیوں کی الور تک تلاش ہوئی مگر اس تلاش کا انجام معلوم نہ ہوا[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۲ سے آگے) بلونت سنگھ کے متعلق یہ قرار پایا کہ چار لاکھ روپئے سالانہ کی جاگیر جو اس وقت الور کی تہائی آمدنی تھی راجہ بلونت سنگھ کو دی جائے چونکہ اس معاملے میں آکٹرلونی کی مرضی کے خلاف کام ہوا اس لئے وہ نواب احمد بخش خاں سے رنجیدہ اور کبیدہ خاطر ہو گیا۔

(۱) کارنامہ راجپوتاں ص ۳۵۲-۳۵۳ (۲) تاریخ راجگانِ ہند ص ۳۶۹

[1] چونکہ نواب احمد بخش خاں بلونت سنگھ کے طرفدار تھے۔ اس لئے بنے سنگھ کے جانب دار نواب کے دشمن ہو گئے۔ ملا خوشحال اور جہاز چیلوں اور نند رام دیوان نے ایک میو سے کہا کہ اگر تو نواب کو مار ڈالے تو چھ ہزار روپیہ نقد اور ایک گاؤں تجھ کو دیا جائے گا۔ اس نے اس کام پر آمادگی ظاہر کی۔ آٹھ ماہ تک وہ داؤں گھات میں رہا موقع نہ پایا آخر کار ۲۲ شعبان المعظم ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸ جون ۱۸۲۶ء کو دہلی میں قابو پاکر رات کو خواب گاہ میں جا گھسا اور سوتے میں نواب پر تلوار کے تین وار کئے، تیسری ضرب میں تلوار ٹوٹ گئی۔ وہ وہاں سے نکل بھاگا۔ اپنی دانست میں وہ کام تمام کر چکا تھا۔ لیکن نواب کی زندگی باقی تھی کوئی زخم کاری نہ لگا اور نیچ قضا سے نجات پائی۔ تھوڑے عرصہ میں شفا پائی غسل صحت کیا۔ میو مجرم فرار ہو کر الور پہنچا اور انعام مقررہ کا خواستگار رہا، ترغیب دہندے انعام دینے میں حیلہ حوالہ کرنے لگے، آخر راز کھل گیا۔ میو کو بلونت سنگھ نے گرفتار کرا دیا۔ اس نے مفصل ماجرا بیان کر دیا۔ اس کے بیان پر ملا خوشحال اور جہاز چیلے اور نند رام دیوان قید کئے گئے۔ راموں خاص فرار ہو کر دہلی پہونچا۔ اول اس نے نواب احمد بخش جان سے معاملہ کرنا چاہا۔ نواب نے توجہ نہ دی (باقی صفحہ ۳۱۴ پر)

نواب کسی طبعی موت میں فوت ہوا۔ ریاست اور ولیعہدی، بڑے بیٹے کو نہ دی جو بیگم کے بطن سے تھا، بلکہ چھوٹے بیٹے کو اپنا ولی عہد اور جانشین بنایا جس کی ماں طوائف تھی۔ [۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۳ سے آگے) اس کے بعد اُس نے منشی کرم احمد سرشتہ دار جنرل اکٹرلونی ریذیڈنٹ کو کئی لاکھ روپیہ دے کر اپنا ممد و معاون بنا لیا اور جنرل صاحب سے دوستی کی شکل نکالی لی۔ وہ اس پر توجہ کرنے لگے یہاں تک کہ جنرل آکٹرلونی بنے سنگھ کا معاون بن گیا۔ اس صورتِ حال سے بنے سنگھ نے فائدہ اٹھایا اور بلونت کے ساتھیوں کو محل میں ختم کر کے بلونت سنگھ کو نظر بند کر دیا ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں وہ لوگ جو نواب احمد بخش خاں کے قتل کے محرک وساعی تھے قید سے رہا ہو گئے۔ لیکن جلد ہی یہ لوگ دوبارہ گرفتار کر کے قید میں ڈال دے گئے۔ (تاریخ راجگان ہند ص ۲۶۸-۲۶۹)

[۱] ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۶ء میں نواب احمد بخش خاں فوت ہوئے۔

[۲] نواب احمد بخش خاں کی دو بیگمیں تھیں ایک میواتی الاصل اور دوسری ہم قوم، پہلی کے بطن سے نواب شمس الدین احمد خاں اور ابراہیم علی خاں تھے۔ دوسری کے بطن سے نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر۔ اہل خاندان شمس الدین احمد خاں کو اپنا ہم مرتبہ نہیں سمجھتے تھے اس وجہ سے خاندان میں مناقشت پیدا ہوئی جس نے انجام کار یہ شکل اختیار کر لی کہ شمس الدین احمد خاں ایک فریق بن گئے۔ باقی سارے خاندان نے ان کے خلاف جتھا بنا لیا۔ (خطوط غالب حصہ اول ص ۳)

° نواب احمد بخش خاں نے سرکار انگریزی اور مہاراجہ الور کی اجازت سے نواب شمس الدین کو تمام جائداد کا وارث قرار دیا تھا۔ لیکن اس فیصلے سے دوسرے بھائی خوش نہ تھے۔ اس لئے اس میں بعد کو ترمیم ہوئی اور ۱۸۲۵ء فروری میں اپنے والد (نواب احمد بخش خاں) کے ایما پر نواب شمس الدین نے پرگنہ لوہارو چند شرطوں کے ماتحت اپنے دو بھائیوں کے نام منتقل کر دیا اور بالآخر اکتوبر ۱۸۲۶ء میں باقی جائداد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ (حیات غالب ص ۶۷)

° نواب احمد بخش خاں کی وفات کے بعد شمس الدین احمد خاں نے اس تقسیم کے خلاف آواز اٹھائی اور کہا کہ سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے تمام جائداد کا قبضہ مجھے ملنا چاہیے۔ دوسری اولاد کو زیادہ سے زیادہ وظیفہ دلایا جا سکتا ہے بالآخر پانچ چھ سال کی کوششوں کے بعد ستمبر ۱۸۳۳ء میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور لوہارو کا نظم ونسق بھی اس شرط پر ان کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اپنے دونوں بھائیوں کے لئے چھبیس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔

° اس زمانہ میں مسٹر ولیم فریزر ریذیڈنٹ تھے۔ اُنھوں نے پوری کوشش کی کہ انگریزی حکومت (باقی صفحہ ۳۱۵ پر)

نواب فرخ نگر[1]:- اس ملک کے پرانے رئیسوں میں فرخ نگر کا نواب ہے جو قوم کا بلوچ ہے۔ پہلے اس کے بزرگوں نے تلوار کے زور سے بہت سے ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب نواب اسی آبادی اور چند چھوٹے چھوٹے گاؤں کا مالک ہے۔ فرخ نگر کی شہر پناہ خوشنما ہے اور اندر بھی خوش اسلوبی ہے۔[1]

راؤ پورن سنگھ رئیس ریواڑی:- ریواڑی کے اہیر بھی قابلِ ذکر ہیں سلطنت دہلی کی کمزوری سے اس قوم نے بھی بہت زور پکڑ لیا تھا۔ اب راؤ تیج سنگھ کا بیٹا راؤ پورن سنگھ مدت سے پدری علاقہ پر بسر کر رہا ہے۔ چچاؤں کے ساتھ لڑائی جھگڑا رہتا ہے ریواڑی میں راؤ تیج سنگھ نے ایک عمدہ تالاب تعمیر کرایا جو اُس کی یادگار ہے۔

نواب غلام محی الدین رئیس کنجپورہ[2]:- نواب غلام محی الدین خاں اور نواب رحمت خاں، ان دونوں بھائیوں میں ہمیشہ تکرار رہتی ہے اور نواب گل شیر خاں انگریزی سرکار پر اپنا حق خدمت ظاہر کرتا تھا جب جنرل اسٹور صاحب بہادر سکھوں کے ہاتھوں قید ہو گیا تھا نواب گل شیر خاں نے رہائی کی کوشش کی۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۴ سے آگے) نواب کے اس مطالبے کو رد کر دے لیکن اس کے باوجود جب یہ فیصلہ ہو گیا تو انھوں نے دوبارہ صدر میں اس کے خلاف لکھا اور خود نواب امین الدین خاں کو کلکتہ جانے کا مشورہ دیا تاکہ وہاں کوشش کر کے یہ فیصلہ تبدیل کرایا جائے۔ چنانچہ نواب امین الدین خاں ستمبر ۱۸۳۴ء میں کلکتہ گئے اور وہاں تگ و دو کرتے رہے آخر کار پہلا حکم منسوخ ہو گیا اور لوہارو دونوں بھائیوں کو واپس مل گیا۔"

(ذکر غالب از مالک رام ص ۱، (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۵۵ء)

[1] فرخ نگر کے نواب مظفر علی خاں تھے۔ جب نواب مظفر علی خاں کا انتقال ہو گیا تو ان کی بجائے ان کے بیٹے یعقوب علی خاں اور ان کے چچا غلام محمد خاں میں موافقت نہ ہو سکی۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ غلام محمد خاں کو دہلی ایجنسی سے دہلی میں قیام کرنے کا حکم ملا اور تیرہ سو روپے سالانہ ریاست سے ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔ چند سال کے بعد دبل کے مرض میں یعقوب علی خاں کا انتقال ہو گیا اس کے بعد ان کے چھوٹے بھائی احمد علی خاں جانشین ہوئے۔ احمد علی خاں بہت جری، بہادر اور غیور نواب تھا۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب نے بہادر شاہ ظفر کی حکومت کا ساتھ دیا، اس جرم میں نواب کو پھانسی دے دی گئی۔

(۱) دلی کی سزا ص ۹۴　　(۲) قیصر التواریخ ۴۵۶ - ۴۵۷

[2] کنج پورہ کی ریاست کی بنا نواب نجابت خاں نے اٹھارویں صدی میں ڈالی تھی نواب نجابت خاں (باقی صفحہ ۳۱۶ پر)

رؤساء کرنال :۔ محمد علی خاں مندل کی اولاد ہے جن کی جاگیر پہلے دریائے گنگا اور جمنا کے درمیان تھی پھر ان لوگوں نے اس کے عیوض کرنال کے قریب جاگیر لے لی ہے[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۵ سے آگے) "غورغشت" کے رہنے والے کاکرزئی پٹھان تھے ۱۷۲۰ء میں ہندوستان آئے۔ کچھ عرصہ تک لاہور اور ملتان میں شاہی صوبیدار کی فوجی ملازمت میں رہے۔ اس کے بعد تین سو سواروں کی جمعیت کے ساتھ کرنال آئے۔ اس زمانہ میں مغلیہ خاندان کے بادشاہ محمد شاہ کی فرماں روائی تھی دربار عیش و عشرت میں مصروف تھا، ملک میں شاہی انتظام بگڑ چکا تھا۔ ایسے موقع سے فائدہ اٹھا کر نجابت خاں نے کرنال کے قرب و جوار کے کچھ علاقے پر قبضہ کرکے کرنال کے قریب دریائے جمنا کے کنارے نجابت گڑھ کی بنیاد ڈالی۔ اس نجابت گڑھ کا نام بعد کو کنج پورہ ہوا۔ یہ نئی بستی مضبوط فصیلوں اور خندق سے محفوظ کرکے پٹھانوں اور دیگر مسلمانوں سے آباد کر دی گئی۔ اس کے بعد دہلی دربار سے صوبہ سہارن پور کے فوجدار کو نجابت خاں پر فوج کشی کرنے کا حکم پہونچا۔ جنگ کی نوبت آئی۔ نجابت خاں کی فتح ہوئی آخر میں دہلی دربار نے نجابت خاں کو باقاعدہ نواب تسلیم کر لیا اور جس قدر ملک کا حصہ نواب نجابت خاں کے پاس تھا بدستور ان کے قبضہ میں رہا۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد مرہٹوں سے سخت جنگ ہوئی نجابت خاں کو شکست ہوئی اور وہ مرہٹوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے اسی اسیری میں ان کا انتقال ہوا۔

۱۷۶۱ء میں احمد شاہ درانی اور مرہٹوں میں پانی پت کی مشہور تاریخی جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ اس جنگ میں نواب نجابت خاں کے بیٹے دلیر خاں نے احمد شاہ کی طرف سے مرہٹوں کے خلاف ایسی چال بازی سے جنگ کی تھی کہ احمد شاہ نے اس کے صلے میں دلیر خاں کو کنجپورہ کا نواب کر دیا اور اس طرح یہ ریاست نواب نجابت خاں کے خاندان میں بار دگر واپس آگئی۔ پنجاب کی بڑی چھوٹی ریاستوں میں کنجپورہ کی ریاست بھی شمار ہوتی تھی جب امن و راحت کا زمانہ نصیب ہوا تو خاندان کنج پورہ کے رئیس آرام طلب ہو گئے۔ سپہ گری اور جفاکشی کی جگہ کاہلی اور عیش طلبی نے لے لی۔ آخر سکھوں نے ریاست کا ایک بڑا حصہ نواب نجابت خاں کے جانشینوں سے چھین لیا۔"

[حیات آفتاب از حبیب اللہ خاں
اولڈ بوائز ایسوسی ایشن
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ ۱۹۴۳ء ص ۱-۲]

[1] محمد علی مندل کے تین بیٹے تھے جن میں سے ایک کا نام عشرت علی خاں تھا ان کا ذکر باب سوم میں موجود ہے

نواب فیض محمد خاں رئیس پاٹودی :- نواب فیض محمد خاں پسر نواب نجابت علی خاں بھڑ پچ ہیں تین پشتوں سے ان لوگوں کو سرکار میں عزت و اعتبار حاصل ہے فن سپہ گری میں خوب دسترس حاصل ہے سرجان مالکم بہادر کی نوازش سے نجابت علی خاں، اسمٰعیل خاں اور فیض طلب خاں نے معاشی امداد میں نسلاً بعد نسلٍ ملک حاصل کرلیا ہے۔ یہ علاقہ کچھ تو معاشی سلسلے میں اور کچھ ان سواروں کی تنخواہوں کے لئے جن کی بحالی اور برطرفی کا اختیار ان کو حاصل ہے۔ ملا ہے۔ اسمٰعیل خاں کے لڑکوں نے بداعمالیوں سے اپنی جاگیر برباد کردی جس کو قرضے میں فیض محمد خاں نے حاصل کرلیا فیض طلب خاں بھی علاقہ پاٹودی کے علاوہ سواروں میں دخل نہیں رکھتا۔

فیض محمد خاں کا ملک آباد اور فوج و سامان درست ہے، اس کو شکار کا بے حد شوق ہے۔ اس کے بچپن کا ایک ہندو ساتھی ریاست کا مختار کل ہے۔ فیض محمد خاں کبھی شاہجہاں آباد میں اور کبھی اپنے علاقے میں رہتا ہے۔

لہ فیض محمد خاں کے والد نواب نجابت علی کو لارڈ لیک کے زمانے میں جاگیر عطا ہوئی، نواب فیض محمد خاں کا انتقال ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں ہوا۔ ان کی قبر "نواباں جھجر کی ہڑواڑ" میں ہے لوح مزار پر یہ کتبہ نصب ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

نواب چوں گذشت ازیں ایرماں سرائے	از جوش درد و غم ہمہ عالم بہم زدم
تاریخ رحلتش سبہ لوح مزار او	آرام گاہ فیض محمد الم زدم

۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء

نواب فیض محمد خاں کی قبر کے داہنی طرف فیض علی خاں کی قبر ہے جو جھجر کے آخری نواب عبدالرحمٰن خاں کے والد تھے۔ نواب عبدالرحمٰن خاں کو جنگ آزادی ۱۸۵۸ء میں پھانسی دی گئی تھی۔

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ سوم ص ۲۶۳ - ۲۶۴
(۲) اخبار رنگین ورق ۳۱ ب و ۳۲ و
(۳) دلی کی سنداس ۶۲ - ۶۳

فیض طلب خاں مرد جہاں دیدہ اور زمانے کا گرم و سرد چکھے ہوئے ہے۔ فوج اور ملک کے کام میں ہوشیار مہمان نواز اور نہایت کفایت شعار ہے۔ لیکن اس میں اور فیض محمد خاں میں رنجش رہتی ہے
شہر دہلی کے انگریز حکام :۔ اس شہر میں سیٹن صاحب عدالت فوجداری اور دیوانی میں چھو نے سکندر کے قصے نیز بھوانی شنکر اور ایک بڑھیا کے چند گز زمین کے جھگڑے میں بہت کچھ نیک نام رہے۔ اور رزیڈنسی میں چارلس مٹکاف صاحب رزیڈنسی کے متعلق اُمراء میں بہت نامور ہے فارقسکو صاحب اور ولیم ایور صاحب بے رو رعایت انصاف میں مشہور ہیں۔ شان و شوکت میں جنرل آکٹرلونی صاحب شہرۂ آفاق رعایا کی آسائش میں گارنر صاحب، زود فہمی اور واقفیت میں ولیم فریزر صاحب، تحقیقات اور رہزنی کی روک تھام میں۔ ہیزیل کو مدلس صاحب سلامت روی، چوری اور غارت گری کے انتظام میں، ویلدر صاحب اور نیک مزاجی میں طامس مٹکاف صاحب مشہور ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ طامس مٹکاف صاحب، خوش طبع، سیر چشم، رفیق پرور اور پاک دل ہے چونکہ ملک میں نہ کوئی قانون رہا نہ بڑے صاحب (رزیڈنٹ) نے کبھی اس کو یہاں کا سررشتہ سکھایا نہ کوئی ہوشیار اور خیر خواہ ملازم اس کی پیشی میں رہا۔ اس لئے جو کچھ اس کی سمجھ میں آتا ہے کر گزرتا ہے دیدہ و دانستہ نہ کسی کی ایذا رسانی اور نہ کسی کی بے جا حمایت کا روادار ہے البتہ ساتھیوں کی دھوکہ بازیوں کا شکار ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس بات سے کون محفوظ ہے۔

کرامت علی دہلوی :۔ اس شہر میں کرامت علی نامی ایک شخص ہے اُس کا باپ ہاتھی اور پالکی کا ظاہری مرتبہ رکھتا تھا۔ کرامت علی کا حال شہر کے دوسرے شریف زادوں جیسا ہے۔ شطرنج بازی میں بڑی مہارت ہے۔ اس کھیل میں کوئی شخص اس کے مقابلے میں بہت کم کامیاب ہوسکتا ہے[1]

دھلی سے روانگی :۔ الغرض اس شہر (دہلی) سے ہم آقا کے ساتھ روانہ ہوکر لشکر میں پہنچے اور گوہانہ میں داخل ہو گئے۔ خلیل اللہ خاں نے منشی فیض الحسن ساکن سرادہ ضلع میرٹھ کی آقا سے تقریب کر دی آقا نے فرمایا بلا لو خلیل اللہ خاں نے آقا کے قول پر عمل کیا اور منشی فیض الحسن راستے میں رہزنوں کے ہاتھ سے مصیبت برداشت کرتا ہوا آپہونچا۔ اسی دوران میں میر جلال الدین

---

[1] مزید حال معلوم نہ ہوسکا۔

شاہجہاں آباد کے باشندے نے علی محمد خاں جمعدار سواران اسکنر صاحب کی سفارش سے ملازمت کر لی اور سونی پت کا تھانیدار ہو گیا۔ ویلڈر صاحب نے منشی فیض الحسن کو دیکھ کر مجھ سے پوچھا کہ یہ شخص کیسا ہے میں نے کہا کہ اس شخص سے سابقہ ملاقات اور واقفیت نہیں ہے اس لئے میں کیا کہہ سکتا ہوں مگر ان دو تین روز میں جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے عرض کئے دیتا ہوں کہ خود بدولت اس کی کارگذاری سے ہمیشہ خوش دل رہیں گے اور اس کے طرز عادات سے جو آنجناب کے مزاج وہاج سے موافقت نہیں رکھتا ہے ہمیشہ رنجیدہ رہیں گے۔ صاحب ممدوح نے فرمایا کہ پہلے یہ بات کیوں نہیں بتائی تھی، میں نے کہا کہ اس وقت جو کچھ میں نے عرض کیا ہے یہ میرا گمان ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے اور پہلے یہ بات سمجھی نہ تھی۔

ہنگامۂ بھوانی:۔ ان ہی ایام میں بھوانی میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ وہاں کے لوگوں نے نائب تحصیلدار کو مار ڈالا۔ تھانے پر حملہ آور ہوئے۔ اس لئے تھانے کے لوگ بھاگ گئے۔ صاحب نے گوہانہ سے بھوانی کی طرف کوچ کیا۔ بندہ (مولوی عبدالقادر) ساتھ گیا۔ صاحب نے بھوانی پہنچتے ہی تھانے کے سب آدمیوں کو جیل خانے بھیجدیا۔ صرف ایک جمعدار اس حکم سے مستثنیٰ رہا کیونکہ وہ اس ہنگامے کے وقت تھانے میں موجود رہا۔ اسکنر صاحب نے کہا کہ یہ ہنگامہ نندا مہاجن کے لڑکے ڈونگر مل وغیرہ کے بہکانے سے رونما ہوا ہے اور اسکنر صاحب کے چند سواروں نے بھی اسی طرح کہا۔ صاحب نے ڈونگر مل اور اس کے بھائی کو بلا کر ان کے اظہار لئے اور بندے (مولوی عبدالقادر) نے تحریر کئے۔ مہاجن کے بیٹے وغیرہ نے مطلقاً انکار کیا۔ سواروں نے بھی اظہار لکھاتے وقت بیانات میں بہت کچھ اختلاف کیا۔ جس سے بناوٹ ظاہر ہوتی تھی۔ اسی روز مہاجن کے گھر لڑکی کا بیاہ تھا۔ دولہا اور دوسرے رشتے دار دور سے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آج ہم کو ضمانت پر چھوڑ دو آئندہ آپ حاکم ہیں، آقا نے یہ تمام بے سر و پا قصہ سمجھ لیا کیونکہ ہنگامہ کا سبب کچھ اور ہی تھا۔

واقعہ یہ تھا کہ تحصیل کا ایک چپراسی ان لوگوں کی عورتوں میں جاتا اور یہ کہتا کہ اپنے چہرے مجھے دکھاؤ جو خوبصورت ہوگی اس کو فلاں صاحب کے لئے (جس کا نام لیتا تھا) لے جاؤں گا۔ کیونکہ مجھے حکم ملا ہے۔ ان لوگوں نے چپراسی کی شکایت تحصیل میں کی وہاں شنوائی نہ ہوئی بلکہ ان لوگوں

ہی کو اُلٹا ڈانٹا گیا۔ ان لوگوں نے پولیس میں اپنا دکھڑا رویا وہاں بھی کوئی فریاد رس نہ ہوا، کیونکہ وہ نام کا چپراسی اتنی زور آوری کرتا تھا کہ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ناچار وہ لوگ مرنے مارنے پر آمادہ ہو کر یہ کارروائی کر بیٹھے۔ اول اس چپراسی کو مارا اس کے بعد اس شخص کو جو تحصیل کی کچہری میں رہتا تھا اور نائب تحصیلدار سمجھا جاتا تھا۔

صاحب نے تھانے میں آکر ان سب لوگوں کو رخصت کیا اور فرمایا کہ گوہانہ میں آجاؤ، وہاں آخری حکم سنایا جائے گا اور جب یہ سمجھ لیا کہ فساد کے مرتکب صرف محلہ کالو داس کے لوگ ہیں۔ دوسرے لوگ پکڑ دھکڑ کے خوف سے بھاگ گئے ہیں تو فرمایا کہ محلہ کالو داس کے لوگوں کے لئے گرفتاری کا حکم ہے، دوسرے لوگ آکر آباد ہو جائیں یہ حکم سُنکر لوگ واپس چلے گئے۔

دیگر واقعات :۔ اسی زمانے میں ہانسی کا تحصیلدار اصالت خاں چوروں اور ڈاکوؤں سے سازش کرنے کے اتہام میں جیل خانہ جا چکا تھا اس پر یہ الزام ہمدانی میواتی نے لگایا تھا جس پر اسکنر صاحب کی خاص عنایات تھیں۔ ان ہی ایام میں ببری کے تھانیدار اور جمعدار رشوت ستانی کی بہت سی نالشوں کے جُرم میں جیل خانہ میں تھے۔ بندے کا چھوٹا بھائی غلام باسط رخصت لے کر وطن گیا ہوا تھا وہ واپس آیا۔

بہاری لال سونی پت میں اپنے ٹھیکے پر تھا وہ وہاں سے گوہانہ میں مجھے دیکھنے آیا۔ ویلڈر صاحب نے فرمایا کہ یہ شخص اب گارنر صاحب کا معتوب نہیں ہے اگر یہ ملازمت کرنی چاہے تو سررشتے میں جگہ مل جائے گی۔ میں بہاری لال کو اپنے ساتھ لے گیا وہ لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگا۔

اس عرصے میں میں نے دیکھا کہ باہمی کینہ پروری سے محکمے کا رنگ بدلا ہوا ہے چند اہلداروں کی سرپرستی ضروری سمجھی گئی۔ اسی تجویز سے محکمے میں یہ رنگ پیدا ہوا اور اب آقا کو میری چنداں ضرورت بھی نہیں رہی۔ میں نے رخصت چاہی مگر رخصت نہ دی ایک دن انتظام علی نے جو حرف شناس ہونے کی وجہ سے اکثر درِ دولت پر حاضر رہتا تھا۔ دفتر میں آکر کہا کہ صاحب نے فرمایا ہے کہ فتح آباد کے چپراسی نے رخصت لی ہے مگر ابھی یہیں ہے۔ اس قسم کی بد انتظامی تمہاری برخاستگی کا سبب ہوگی ہے مجھے اس بات کا علم نہیں کہ انتظام علی نے یہ بات خود کہی یا کسی کے بہکانے سے کہی۔

میں نے اُس سے کہا کہ چپراسیوں کا تعلق ناظر سے ہے یہ بات ناظر کے لئے کہی ہے یا میرے لئے۔ انتظام علی نے کہا کہ آپ کے لئے فرمایا ہے۔ میں نے کہا کہ صاحب سے عرض کر دو کہ میں از خود نہیں آیا تھا حسب طلب وطن سے آیا تھا جیسے پہلے چلا گیا تھا۔ اب بھی چلا جاؤں گا اور اس بات کی مجھے قطعاً پروا نہیں ہے کہ نیک نامی کا پروانہ عنایت ہو یا استعفاء منظور ہو یا برطرفی کا حکم صادر ہو۔

رامپور کو روانگی:۔ میں فوراً دفتر سے اٹھا باغپت کے گھاٹ تک باربرداری کا انتظام کیا اور سامان درست کر کے طلوع آفتاب سے پیشتر روانہ ہو گیا اور ایک اطلاعی عرضی لکھدی کہ اگرچہ حضور والا کے مجھ سے بہتر ہزاروں غلام ہیں۔ اور میرے لئے حضور جیسا کوئی حاکم نہیں لیکن چونکہ میں چپراسیوں کی وجہ سے عتاب کا مخاطب ہو گیا اس لئے حضور والا کے خطاب کے لائق نہیں رہا۔

گوہانہ سے منزل بمنزل میرٹھ پہونچا۔ کارتن صاحب بہادر وہاں کے کلکٹر تھے۔ کوتوال کے ذریعے اُنھوں نے مسافر خانے میں میرے پہونچنے کی خبر سُنی فوراً چپراسی بھیجکر یاد فرمایا کہ کل حاضر ہو۔ دوسرے دن سفر ملتوی کر کے حاضر خدمت ہوا مختلف قسم کی گفت گو ہوئی۔ لیکن دورانِ گفتگو میں نہ آقا نے حاضر باشی کے لئے ارشاد فرمایا نہ بندے نے بطور حسن طلب ملازمت کی آرزو ظاہر کی دوسرے روز میں چل دیا۔ بارش کی وجہ سے گڈھ مکتیشر تک نہ پہنچ سکا بلکہ پلکوے میں تانک شاہی نفر کے مکان کے قریب رات گزارنے کے لئے ٹھیر گیا۔ وہ شخص بے آزار، شکم پرور اور رازدار ہے

گڈھ مکتیشر:۔ دوسرے روز گڈھ مکتیشر پہنچا وہاں ایک مزار ہے۔ ان بزرگ کو گنج بخش کہتے ہیں[1]۔ مقبرے

---

[1] گڈھ مکتیشر گنگا کے کنارے ایک قصبہ ہے یہاں دورِ اکبری کے ایک بزرگ "اللہ بخش" کا مزار ہے۔ شیخ اللہ بخش گڈھ مکتیشری چالیس سال تک ارشاد و ہدایات میں مشغول رہے، بڑے متوکل بزرگ تھے، اُن کی صحبت میں خدا یاد آتا تھا۔ ستر برس کی عمر میں سنبھل کی سیر کے لئے گئے تھے وہاں ایک بڑھیا بڑی عابدہ اور زاہدہ تھی شیخ پنجو مرحوم سنبھلی کی خدمت کیا کرتی تھی۔ ہمیشہ روزے رکھا کرتی تھی پینتیس ۳۵ سال سے بے شوہر تھی اور دودھ کے سوا اور کچھ نہ کھاتی تھی وہ غائبانہ شیخ اللہ بخش کی بڑی معتقدہ تھی۔ اُس نے درخواست کی کہ مجھے بھی خدا کا راستہ بتائیے اُنھوں نے فرمایا جب تک تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر کے کسی کے نکاح میں نہ آئیگی یہ بات کہنی فضول ہے وہ محفہ میں سوار ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حضرت کے نکاح میں آ گئی۔ مُلا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ میں بھی اپنے ایک دوست محمد قاسم دہلوی کے ہمراہ شیخ اللہ بخش کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے ان کو (باقی صفحہ ۳۲۲ پر)

میں گھڑیال اور نقارہ بلکہ پورا امیرانہ ٹھاٹ ہے جس وقت کسی کے کان میں گھڑیال کی آواز پہنچتی ہے تو سر جھکا کر تین بار "داتا گنج بخش" کہتا ہے۔

ورود رامپور: میں گڑھ مکتیشر سے امروہہ آیا۔ اور امروہہ سے مراد آباد اور مراد آباد سے رامپور پہونچا۔ میرے والد نے میرا سر اور میں نے ان کے قدم چومے۔ گوہانہ سے روانگی کی تاریخ ۲۷ رجون ۱۸۱۵ء تھی، دو تین روز کے بعد بزرگوں کی قدمبوسی اور امیروں کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا۔

نواب عنایت اللہ خاں بہادر جنھوں نے ہمیشہ سے مجھے شریک دولت بھور رکھا ہے میری شکستہ حالی کی وجہ سے میرے کفیل ہو گئے، کتاب شافیہ پڑھنی شروع کر دی۔ میں عرصے تک سیر و سفر میں ان کے ساتھ رہا اکثر ان کا سفر نواب احمد علی خاں کے ہمراہ ہوتا تھا۔

محمد یوسف خاں جنگی رئیس لگرالہ: ایک مرتبہ نواب احمد علی خاں ایک دن پہلے سفر پر روانہ ہو گئے، اور عنایت اللہ خاں، عباد اللہ خاں، جعفر علی خاں محمد سعید خاں اور عبد العلی خاں ایک روز بعد چلے۔ راستے میں موضع لگرالہ میں محمد یوسف جنگی ملنے آگیا اور سب کو اپنے گھر لے گیا محمد یوسف خاں جنگی کو یہ موضع سرجان مالکم بہادر کی مہربانی سے تاحیات جاگیر میں ملا ہے اور محمد یوسف اس خاندان (نوابان رامپور) کا نمک پروردہ ہے لقیہ دن اور رات ہم نے لگرالہ میں محمد یوسف خاں کے یہاں گزارے۔

محمد یوسف خاں جنگی ہاتھ کا کھلا ہوا تھا۔ آمدنی سے زیادہ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اس لئے ہمیشہ قرضدار رہتا تھا، داد و دہش، بے موقع ہو یا موقع اس کے لئے دونوں برابر تھیں بلکہ بے موقع زیادہ۔ وہ محمد عمر خاں کا بیٹا ہے اور یہ خاندان نواب فیض اللہ خاں کی فوج میں فنون سپہ گری یعنی سواری نیزہ بازی اور جنگی چالوں میں ممتاز رہا ہے، اگر نواب محمد علی خاں کے خونِ ناحق میں شریک نہ ہوتے تو ہمیشہ اس خاندان (سرکار رامپور) میں روٹی کے شریک رہتے۔ اب تو وہ زمانہ گزر گیا۔ اب محمد یوسف خاں کا بیٹا، جلال الدین حیدر خاں تین سو روپئے تنخواہ انگریزی سرکار سے پاتا ہے اور جاگیر واپس ہو گئی۔ اس کے بھائی اسد اللہ خاں اور عرب خاں سپہ گری کا کام اور سواروں کی ترتیب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۱ سے آگے) بڑا خوش مجلس اور خوش تقریر تھا شیخ اللہ بخش کی ایک تصنیف "مونس الذاکرین" مطبع صدیقی بریلی میں ۱۳۰۲ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ منتخب التواریخ اردو ترجمہ ص ۴۲۲

تربیت خوب جانتے ہیں مگر اس زمانے میں کون پوچھتا ہے آج کل سرکاری نوکری ملنا کمینوں کی خوشامد پر موقوف ہے اور شریف زادوں کو خوشامد کرنی آتی نہیں [1]

---

[1] محمد یوسف خاں عرف جنگی خاں رامپور کے مشہور روہیلہ سردار عمر خاں بڑ مونچھے (ابن شہامت خاں ابن دراز خاں) کے بیٹے تھے۔ عمر خاں نے ۱۷۹۴ء میں نواب غلام محمد خاں رئیس رامپور کی مسند نشینی کے سلسلے میں بڑی جد وجہد کی، جب آصف الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے ۱۷۹۴ء میں رامپور پر فوج کشی کی تو عمر خاں اور ان کے تینوں بیٹے عبدالصمد خاں عرف صمند خاں سربلند خاں عرف بلند خاں اور محمد یوسف خاں عرف جنگی خاں نے نواب غلام محمد خاں کی طرف سے دشمن کے مقابلے میں خوب داد شجاعت دی۔ بلند خاں مارا گیا ـــ عمر خاں کا انگوٹھا اُڑ گیا اور ایک آنکھ ضائع ہوگئی۔ انگریزوں نے جب دھوکے سے نواب غلام محمد خاں کو اپنے لشکر میں قید کر لیا تو پھر عمر خاں نے انگریزوں سے ایک جھڑپ لی اور نواب کی رہائی کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد عمر خاں کے بیٹے محمد یوسف خاں عرف جنگی خاں کو ہلکر نے اپنے یہاں بلا لیا کچھ عرصے کے بعد یوسف خاں نے ہلکر کی ملازمت چھوڑ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی ۱۸۰۳ء میں انگریزوں اور مرہٹوں میں دلی پر جو لڑائی ہوئی اس میں یوسف خاں نے انگریزوں کی طرف سے خوب داد شجاعت دی۔ اس خدمت کے صلے میں یوسف خاں کو موضع ککرالہ (ضلع بدایوں) جاگیر میں ملا ۱۸۲۹ء میں یوسف خاں کا انتقال ہوا اولاد کی پنشن ہوگئی۔ گزیٹر بدایوں میں یوسف خاں اور جنگی خاں کو دو علیحدہ شخصیتیں بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نواب وزیر اودھ کی طرف سے ککرالہ یوسف خاں کو جاگیر میں ملا۔ گزیٹر بدایوں کا یہ بیان صریحاً غلط ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ککرالہ خاص شہرت کا مالک ہوا۔ اس مقام پر مجاہدین نے انگریزی فوج سے سخت مقابلہ کیا مولانا فیض احمد بدایونی اپنی جماعت کے ہمراہ اس مقابلے میں موجود تھے، انگریزوں کا مشہور جنرل پینی مارا گیا۔ قصبہ ککرالہ بدایوں سے مشرق کی طرف قریب ۱۲ میل کے فاصلہ پر واقع ہے قصبہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو:-

(۱) اخبار الصنادید جلد دوم ص ۶۱۵، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۴۸، ۶۶۱

(۲) مولانا فیض احمد بدایونی از محمد ایوب قادری (پاک اکیڈیمی، کراچی ۱۹۵۷ء) ص ۲۶-۲۹

(۳) DISTRICT GAZETTEER OF THE UNITED PROVINCES, VOL XV, P 217-218

[2] بدایوں ۱۸۵۷ء میں، از محمد سلیمان بدایونی (کراچی ۱۹۶۰ء) ص ۸۹-۹۰

(باقی صفحہ ۳۲۴ پر)

مولوی عبدالقادر کے والد کا انتقال:۔ میں نے رامپور میں کافی دن گزار دیئے کہ ناگہاں باپ (مرزا محمد اکرم) نے سل کے عارضے میں بتاریخ ۲۰ رجب ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶ء شنبہ کی آخر شب میں انتقال کیا۔[1] ان کو ایک سال سے مرض تھا، والد کے انتقال کی شب اتنی مشکل تھی کہ دن پکڑنا دشوار تھا۔

پدر تا بود مرد برنا بود — بہ ہر کار مشکل توانا بود
اگر ناگہت پائے در گل رود — بہ غمخواری وے غم از دل رود
پہ از عود نہ خواہد ترا جز پدر — بروئے، بخوئے، بہ زور و ہنر
پشیزے بہ چشمش بود گنج تو — فراواں بود پیش او رنج تو
شبے کاندراں روزے من شد سیاہ — .... دراں تاب ماہ
سیوم بخش آں بد نہ چنداں دراز — کہ تا نیمہ آں رسد تیر آز
بسر بردم آں را من سخت جاں — تو گوئی لب شد روزگارم دراں
سپیدی ازاں تیرگی شد نمود — بدانساں کہ آتش نماید ز دود
دیا ہمچو دندان پیل دماں — کہ خو کردہ باشد بخون کساں
دیا زنجمے را بکیں کہن — برآید گہے خشم کف از دہن
بہ ہر گونہ با ایں و آں ساختم — بہ ساماں مرگش بپرداختم
تنم خستہ بود و دلم دردناک — کہ کردیم آں گنج پنہاں بہ خاک
بچشم دریں غم کہ آبے نماند — ندانی کہ بر آتش دل نشاند
کہ خونابہ دیدہ گرد و چہ خشک — بہ زخم جگر می کند کار مشک

ازاں داشتم درد دل را نہاں
کہ بودم بہ غمخواری دیگراں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۳ سے آگے) THE HISTORY OF THE REIGN OF SHAHAULUM By W. FRENCKLIN (ALLAHABAD, 1934) PP. 220 - 245

[1] مولوی عبدالقادر کے والد مرزا محمد اکرم کا حال باب اول صفحہ ۷ پر ملاحظہ ہو۔

اس زمانے میں غلہ گراں اور قرضہ بہت تھا۔ باپ نے زر، زیور، باغ اور زمین کچھ نہ چھوڑا بسارے شہر سے شناسائی تھی۔ چند روز تک چھوٹے بڑے تعزیت کے لئے آتے رہے اور اس سے زخم پر نمک پاشی ہوئی، روزانہ گزارے کی دلخراش فکر علیحدہ تھی بالآخر ولی نعمت (نواب عنایت اللہ خاں) کی امداد سے سبکدوشی ہوئی۔ خدایا یہ خاندان ہمیشہ آسودہ خاطر اور ہر مسافر و مقیم کے زخمی دلوں پر مرہم نہاں رہے۔

سفر کوہستان کی تقریب: چند روز کے بعد ہاتھی پکڑنے والوں اور محصول کے ٹھیکیداروں میں محصول فیل پر جھگڑا ہو گیا۔ اس گروہ کے کچھ لوگ نواب عنایت اللہ خاں بہادر کے دامن دولت سے وابستہ تھے نواب صاحب نے فرمایا کہ اس مقدمے کا فیصلہ کسی شخص کے کوہستان جائے بغیر نہیں ہو سکتا اور کوہستان کے سفر سے ہر شخص پہلو تہی کرتا ہے چونکہ میں (مولوی عبدالقادر) ہمیشہ سے بے محنت کی اُجرت لے رہا تھا۔ اس لئے میں نے کوہستان جانے پر آمادگی ظاہر کی۔ نواب صاحب کی والدہ ماجدہ عالیہ بیگم صاحبہ اپنے ملازموں اور نمک خواروں پر مادرانہ شفقت رکھتی تھیں، وہ بہت بلند ہمت غریب نواز، دور اندیش اور نظم و نسق میں درست رائے رکھنے والی تھیں جیسے کہ نامور اور زمانے کے گرم و سرد آزما لوگ، امراء و سلاطین میں بیشتر ہوتے رہیں۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ میں نہیں، چاہتی کہ اس ناز پروردہ بچے کا سر پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرواؤں۔

میں نے عرض کیا کہ باپ کے انتقال کی وجہ سے جب گھر والوں کو ماتم زدہ دیکھتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے ممکن ہے اس سفر میں پریشانی کم ہو جائے اس کے بعد سفر کا حکم دے دیا پہاڑی سفر کے لئے گھوڑے کی سواری نہایت مناسب تھی۔ لیکن خداوند نعمت (نواب عنایت اللہ خاں) نے پالکی کی سواری کو عزت افزا سمجھا۔ بیس کہار، آٹھ فوجی جوان اور چند خدمت گار ساتھ گئے۔

بلاسپور: رامپور سے روانہ ہو کر میں بلاسپور پہونچا۔ یہ قصبہ رامپور سے بارہ کوس ہے، وہاں دھان اور گنے کی پیداوار بہت اچھی ہوتی ہے۔ مدت سے اس نواح میں پٹھان بھی کاشتکاری کرتے ہیں اور دنیا گردی کی مصیبت سے آرام میں ہیں۔ یہ مقام نواب احمد علیخاں کے زیر حکومت ہے[1] یہاں

---

[1] یہ قصبہ رامپور سے شمال اور مشرق کی طرف ۱۰ میل کے فاصلے پر رامپور اور رودرپور کی سڑک پر آباد ہے (باقی صفحہ ۳۲۶ پر)

بھینسوڑی :۔ رودرپور سے چل کر بھینسوڑی قیام کیا یہ موضع دامن کوہ میں واقع ہے[1]۔ وہاں داروغہ رسد رہتا ہے۔ انگریزی سرکار نے بھینسوڑی سے الموڑہ تک ہر منزل پر مسافروں اور مویشیوں کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۵ سے آگے) اور تحصیل بلاسپور کا صدر مقام ہے۔ اس علاقے میں تنکار کثرت سے ملتا ہے۔ یہ مقام رامپور سے پُرانا ہے کٹھیر راجہ بلاس رائے نے آباد کیا۔ نواب فیض اللہ خاں بانی ریاست رامپور کے عہد میں یہاں تحصیل قائم ہوئی، یہاں کے پہلے تحصیل دار عالم خاں ہوئے۔ رامپور کے بعد اسلامی آثار کا سب سے زیادہ حصہ بلاسپور کو ملا۔ سید ابدال شاہ بونیر سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ بلاسپور میں محلہ سادات، سید ابدال کے قیام کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ان کو علوم عربیہ و فارسی میں دستگاہ کامل تھی۔ پشتو مادری زبان تھی۔ نہایت مقدس اور مرتاض بزرگ تھے۔ ان کا مزار تراب علی شاہ کے مزار کے قریب ہے۔ ان کے علاوہ شاہ عبدالواحد، شیدی میاں، مولوی حکیم عبدالرزاق اور عبداللہ اخوند بھی قصبہ بلاسپور میں قابل ذکر حضرات گزرے ہیں قصبہ بلاسپور کی آبادی چھ ہزار کے قریب ہے۔ اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہاں گیارہ مسجدیں ہیں جو نہایت خوبصورت اور مستحکم ہیں جامع مسجد خاص طور سے قابل ذکر ہے جو نواب احمد علی خاں کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ واقعہ یہ ہوا کہ ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء میں نواب احمد علی خاں کا بلاسپور میں قیام ہوا ہندوؤں نے مندر میں سنکھ بجایا۔ بلاسپور کے مسلمان مزاحمت کے لئے جمع ہو گئے، نواب صاحب کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو خود مندر میں پہونچ کر جھگڑے کو رفع دفع کیا اور مسلمانوں کے لئے مسجد بنوادی یہ مسجد بھکڑا ندی کے کنارے واقع ہے۔

مولوی حفیظ اللہ ولد شیخ کرامت اللہ بدایونی نے مسجد کی تاریخ اس طرح کہی ہے ؎

لب دریا و آں مسجد چو دیدم — بہ بحر فکر خوردم غوطہ چنداں
کہ آوردم دُرِ تاریخ سالش، — منور تر ز خورشید درخشاں!
رواں گفتم زہے بر روئے دریا — بنا شد سجدہ گاہ نیک بختاں ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء

بلاسپور میں بشارت خاں کا مقبرہ نہایت خوبصورت اور قابل دید ہے۔ بشارت خاں روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ کے چچا تھے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (۱) مرتب کا مقالہ "ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا" روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات

"العلم" کراچی جلد ۳ شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۵۴ء ص ۱۰۱-۱۰۳

[1] بھینسوڑی تحصیل ملک (رامپور) میں واقع ہے، یہاں مسلمانوں کی اچھی آبادی ہے۔ اس چھوٹی سی بستی میں بعض ممتاز صاحب علم و فضل اور درویش گزرے ہیں جن میں حب علی شاہ، رسالدار محمد الف خاں (باقی صفحہ ۳۲۷ پر)

خورد و نوش کی ضروریات فراہم کر رکھی ہیں یہ راستہ چار دن کا ہے الموڑہ سے محکمہ رسد کے مہتمم کا تجویز کردہ نرخنامہ اجناس ہر ایک داروغہ کے پاس پہنچ جاتا ہے. کبھی دو نرخنامے، ایک سرکاری ملازموں کے لئے اور دوسرا عام لوگوں کے لئے. پہنچتے ہیں وہاں پلٹن کے چند سپاہی بھی رہتے ہیں اس وقت تمام چوکیوں کا مہتمم بلاس رائے کا بھائی، بلاس رائے سکینہ کالیستھ تھا یہ شخص امروہہ کے محلہ کاٹھ منڈی کا رہنے والا تھا. اور قیام اودھ کے زمانے میں بلاس رائے میرے ماتحت محرری کا کام کر چکا تھا. یہاں بلاس رائے کو اپنے انگریز آقا کے حضور میں اس قدر رسائی تھی کہ دوسرے مہتموں کے متعلق کوشش اور سفارش میں پورا اثر رکھتا تھا. اُسے شاید میرے متعلق اطلاع پہنچ گئی تھی بڑی خاطر سے پیش آیا. جس چیز کی ضرورت ہوتی واجبی قیمت سے پہنچاتا تھا.

بھیم تال: بھینسوڑی سے ہم نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا کبھی پیادہ اور کبھی سواری میں چلتے، بہزار دشواری شام تک کہاروں نے بھیم تال کے مقام پر پہنچایا اور کہنے لگے کہ اب آگے چلنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے میں نے کہا کہ خالی پالکی لے چلو کہاروں نے یہ بھی قبول نہ کیا میں نے کہا کہ پالکی لے جاؤ بہنگیوں کے لئے صرف چھ آدمی رہیں اس میں بھی گڑبڑ کرنے لگے تو میں نے کہدیا کہ تمہیں اختیار ہے. چنانچہ کہار چلے گئے.

رسد خانے سے میں نے اپنی ضروریات خریدلی تھیں. بہاری لال ماتھر کائستھ باشندہ دہلی وہاں کا تھانیدار تھا اور پہاڑ پر اس کا قیام تھا وہ کہنے لگا کہ یہاں تکلیف ہوگی اوپر چلنے کا ارادہ کیجئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۶ سے آگے) مولوی محمد حسن رضا خاں، مولوی ضامن شاہ خاں، مولوی کلن خاں، شیخ محمد شاہ جی نیاز احمد، مولوی کریم بخش، شیخ غلام غوث، حاجی محمد حسن، حافظ حبیب اللہ محمد عبدالعزیز خاں اور محمد واصل وغیرہ قابل ذکر ہیں آخری دور میں شاہ نبی رضا خاں اور شاہ جی عنایت حسین صاحب سلسلہ بزرگ ہوئے ہیں. شاہ جی عنایت حسین کے خلیفہ وسجادہ نشین حضرت شاہ صوفی محمد حسن (ف ۸ نومبر ۱۹۵۹ء) فریدپوری تھے، جن کا سلسلہ ہندو پاکستان میں بڑی ترقی پر ہے.

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مرتب کا مقالہ "ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا"

(۱) روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات ——— "العلم" کراچی جلد ۳ شمارہ ۲ ص ۱۰۳

(۲) اعجاز جہانگیری مولفہ حاجی محمد عنایت حسین (محمود المطابع بریلی) ص ۱۰

اور سواری و بار برداری کا انتظام میں کر دوں گا۔ میں نے اس کی رائے پر عمل کیا۔ بھیم تال میں شاہ دین محمد درویش کے نواسے سے ملاقات ہوئی جس سے بہت خوشی ہوئی کیونکہ اس سے سابقہ شناسائی تھی۔ وہاں آرام سے رات گزاری۔

الموڑہ تک کے لئے بار برداری کے مزدور کرایہ پر مل گئے، سواری نہ مل سکی۔ نول سنگھ مہرا قوم برہمن اپنی سواری کا گھوڑا الموڑہ تک مستعار دے رہا تھا، یہ شخص پہاڑی علاقے کے بہترین سرداروں میں سے ہے اور اس نے یہ گھوڑا گارنر صاحب سے چار سو روپیے میں خریدا تھا لیکن مآل اندیشی کی وجہ سے میں نے یہ بات منظور نہ کی کیونکہ معمولی شناسائی کی بناء پر دوسرے کا قیمتی جانور (گھوڑا) دو تین منزل تک لیجانا خود کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ ساتھیوں کی رائے ہوئی کہ واپس جاکر گھوڑا لے آئیں یہ رائے بھی کچھ مناسب نہ تھی کیونکہ اگر کسی ایک سے میں کہتا کہ جاکر گھوڑا لے آئے تو دوسرا کہتا کہ مجھے جانا زیادہ ضروری ہے اور چند روز تک اتنے آدمیوں کے لئے سرکاری رسد خانے سے غلہ بھی میسر نہ ہوتا، میں نے دل میں یہ طے کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے پیدل چلوں اور اطمینان یہ تھا کہ راستہ اینٹ، پتھر، غار، گڑھے اور خس وخاشاک سے پاک ہے۔ پیروں کو تکلیف کا اندیشہ نہیں۔ ساتھ والے سب شریف زادے اور قوم کے رئیس ہیں، پیدل چل رہے ہیں، میں نے سوچا کہ میں عام رعایا کا ایک انجان شخص ہوں اور اس سرزمین کے مالداروں (روساءِ رامپور) کی مہربانی سے دولپشت سے آرام سے روٹی کھا رہا ہوں اس لئے نخرے دکھانا مناسب نہیں اور شہر کے رئیس شکار میں خود کوسوں پیدل چلتے ہیں۔ میں کمر مضبوط باندھ کر چل دیا۔ چار گھڑی دن رہا ہوگا کہ رام کاوہ پہنچے، وہاں کے داروغہ رسد نے بتایا کہ اتنے آدمیوں کے لئے غلہ فراہم نہ ہو سکے گا نیز کوس بھر کے فاصلے کے بعد آگ نہیں جلا سکتے۔ مجبوراً آگے بڑھے اور پہاڑ کے اوپر ایک موضع "پاتر گاؤں" میں جاکر قیام کیا۔

قیام پاتر گاؤں:- پاتر گاؤں کے رہنے والے ڈومرہ قوم کے لوگ ہیں جن کے کھانے پینے سے چمار بھی پرہیز کرتے ہیں اس گاؤں میں "سگیا" نامی اس قوم کا سردار تھا جو کتھے کی تجارت کے سلسلہ میں ہمیشہ شہر (رامپور) میں آتا تھا اور ہماری سرکار میں بھی اُس کی آمد و رفت تھی مجھکو دیکھ کر دوڑا اور میرے پیروں پر آپڑا۔ گاؤں والے یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ کون شخص ہے کہ جس کے سامنے ہمارا سردار جھکا، سر رکھا اور ادب سے کھڑا ہو گیا، گویا سمجھ رہے تھے کہ دنیا میں اس (سگیا) سے بڑا کوئی شخص نہیں

ہے۔ کیونکہ گاؤں سے کبھی باہر نہ نکلے تھے اور نہ کسی دوسرے کو دیکھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی حال پابندانِ حس کا ہوتا ہے جو عقل کو حواس باختہ کر دیتا ہے۔ جب وہ ایسے عجوبہ کو دیکھتے ہیں جس سے بڑھ کر انھیں نظر نہ آئے تو اس کو اپنا سردار سمجھ لیتے ہیں اور اس کی پرستش کرنے لگتے ہیں یہ چاہے پہاڑ ہو یا دریا، آگ ہو یا ہوا کا جھونکا، ہاتھی ہو یا سور، کتا ہو یا گینڈا، زبردست بادشاہ ہو یا جادوگر، فال نکالنے والا ہو یا فقیر، کوئی شخص صالح الاعمال و صادق الاقوال ہو کہ بہت سے مشکل کام اس کے ہاتھ سے پورے ہو جائیں۔

اس زمرے میں جو لوگ اپنے آپ کو عقل کا تابع سمجھتے ہیں وہ سورج کے قائل ہو جاتے ہیں، جو لوگ اس سے ذرا آگے بڑھتے ہیں وہ رات دن کے چکر کو کہ حس اس سے آگے نہیں بڑھتی، سب کا کارفرما سمجھتے ہیں اور اس سے بالاتر کا انکار کرتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے نہ جاننے سے چیز ناپید نہیں ہو سکتی اور یہ بھی نہیں سمجھتے کہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں وہ اور اس کی ہستی ایک نہیں ہے لامحالہ اس چیز کو دیکھتے ہوئے ہست اور نیست ایک ہو جائے گا۔ اگر دوسروں کو وہ وجود میں لاسکے لیکن وہ چیز خود کیونکر وجود میں آئی اور کیوں نیست نہ ہو لہذا کوئی چیز ایسی ہونی چاہیئے جس کی ہستی کے سوا ہم کچھ نہ سمجھ سکیں ہستی خود طرح طرح کی حرکت کرتی ہے۔ ان میں سے جو حرکت محسوس ہو جائے وہ صورت اختیار کر لیتی ہے اور کوئی صورت ایسی نہیں جس کے مقابل دوسری صورت نہ ہو لامحالہ جس ہستی کو بھی ہم دیکھیں یا سمجھیں کہ اس کے مقابلے کی دوسری ہستی کے بھی محتاج ہوں گے، اگرچہ اس کو کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ بسا اوقات انسان یقین کر لیتا ہے کہ یہ چیز بے سبب نہیں ہے گو یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ سبب کیا ہے البتہ جو شے اس کا سبب بننے کے مناسب نہ ہو اس سے انکار کرتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص گھڑی دیکھے تو یقین کرے گا کہ اس کی سوئیوں کے چلنے کا کوئی سبب ہے گو یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا سبب ہے لیکن اس کا یقین ہرگز نہیں کرے گا کہ روم یا اس کے بادشاہ کی ہستی یا ساتوں ولایت کا بادشاہ یا سورج یا زمین کی گردش اس کو ہلا رہی ہے ؎

دیدی کہ فلک گوی و زماں چوگان است
وز گردش گوی ایں ہمہ سامان است

ایں چوگاں را بدست اگر نیست نیازا
گیہاں بدتر ز بازی طفلان است

پاتر گاؤں میں بقیہ دن اور تمام رات گزاری۔ گاؤں سے کھانے کا سامان آگیا۔ مگر قیمت انھوں

نے نلی۔ گاؤں والے مرد و عورت سب خوبصورت خصوصاً عورتیں پری پیکر ہیں اس گاؤں کی رہنے والی رنڈیاں ہندو مذہب کی اور گوئیے ڈومرہ قوم کے ہیں یہ گوبے ہڑکہ کہلاتے ہیں اس قوم کا حسن ہر پیر د جوان کے لئے بلائے جان اور ہر گبر و مسلمان کے مذہب کا لٹیرا ہے، اس وقت اس قوم (گوبوں) میں کلو نامی شخص سر برآوردہ تھا سب حسین اس کے تابع تھے اور وہ سگیا کی رعیت تھا۔

صبح کو سگیا تھوڑی دور خود میرے ساتھ آیا۔ پھر بڑی سڑک تک اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ کیا، تاکہ میری واقفیت ہو جائے جب میں راستے پر پڑ گیا تو میں نے سگیا کے بھائی کو رخصت کر دیا۔ دوپہر کو بیورہ نامی مقام پر ٹھیر گئے۔ یہاں سے لال منڈی الموڑہ میں دھوبیوں نے جو کپڑے دھوپ میں الگنی پر ڈال رکھے تھے دکھائی دیتے تھے، حسین شاہ فقیر اور کرنیل صاحب کے مکانات بھی نظر آتے تھے، جو آبادی کے کنارے پر ہیں، اگلے دن الموڑہ پہنچ گئے جو بیورہ سے آٹھ کوس تھا۔

کوائف الموڑہ:۔ تھوڑی دیر میں ہم الموڑہ کی کوتوالی میں پہنچ گئے۔ یہاں کے کوتوال کا نام تحسین تھا۔ اور اس شخص کو نواب فیض اللہ خاں کے بیٹے یعقوب علی خاں نے اسی کوہستان سے خردسالی میں خرید کر تعلیم و تربیت دلائی تھی اور خزانے کا مہتمم بنایا تھا احتیاط یہ رکھی کہ ہر کس وناکس کے پاس نہ بیٹھے۔ تاکہ بری عادت اس میں پیدا نہ ہو۔ مگر ایسا ہی ہوا ایک رات موقع پا کر روپئے کی جس قدر تھیلیاں خود اٹھا سکا لے گیا اور الموڑہ پہنچ گیا اس وقت کوہستان میں نیپالیوں کی حکومت تھی مالک کٹھیر کے لوگوں سے کوئی راہ و رسم نہ تھی جن لوگوں نے اس کے پاس بہت سی رقم دیکھی زبردستی چھین لی کچھ اس نے چھپا بھی لی۔ گارنر صاحب بہادر کے زمانہ میں اس نے اپنے آپ کو نواب (رامپور) کے خاندان کا ظاہر کر کے کوتوالی کا عہدہ حاصل کر لیا پہاڑی علاقے میں لوگ ابھی تک اس کو نواب تحسین علی خاں کہتے کہتے تحسین علیخاں کوتوال نے جیسے ہی مجھے دیکھا فوراً پہچان لیا اور ٹھہرنے کی جگہ بتائی، ہم وہیں جا ٹھیرے معلوم ہوا کہ وہاں کے مہتمم جارج ولیم صاحب سیر و تفریح کو گئے ہوئے ہیں دو تین روز میں واپس آئیں گے۔

اس علاقے میں پہلے نیپالی حکام نے بھی ایک شاہراہ بنائی تھی جو اس راستے سے کم ہے۔ لیکن بہت ہی کٹھن ہے ایک تو یہ کہ صاف نہیں ہے دوسرے چوڑائی کم، تیسرے یہ کہ کوئی قدم اونچا، کوئی نیچا، کوئی لمبا کوئی چھوٹا رکھنا پڑتا ہے۔ انگریزی حکومت نے جو شاہراہ نکالی ہے وہ صاف ہے اور اتنی چوڑی ہے کہ ایک پالکی اور دو گھوڑے برابر چل سکیں راستہ نشیب و فراز میں ماہی پشت ہے شاید

پچاس گز کا فاصلہ ہے، گز بھر کا فرق ہو مگر سانپ سی لہریں بہت ہیں جن کا پہاڑ میں ہونا ضروری ہے،
چار جگہ فراہمی غلہ کی وجہ سے ایک ایک داروغہ اور کئی کئی سپاہی موجود رہتے ہیں وہ چار مقامات (۱)
بھینسوڑی (۲) بھیم تال، (۳) رام کادہ (۴) بیورہ تھے۔

جس زمانے میں نیا نیا انگریزی عمل دخل تھا تو یقیناً اس انتظام پر جو خرچ ہوتا تھا وہ فضول نہ تھا، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اس کی کیا ضرورت ہے کیونکہ دکاندار بآرام رہ سکتا ہے اور گاؤں کے لوگ نگہبان مقرر کئے جا سکتے ہیں رات دن سڑک چلتی ہے، غبن، چوہوں، گھن اور پانی وغیرہ سے سرکاری غلے میں بیحد نقصان ہوتا ہے انگریزی شاہراہ میں ندی نالے کثرت سے تھے اور ان کو عبور کرنے کی کوئی چیز نہ تھی اگرچہ ندی نالوں کا چوڑان بہت کم ہے مگر پانی کا زور اتنا زیادہ ہے کہ ہر جگہ سے گزر بھی نہیں سکتے۔ گھاٹ پر پتھر برابر کر کے ڈال دیتے ہیں برسات میں وہ گڑبڑ ہو جاتے ہیں، غالباً اب وہاں پر لوہے کا پل بنا رہے ہیں جو کم خرچ بالانشین ہے کیونکہ ہر سال جو خرچ ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اگر ایک مرتبہ زیادہ خرچ ہو جائے تو اوسطاً کم ہی خرچ ہوگا۔

بھیم تال کے پانی کی گہرائی بہت ہے چونکہ ہندوؤں کی عادت ہے کہ ہر عجوبے کو متقدمین میں سے کسی کی طرف منسوب کرتے ہیں، لہذا کہتے ہیں کہ یہاں پر جدھسٹر کے بھائی بھیم نے نیزہ گاڑا جو زمین کے اس پار نکل گیا لہذا اس پانی کی گہرائی کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ پانی کے نیچے زمین ہونی چاہیئے کیونکہ اینٹ پتھر جو کچھ بھی پانی میں ڈالتے ہیں نیچے چلا جاتا ہے، زمین پانی کے اوپر کیسے رہے گی اور اس راستے میں بہت سے مقامات پر پہاڑ سے پانی ٹپکتا ہے، کہیں قطرہ قطرہ اور کہیں زیادہ، وہاں لوگوں نے چھوٹے چھوٹے حوض بنا رکھے ہیں۔

بھینسوڑی اور بھیم تال کے راستے میں ایک چھوٹا سا قلعہ "بردکھیڑی" ہے۔ پہلے جب راستہ دشوار گزار تھا تو وہ دروں میں شمار ہوتا ہوگا ورنہ بظاہر یہی ہے کہ پتھر پر پتھر رکھ کر قد آدم بلند کر دیا ہے، اس ملک کی آب و ہوا ہندوستان کے تمام علاقوں سے اچھی ہے حالانکہ پہاڑ کی ترائی میں آب و ہوا سب جگہ سے بدتر ہے۔ نیشکر کی اتنی کثرت میں نے دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی۔ رعایا مالگذاری کی رقم ادا کرنے میں اتنی پختہ ہے کہ عورتوں اور بچوں کو بیچ ڈالتی ہے اور اس پر فخر کرتی ہے اس علاقے میں ہندوؤں کی اعلیٰ اقوام میں برہمن ہیں اور یہی آسودہ ہیں ان کے بعد راجپوت ہیں یہ

لوگ مختلف الحال ہیں ہر قسم کی مزدوری کر لیتے ہیں لالچی نہیں ہیں صبح سویرے مسلمان کا منہ دیکھنا نحوست سمجھتے ہیں رقم لیکر شادی کے نام سے لڑکی دے دینا عیب نہیں سمجھتے ہیں وہاں پر شیر کوٹ علاقہ مرادآباد کے چوڑی فروش ایک عرصے سے آکر آباد ہو گئے ہیں۔

الموڑہ پہاڑ کے سب لوگ اپنے قدیم راجاؤں کی بڑی تعظیم کرتے ہیں۔ آج کل راجا لال سنگھ کاشی پور میں ہے، جان و مال، عزت و آبرو میں اس سے دریغ نہیں کرتے جب پہاڑ کے نیچے جاتے تو راجا کے لئے کچھ، یہ لیجاتے ہیں اور اس کے سامنے زمین پر سر رکھ دیتے ہیں۔ مگر جب برہمن قوم اس سے برگشتہ ہو گئی تو نیپال کی فوج لے آئی اور جب نیپالیوں سے ناراض ہوئی تو انگریزی حکومت کی خواہاں ہو گئی، یہاں کے ہندو بھینس کا گوشت کھاتے ہیں۔

یہاں راجا کے کارکن کو کمین، آٹے کو پسیان، ٹھیرنے کے مقام کو باسا، میل کو لاٹھی، اور فرسنگ کو بھونا کہتے ہیں، تقریباً ایک میل کے بعد جو کچھ وزن کندھے پر ہو، لاٹھی کے سہارے رکھ کر اور کمر پہاڑ سے لگا کر دم لیتے ہیں اور فرسنگ یعنی تین میل چلکر وزن رکھ دیتے ہیں اور کمبل بچھا کر بیٹھتے ہیں، کھیل اور چنے وغیرہ کھاتے ہیں پانی پیتے ہیں، بھنگ کے بھنے ہوئے بیج برتن میں رکھتے ہیں، بہت ہی نادار لوگ بھوک میں یہ بیج کھاتے ہیں اور چوکے میں روٹی کھانا ضروری نہیں سمجھتے، جب روٹی پر گھی لگا لیتے ہیں تو جہاں چاہیں کھا سکتے ہیں اور لیجا سکتے ہیں انگریزی سرکار کی طرف سے عورتوں اور بچوں کے بیچنے کی سخت ممانعت ہے اور بھیم تال سے پلٹن کی روانگی کے وقت خوب دیکھ بھال کر لی جاتی ہے اگر کوئی بچہ ملتا ہے تو اس کے والدین کے پاس واپس پہنچا دیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود جہاں تک ہو سکتا ہے پہاڑی ہر حیلے سے لڑکا لڑکی دے دیتے ہیں۔ اور رقم لے لیتے ہیں۔

ایک درویش سے ملاقات: میں نے سنا کہ الموڑہ میں ایک عالم باعمل اور بے ریا درویش ہے۔ وہ "شاہ" کے نام سے معروف ہے حالانکہ اس کے لقب سے ہی ریا ظاہر ہو رہی تھی۔ مگر میں نے خیال کیا کہ شاید دوسروں نے اس نام سے مشہور کر دیا ہو، میں نے الموڑہ پہنچتے ہی ساتھیوں کو کھانے

---

[1] آج کل قصبہ شیر کوٹ ضلع بجنور سے متعلق ہے

کے انتظام میں چھوڑا اور ایک صاحب کو ساتھ لے کر درویش کو دیکھنے چلا گیا، جب حجرے کے قریب پہونچا تو اُس کے ایک خادم نے کہا کہ حضرت آرام فرمارہے ہیں۔ پھر کسی وقت آئیے میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی کے پاس ایک کمبل اور کھاروے کی ایک لنگی ہے، میں فوراً بلند آواز سے کہنے لگا کہ اب میں کیا کروں، ایک شخص نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کمبل اور لنگی پہونچتے ہی شاہ صاحب کو دے دینا، اب چونکہ ملاقات نہیں ہوئی کل یہ مالک کو واپس کر دوں گا۔ یہ سنتے ہی خادم دوڑا ہوا آیا کہ شاہ صاحب یاد فرماتے ہیں، میں گیا وہ کمبل اور لنگی دے دی، وہ درویش کہنے لگا کہ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ تو آرہا ہے، پھر میرا نام پوچھا، میں نے بتایا، کہنے لگا میں تیری ہی وجہ سے لوگوں کو رخصت کر کے تنہا بیٹھا تھا۔ چونکہ میں نے اُس شخص کو مردِ نادان اور خود نما پایا اس لئے واپس چلا آیا، دوسرے دن اُس نے خواہ مخواہ مجھے بُلایا اور بیہودہ لغویات بکتا رہا بہزار دشواری اُس سے چھٹکارا پایا۔ جب اُس نے بُلایا تو میں نے دیکھا کہ آفتاب کی طرف ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ اُس سے لگائے ہوئے ہاتھ سے تسبیح پھرا رہا ہے۔ جب اُس سے فارغ ہوا تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا تھا، کہنے لگا کہ یہ آفتاب کا شغل ہے، فقرا اس کو کرتے ہیں، میں نے کہا کہ اس کا نتیجہ سوائے آنکھ جلتے رہنے اور روسیاہی کے اور بھی کچھ ہے کہنے لگا۔ آفتاب کو قبلۂ دعا بنا کر مطلب خدا سے مانگتے ہیں اس کا اثر تسخیر خلق ہے، کیا تو نے نہیں سُنا کہ اکبر بادشاہ نے برسوں یہ کام کیا ہے، جیسا کہ شاعروں نے کہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مطلب اس مشہور قطعہ سے تھا ؂

قسمت نگر کہ در خور ہر جوہرے عطاست آئینہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او می کند مشاہدۂ خود در آئینہ وین می کند معائنۂ حق در آفتاب

پھر اس درویش نے کہا کہ تجھ کو نہ علم ہے نہ خدا پرستوں کو دیکھا ہے، کعبہ اینٹ پتھر کا بنا ہوا ہے کیا وہ قبلۂ نماز نہیں ہے؟ اور دُعا مانگتے وقت ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتے ہیں کیا وہ قبلۂ دُعا نہیں ہے؟ پس آفتاب کو قبلۂ دُعا بنانے میں کیا قباحت ہے میں نے کہا کہ یہ بات کہ مجھے علم نہیں ہے صحیح ہے عقل صرف تصور صفات کمال کے سوا کسی کو قبلہ تسلیم نہیں کرتی اور شرعی قیود کے ساتھ حکم شرع پر اکتفا کرتی ہے اور آفتاب کو قبلۂ دعا بنانا اسلامی شریعت میں نہیں ہے

کعبہ ایک مکان ہے جس میں نہ کسی انسان کامل کی تصویر ہے نہ کسی حیوانِ عجیب کی نہ کسی چمکتے ہوئے ستارے کی۔ البتہ سالکانِ طریقت میں بہت سے رہزن ایسے شامل ہو گئے ہیں جو قبلہ کو معبود سمجھ کر سخت غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ متعدد قبلوں کی تعریف کرتے ہیں اور ان سے حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ ہماری نماز، حج، دُعائیں، اوّل سے آخر تک خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء اور طلب حاجات کے سوا کچھ نہیں ہیں ستارہ، آسمان، خانہ کعبہ، پیغمبر اور فرشتوں میں سے کسی کی بھی مدح و تعریف نہیں کی جاتی ہے اور نہ ان سے کسی کام کی خواہش کی جاتی ہے اور آسمان کا ستاروں کے بغیر زمین میں کوئی نمایاں اثر نہیں ہے دُعا کے وقت ان کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں جاتا ہے یہی سبب ہے کہ مسجد کی دیوار، زمین، نیز جائے نماز میں نقش و نگار کا ہونا پسند نہیں کرتے تاکہ خیالات یکسو رہیں۔ ہمارے مذہب میں کام دل سے پڑتا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قربانی سے دل کو مطمئن کرنے کی عادت ڈالتے ہیں۔ کھڑے ہونا، بیٹھنا، جھکنا، اٹھنا، گر پڑنا، بھوکا رہنا، خیرات کرنا، سفر میں جانا، دوڑنا، رفتار میں خود کو طاقتور اور بے پروا ظاہر کرنا، پتھر مارنا، ذبح کرنا، یہ سب خدا کے لئے کرنا چاہیئے نہ کہ اپنے لئے اگرچہ اس درویش نے میری گفتگو میں چوں و چرا کی مگر دوسرے ہندو مسلمان جو اس کے گرد بیٹھے تھے ہر ایک نے کان لگا کر سنا اور پسند کیا میں باواز بلند "خیرباد" کہہ کر چلا آیا پھر نہ گیا۔

حاکم الموڑہ کے پاس خط بھیجنا:۔ ان ہی ایام میں وہاں کا حاکم بھی واپس آگیا، میں نے جواہر لال کے چچا سے جس کا نام اسوقت یاد نہیں ملاقات کی جواہر لال کا ذکر اجمیر کی سرگزشت میں لکھوں گا اس کے سوا کسی اور سے ملاقات نہ کی تمام اہلکاران، دہلی کے باشندے ہیں اور جے سکھ کے ساختہ پرداختہ ہیں جس کا حال گارنر بہادر کے ہمراہیوں میں لکھ چکا ہوں اہلکاروں کو یہ خیال تھا کہ خود اُن سے ملنے جاؤں گا۔ مگر میں کارگزاروں سے التجا کرنا سخت ناپسند کرتا ہوں اور اب تک میں اس بیجا ذلت سے محفوظ رہا ہوں۔

آقا نواب عنایت خاں کا ایک خط اپنے ساتھی کے ہاتھ حاکم الموڑہ کے پاس بھیجدیا۔ دوسرے دن اسی شخص کے ذریعے سے شافی جواب مل گیا۔ صاحب ممدوح سے ملاقات کی نوبت بھی نہ آئی، کیونکہ وہ عدیم الفرصت تھا اور میں غیوری اور خودداری کی وجہ سے ملنے نہ گیا خط کی عبارت غالباً یہ تھی:

صاحب مشفق ومہربان کرم فرمائے
مخلصان سلمہ اللہ تعالیٰ. ازآنجا کہ اولاد واحفاد
نواب فیض اللہ خاں مرحوم را بہ ارکان دولت
خداداد سرکار نصفت مدار کمپنی انگریز بہادر
از عرصۂ پنجاہ سال تا زمان حال ربط
خاص وکمال اختصاص حاصل، لاجرم
فیما بین اعیان آں سلطنت و ہر یکے
ازیں دودمان سزاوار رافت، تعارف
بعنوان کلی، گو معرفت شخصی نبود ثابت،
ازیں رو اعانت وامداد آں گروہ باشکوہ
واستعانت واستمداد ایں فرقہ اخلاص
پژدہ پابند سبقت مراسم ظاہر وملاقات
صورت نہ باشد، بنا بر آں دریں آواں
کہ بعضے متوسلان ایں خاندان را ارادۂ
فیل گیری وتجارت کتہ بمقتضائے وقت
بخاطر افتادہ تحقیق تمغائے سرکاری
بریں چیزہا لازم وچوں باشندگان دامن کوہ
بہایم سیرت اند گفتار پریشان آناں مانند
صدائے کوہ بپاسخ پرسش دلنشیں نمی گردد
وازینکہ جلب منفعت ودفع مضرت در آب و
گل انساں سرشتہ اند مستاجراں اظہار اختیار
خود در کم وبیش رقم معمول کردہ زیادہ طلبی
از تاجراں کنند وتاجراں جاری نشدن اشتہار

صاحب مشفق ومہربان کرم فرمائے مخلصاں سلمہ اللہ
تعالیٰ۔ چونکہ نواب فیض اللہ خاں مرحوم کی
اولاد واحفاد کو ارکانِ دولت خداداد سرکار
نصفت مدار کمپنی انگریز بہادر سے عرصہ
پچاس سال سے اس وقت تک خاص ربط
اور کمال خصوصیت حاصل ہے۔ لازمی طور
پر اس سلطنت کے امراء اور اس
خاندان کے ہر اس فرد سے جو لطف و
مہربانی کا سزاوار ہے پوری طور سے تعارف
حاصل ہے اگرچہ شخصی طور پر جان پہچان نہیں
ہے، اسی لئے اس پرشکوہ جماعت کی اعانت وامداد
اور اس پرخلوص گروہ کی استعانت واستمداد کے
لئے ظاہری مراسم اور ملاقات کی ضرورت نہیں ہے
چونکہ اس زمانے میں اقتضائے وقت کے پیش نظر
اس خاندان کے بعض متوسلین کے دل میں ہاتھیوں
اور کتھے کی تجارت کا ارادہ پیدا ہوا ہے اس لئے
ان چیزوں کے سرکاری محصول کی تحقیقات
ضروری ہے چونکہ دامن کوہ کے رہنے والے غیر تربیت
یافتہ ہیں۔ اس لئے ان کی پہاڑ کی آواز کی طرح
پریشان گفتگو سوال کے جواب میں دلنشیں نہیں ہوتی
چونکہ نفع اندوزی اور دفع مضرت کی صفت انسان
کے خمیر میں جاگزیں ہے اس لئے مستاجر کسی قدر اپنے
اختیار کا اظہار کرتے ہوئے مقررہ رقم سے زیادہ تاجروں

قرینۂ معافی ساختہ ادائے پشیز سے ہم بر خود جبر دانند، گاہے متاجر زر بے اندازہ پسر گی می گیرد گاہے تاجر بجز چیزے دست بر داشتہ ہیچ نہ دہد، لہذا چند استفسار بر فرد علاحدہ نوشتہ بہ اُمید جواب دستخطی ہر یکے محاذی آں ملفوف رقیمہ نیاز کردہ دینر مکلف اوقات شریف است کہ حکم عام بہ تاکید تمام امتثال احکام مثبتۂ فرد بکار گزاراں سرکار از متاجر و پولدار و گزریاں و زمیندار و حاکم تحصیل صدور یابد تا احدے ازاں سر نتابد و التماس از الطاف سامی آنست کہ گاہ گاہ کدام کار ایں دیار قابلِ ابرام مخلص رو دہد بلا تکلف ایماء فرمانید۔

سے طلب کرتے ہیں اور تاجر اشتہار جاری نہ ہونے کو معافی کا قرینہ سمجھتے ہوئے ایک پیسے کی ادائیگی کو بھی اپنے لئے جبر سمجھتے ہیں، کبھی مستاجر اندازے سے زیادہ رقم سپاہیانہ میں لے لیتا ہے اور کبھی تاجر ایک چیز کے علاوہ کچھ اور نہیں دیتا ہے لہذا چند استفسار علحدہ کاغذ پر اس اُمید میں لکھے ہیں کہ آپ ان کے محاذی اپنے دستخطی جوابات تحریر فرمائیں گے اور آپ کے اوقات شریف میں مخل ہو کر تکلیف دینی چاہتا ہوں کہ ایک عام حکم کامل تاکید کے ساتھ ان احکام کی تعمیل کے لئے جو فرد پر لکھے گئے ہیں عمال سرکار، مستاجر، پولدار، گزریاں، زمیندار اور حاکم تحصیل کو صادر فرما دیا جائے تاکہ کوئی شخص تعمیل سے سرتابی نہ کرے اور جناب کے الطاف کے مدنظر اُمید ہے کہ جب کبھی کوئی کام اس شہر سے متعلق اس مخلص کے لائق متصور ہو تو بلا تکلف ایما فرمایا جائے

غرض کہ دامنِ کوہ میں گارنر بہادر کی نیک نامی و شہرت خوب پھیلی ہوئی ہے[1]

چہ کالائے نیکوست خوئے نکو ۔۔۔ بہ ہر جا ہمہ کس خریدار او[2]
چہ شہر و چہ لشکر گہہ و دستا ۔۔۔ چہ در آشتیہا چہ در جنگہا
چہ بازارگان و چہ شہ چہ گدا ۔۔۔ چہ رند جہاں سوز و چہ پارسا

---

[1] گارنر بہادر دہلی میں تعیناتی سے قبل الموڑہ کے پہاڑی علاقے میں حاکم رہ چکا تھا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

[2] "او" نظم میں غیر ذوی العقول کے لئے بھی آتا ہے۔ مولانا جامی نے نثر میں بھی استعمال کیا ہے۔

علاقہ الموڑہ کا کچھ حصہ انگریزی حکومت میں اور باقی چینیوں کے قبضے میں ہے۔ اس علاقے سے چھوٹے چھوٹے گھوڑے جنہیں ٹانگن کہتے ہیں لاتے ہیں، مشک، چدوار اور گائے کے دُم کے بال بھی لاتے ہیں جن سے چونری اور گھوڑوں کی زیبائش کے لئے چنور بناتے ہیں، برف کا پہاڑ صاف نظر آتا ہے جس کا شیریں پانی ہر جگہ رواں ہے ہندو کہتے ہیں کہ اس پر راجا اندر کا شہر ہے، بارش برسانا اندر ہی کا کام سمجھتے ہیں، لیکن بھگوت گیتا میں کرشن کی زبانی اِندر کے اختیار سے انکار اور اس کو روک دینا مذکور ہے۔ اور اس نے اِندر کی پوجا کی ممانعت کی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اِس واسطے کی تعبیر ہو جو پہلی علت اور آخری معلول کے درمیان ہے جس کو ہندو اِندر اہل کتاب فرشتہ اور اشراقی رب النوع کہتا ہے۔

حاکم الموڑہ کا طریقہ عدالت:۔ حاکم الموڑہ جارج ولیم باوجودیکہ قانون دان نہ تھا مگر کام ڈھنگ سے کرتا تھا، ایک عجیب واقعہ قابل ذکر ہے جس کو صاحب عدالت (جارج ولیم) نے عدالت دورہ کے سپرد کر دیا اور چار روز تک محرر لوگ اس کا مسودہ ہی کرتے رہے مگر درست نہ ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک شخص جا رہا تھا دو آدمیوں نے کہا کہ یہ شخص محصول کا مال لئے جا رہا ہے اس کو پکڑنا چاہیئے وہ ڈر کر بھاگا پیر پھسلا پہاڑ کے نیچے جا پڑا اور مر گیا۔ اس کے بدن پر نہ کسی انسان کے ہاتھ کا، اور نہ کسی درندے کے پنجے یا دانت کا زخم تھا تاہم خون کا مقدمہ عدالت دورہ کے سپرد ہے دیکھئے کیا حکم ہو۔

الموڑہ واپس ہو کر دوپہر تک ہم بیورہ آگئے، یہاں رات گزاری اگلے دن رام کا دہ پہونچے، پہلا جھگڑا یاد تھا، اس لئے ٹھہرنے کا خیال نہ کیا، ناشتہ کیا قہوہ پیا اور آگے کو چل دیئے، مغرب تک ہم بھیم تال پہنچ گئے اور پہاڑی پر تھانے میں قیام کیا۔ صبح کو میں اس گھوڑے پر سوار ہو گیا جو سرکار (نواب عنایت اللہ خاں) نے بھیجا تھا۔ یہ گھوڑا ابھی تک شائستہ نہیں ہوا تھا مگر دن بھر کی مشقت برداشت کر کے اور نشیب و فراز دیکھکر درست ہو گیا حقیقت ہے کہ دُنیا کی پستی و بلندی دیکھ کر انسان ہو یا حیوان سب سیدھے راستے کے خواہاں ہو جاتے ہیں اور خراب راستے سے بچکر کنارے پر چلتے ہیں۔

چو بے رنج تن کام یابد کسے   رو و راہ کو رانہ دیدم بسے

اگر بشنوی پند و اندازِ کس — بگوشش بود چوں تنین مگس
ولیکن چو مالش دہد روزگار — نیاید ورا دیگر آموزگار

دوپہر بعد ہم بھنیسوڑی پہنچ گئے۔

پہاڑی کی بلندی معلوم کرنے کا طریقہ:- اب میں پہاڑ کی بلندی معلوم کرنے کا طریقہ لکھتا ہوں، اگر اصطرلاب موجود ہو تو آسان صورت یہ ہے کہ شظیہ ارتفاع کو ۴۵ درجے کے نشان پر رکھے اور ہموار جگہ پر کھڑا ہو کر نگاہ کے دونوں سوراخوں کو پہاڑ کی چوٹی سے ملائے۔ جب نگاہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائے تو وہ مقام مسقط حجر تک کے فاصلہ ارتفاع کے برابر ہوگا۔ اب اپنے کھڑے ہونے کی جگہ پر ایک نشان کرے اور پھر اصطرلاب کی پشت پر نگاہ کرے اگر سایہ کے برابر سات حصے کئے ہوں جنکو قدم کہتے ہیں، تو ایک قدم کے برابر اور اگر بارہ حصے کئے ہوں جنکو ظل اصابع کہتے ہیں تو ایک انگلی کے اندازے سے عضادہ کو نیچے یا اوپر کرے پھر دونوں سوراخوں سے سرِ کوہ کو دیکھے جس مقام سے نظر آجائے نشان کردے، پھر دونوں نشانوں کے درمیان پیمائش کرے۔ جس قدر بھی ہو اُس کو ظل ارتفاع اوّل میں یعنی نقشِ ظل کے ان عددوں میں جن پر پہلی مرتبہ سرِ کوہ دیکھتے ہوئے شظیہ ارتفاع پڑے ضرب دیں۔ حاصل ضرب جائے قیام اوّل اور مسقط حجر کوہ کا درمیانی فاصلہ ہے۔

اگر اصطرلاب نہ ہو تو یہ عمل برابر کی دو لکڑیوں پر بھی کرسکتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک لکڑی کھڑی کریں پھر جس مقام پر پہاڑ کی چوٹی اور لکڑی کا سُراغ نظر میں مل جائے وہاں نشان کردیں پھر دوسری لکڑی کھڑی کریں۔ اس کو بھی اسی طرح نظر میں ملا کر نشان کریں اب ان دونوں نشانوں کے فاصلے کو دونوں لکڑیوں کے فاصلے میں ضرب دیں۔ لیکن اس عمل میں اپنے قد کی مقدار بڑھانی چاہئیے تاکہ پہاڑ کی بلندی معلوم ہو جائے۔

مسقط حجر
چوب اول
منظر چوب اول
چوب دوم
منظر چوب دوم
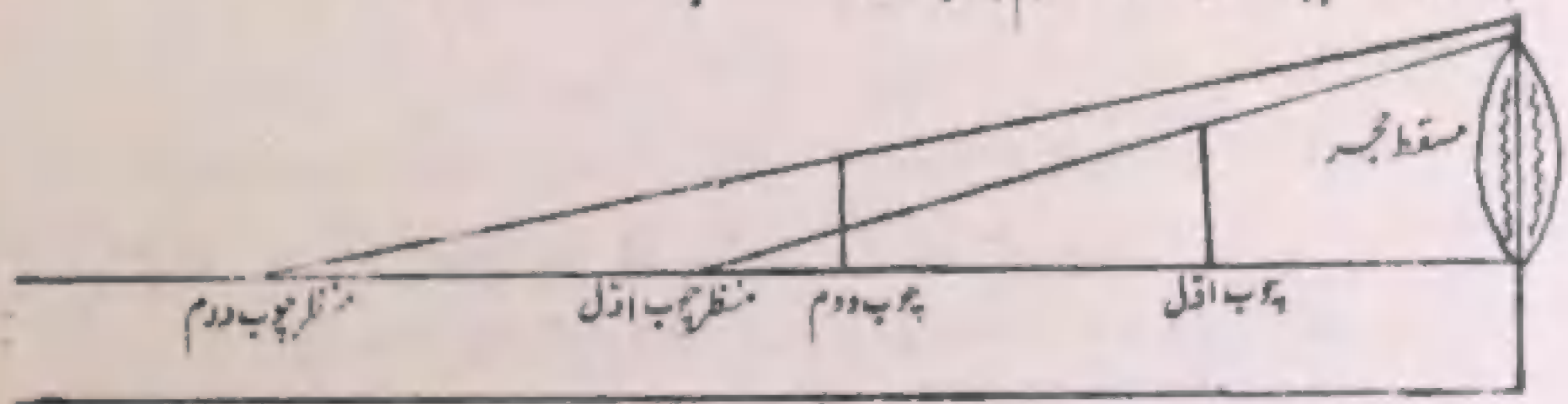
پہلی صورت میں اس کی ضرورت نہیں کیونکہ مقام اول اور پہاڑ کے نیچے بلندی کی تعداد موجود ہے اور ۴۵ درجے پر جہاں اصطرلاب میں شنظیہ رکھتے ہیں موقف اور مسقط حجر کا درمیان ارتفاع کے برابر ہوتا ہے کیونکہ تین سو ساٹھ درجوں کا آٹھواں حصہ پینتالیس درجے ہوتا ہے اور تین سو ساٹھ درجے پر دائرے کی تقسیم کرتے ہیں۔
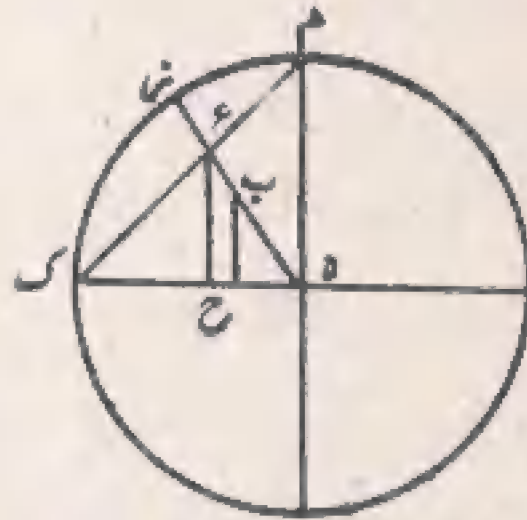
خط ہ ن کو شعاع بصر تصور کریں اور اب یا ء ن کو بلندی وغیرہ پس ہ ل برابر ہے اب کے اور ہ ح = ح ء کے کیونکہ ∠ ا ہ ب نصف قائمہ نیز ∠ ح ہ ء و ∠ ا ء ہ قائم رہے گا کیونکہ خطوط مستقیم کا مثلث دو قائموں سے زیادہ نہیں ہوتا اور چونکہ ہ و ب متساوی ہیں تو ہر ایک کا وتر بھی کہ ہ ل اور اب ہے آپس میں برابر ہیں اور چونکہ ∠ ا ہ ب نصف قائمہ ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زاویہ ک ہ م قائمہ اور ہ ک اور ہ م متساویہ برابر ہیں زاویہ م و ک کے، پس جس وقت ہ ن والا خط مرکز سے نکل کر قوس کو آدھا کرے گا تو لا محالہ ک، م کے وتر کو بھی کاٹ کر دو ٹکڑے کر دے گا۔ اور جو خط کے مرکز سے نصف وتر تک پہنچے گا وہ وتر پر عمود ہو جائے گا۔ جیسا کہ علم ہندسہ سے ثابت ہے۔ پس زاویہ م ع ہ قائم رہے گا اور م کا زاویہ بدستور نصف قائمہ ہے تو زاویہ م کا ع یقینی نصف قائمہ رہے گا اور دوسرے عمل کی دلیل بہت طویل ہے۔ اس لئے اس کو چھوڑتا ہوں تاکہ طبیعت مکدر نہ ہو اور ارتقائی ظل اول کی دونوں علامتوں میں ضرب کرنے کا قاعدہ اربعہ متناسبہ کا ہے۔

رامپور واپسی:۔ بھینسوڑی سے رودر پور اور وہاں سے بلاسپور پہنچے۔ بلاسپور سے رامپور آنے اور خط کا جواب پہونچا دیا پھر چند روز رامپور میں رہا کہ ویلڈ صاحب کے یہاں سے پھر طلبی ہوئی۔

مولوی عبد القادر کو ویلڈر صاحب کا طلب کرنا:۔ چند روز رامپور میں رہنا ہوا کہ میر جلال الدین کی تحریر پہنچی اس میں لکھا تھا کہ خداوند نعمت (ویلڈر صاحب) تجھ پر بے حد مہربان ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ اگر ہم یاد کریں تو وہ حاضر ہو جائے گا یا نہیں میں (میر جلال الدین) اور دوسرے دوست بھی چاہتے ہیں کہ یہاں آجاؤ، میں نے جواب میں لکھا کہ آقا کی نوازش بجائے خود خواہ قرب ہو یا بعد ایسی میرے دل نشین ہے کہ تمہاری تحریر سے پیشتر بھی اس میں کوئی تردد نہ تھا مگر چونکہ بندے کی دیوانہ مزاجی ابھی تک کم نہیں ہوئی ہے بلکہ اور ترقی پر ہے کیونکہ زرمست تو فاقہ کشی سے سیدھا ہو جاتا ہے مگر فاقہ مست کا علاج سوائے موت کے کون کر سکتا ہے. تم نے یہ نہیں لکھا کہ سابق کے نسبت نوازشیں ترقی پذیر ہیں یا نہیں تاکہ ان سے اپنی نالائقی کا اندازہ کر کے جواب لکھتا. میرا خیال ہے کہ نوازشیں کم ہیں اس احتیاط کی وجہ سے آقا نے خط خود نہیں لکھا کہ اگر نہ آیا تو میرا لکھنا بیکار جائے گا، اُمراء اپنے نیازمندوں کو گھر بیٹھے کی تنخواہ دیتے ہیں، اور کام کرنے کی معافی دیدیتے ہیں یہ طریقہ انگریزی سرکار میں بھی جاری ہے البتہ رقم کا ضائع ہو جانا تحریر کے ضائع ہونے سے زیادہ بُرا ہے

آقا نے دسمبر ۱۸۱۸ء میں ایک بند لفافہ بھیجا جس میں ایک پروانہ، صاحب کا انگریزی خط اور سو روپئے کی ہنڈی تھی، انگریزی خط اور پروانے کا مضمون کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے جانا ضروری ہو گیا. یہاں پر والد مرحوم کی تنخواہ کا اضافہ میرے نام رامپور سے ہو گیا تھا مگر میں اپنی زندگی اس پر بسر کرنا پسند نہیں کرتا تھا. نواب عنایت اللہ خاں بہادر اور جناب عالیہ والدہ نواب صاحب سے میں نے اجازت چاہی اُنھوں نے میری فلاح مدنظر رکھتے ہوئے اجازت دے دی بلکہ سامان سفر کی اعانت بھی فرمائی.

ویلڈر صاحب کی خدمت میں حاضری:۔ میں رامپور سے روانہ ہو کر دہلی پہنچا وہاں معلوم ہوا کہ آقا (ویلڈر صاحب) مقام دیکھل میں عدالت دورہ اور کلکٹری دونوں کام کر رہا ہے کیونکہ ولیم فریزر صاحب اس وقت کہیں تشریف لے گئے ہیں، میں وہیں پہنچا اور گاؤں میں ٹھہر گیا. جب آقا کو معلوم ہوا تو اس نے میر جلال الدین کو حکم دیا کہ میرے ٹھہرنے کا انتظام کرے اس نے علیحدہ خیمے میں لیجا کر مجھے جگہ بتائی. میں اپنا تمام سامان لے گیا. اور رات گزاری صبح کو صاحب نے

بُلایا اور تنہائی میں فرمایا کہ تو ہمیشہ مجھے چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور بے پروائی کرتا ہے کیا کروں میرا دل تیرا جیسا پتھر نہیں خواہ مخواہ تجھکو پھر کھینچ بُلاتا ہوں۔ آئندہ اتنا ضرور توقف کرنا چاہیئے کہ میں جواب دیدوں، تاکہ سب لوگ تجھے خوش خلق اور مجھے بدخو کہنے لگیں۔ میں نے کہا کہ جب تک جناب کی بے پروائی نہ دیکھوں گا نہ جاؤں گا اس کے بعد فرمایا کہ کلکٹری میں پیشکاری کی جگہ ہے جس کی تنخواہ اسی روپئے ماہوار ہے میں نے منظور کرلی اور کہا کہ میں نے نہ تیس سے انکار کیا نہ پچاس سے۔ اب دو تنخواہیں جمع ہوگئیں تو کیا عذر ہوسکتا ہے اور پہلے جب بندہ چلا گیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا مشاہرہ خاطر مبارک میں بطور مراعات بلغیر خدمت کے تھا یہ بات اس دستخطی روبکار سے واضح ہوئی جو بندے کے چلے جانے کے بعد پہنچا تھا۔ فرمایا کہ اب پچھلی باتیں چھوڑو اور یہ خیال رکھو کہ تمہارا رہنا آقا کے حق میں بہتری کا باعث ہے گو آقا اس کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ اس کے بعد میں رخصت ہوا۔ پھر ایک روبکار لکھا کہ مولوی عبدالقادر کام پر مستقل طور پر مقرر کیا جائے اور فرمایا کچہری جاکر کاغذات ملاحظہ کرو۔

کچہری میں عجیب واقعہ:۔ جب میں کچہری میں پہونچا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرا آنا ان لوگوں کو ناگوار ہوا جو خود اس عہدے کے خواہش مند تھے چونکہ میں ایک زمانے تک حسابی مد کی طرح باکار و بے کار رہ چکا تھا اس لئے یارانِ سرشتہ طے شدہ کاغذات مجھے اس طرح دکھا رہے تھے گویا کسی نومشق کو تعلیم فرمارہے ہیں۔

چند چالاک اہلکاروں نے اپنی خودغرضی کی بنا پر بطور خیرخواہی یہ آقا کے ذہن نشین کردیا تھا کہ فریزر صاحب نے جمع بندی اس قدر سنگین کی ہے جو ہرگز وصول ہونے والی نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ چونکہ فریزر صاحب دوسرے کام پر جارہا ہے اس لئے دانستہ طور سے اتنا اضافہ کیا ہے کہ وصول نہ ہوسکے اور اس سے اس کی ہوشیاری اور دوسروں کی نالائقی ظاہر ہوجائے۔

میرا یہ خیال تھا کہ فریزر صاحب کا ارادہ دہلی سے جانے کا ہرگز نہیں ہے اس لئے وہ ایسا کام کیسے کرسکتا ہے کہ جس کو پورا نہ کرسکے اس کے بعد صاحب رزیڈنٹ کی اطلاع پر ناآزمودہ کاروں نے اور جمع تجویز کرلی اور اس کا نام تجویز وصول رکھا تاکہ بندوبست کی شکست کا نام ہوجانے اور حکام تحصیل کو حکم تھا کہ وہ پندرہ روزہ کاغذات بھی بھیج دیا کریں جن میں منجملہ تجویز وصول باقی بھی رکھی ہو یہ ایک اور آفت تھی کہ رعایا کو تجویز وصول سے معافی کی اُمید ہوگئی تھی۔

میں علاقہ سنبھ اور نوح کے کاغذات دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایسے نیک آقا کو بدذاتوں نے کیا دھوکا دیا ہے کہ کاغذات میں جمع بندی کی سنگینی لکھدی گئی کیونکہ بقدر چوتھائی، پانچویں یا آٹھویں حصے کے تخم سوخت یا برباد ہوگیا تھا میں نے کہا کہ اس سال کی پیداوار کا گوشوارہ دیکھوں تو معلوم ہو کہ جمع بندی سے پیداوار زیادہ ہے اور اس بربادی سے ان مستاجروں کی منفعت میں کمی ہوگی جو خود کاشت تھے نہ یہ کہ سرکاری جمع بندی کے ادا کرنے کی گنجائش نہ رہی ہو۔ میں نے آقا کی خدمت میں عرض کیا کہ یا تو پیداوار کا کاغذ غلط ہے یا جمع بندی کی سنگینی کا۔ آقا نے بھی دونوں کاغذ دل کو دیکھا اور سمجھا مگر گندم نما جوفروش اہلکاروں نے چاروں طرف سے ایسے ایسے غیر مفہوم الفاظ بولنے شروع کئے جن سے آقا کو ان کی واقفیت اور تحصیل کے کام میں مہارت معلوم ہونے لگی۔ اور میری مثال نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مصداق ہوگئی اور آقا نے بھی فرمایا کہ تم نے جو چیز اپنی ذہانت سے بتائی اس کو یہ آزمودہ کار اہلکار تسلیم نہیں کرتے اس سلسلے میں سازش کا احتمال نہیں ہے کیونکہ اکثر باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ اور ان ہی کی رائے حق و درست معلوم ہوتی ہے۔ جی میں آیا کہ اپنی یہ طبع زاد رباعی پڑھ دوں لیکن مآل اندیشی کی وجہ سے باز رہا۔

گر خورد و بزرگ ست و گر نرم و درشت — در پنجۂ دست آز بشمر یکمشت

گر چھوٹا بڑا ہو کوئی یا نرم و درشت — ہے حرص کے پنجہ میں شمار ایک مشت
بنگر کہ بجز لقمہ برابر نشود — زیں پست و بلند ہریک از پنج انگشت

ہر چند ہیں ساتھ بلط ہر پانچوں — ہرگز نہ ہوں جز لقمہ برابر انگشت

اس کے بعد آقا نے فرمایا کہ اب جو تیرے دل میں آئے کر، وہ بھی فائدہ مند ہوگا۔

اہلکاران کچہری:۔ کچہری کے پرانے ملازموں میں ایک شخص موہن لال تھا جو فریزر صاحب کی طرح اس علاقے کے مواضع تحصیل کے متعلق زبانی معلومات رکھتا تھا۔ اور لچھمن لال بہت عمدہ سیاق نویس تھا، زور آور چند حساب کتاب کے تمام جزئیات میں اچھی مہارت رکھتا تھا۔ اور وہ صاحب کلکٹر کے زیر فرمان تھا۔ جنرل آکٹرلونی سے ایسا ہی تعلق تھا جیسا کہ دوسروں کا تھا اس کے سوا وہ کوئی تھاق

نہیں رکھتا تھا۔ آکٹرلونی دہلی کی کرور گیری کا کام خود انجام دے رہا تھا۔ القصہ فریزر صاحب واپس آگیا اور ویلدر صاحب سے دورے کی عدالت کا کام متعلق رہ گیا۔ مولوی حمد اللہ عرف رسول بخش ساکن تھانہ بھون، محکمے کے سررشتہ داروں میں تھے۔ لیکن وہ نقل مطابق اصل کے علاوہ سررشتہ کی نوشت وخواند میں کچھ دستگاہ نہیں رکھتے تھے اور مولوی حمد اللہ اس عرصے میں مستعفی ہو گئے[1] آقا نے بندے کو اُن کے کام پر مامور فرمایا اور ماہوار تنخواہ ستر روپئے مقرر کردی اگرچہ اس عہدے کا مشاہرہ پچاس روپیہ ماہانہ تھا۔

اجمیر کو تبادلہ:۔ ابھی چند ہی دن گزرے ہوں گے کہ اجمیر انگریزی سرکار کے قبضہ میں آگیا اور ویلدر صاحب اس پر تعینات ہوئے بندہ (مولوی عبدالقادر) بہاری لال، مومن خاں، الگی بیگ اور عبداللطیف صاحب کے ہمراہ اجمیر روانہ ہوگئے۔ مومن خاں کا اجمیر میں انتقال ہوگیا۔ الگی بیگ دہلی میں ہے اور عبدالطیف کے متعلق معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ ویلدر صاحب کی جگہ طامس مٹکاف صاحب آگئے اُنھوں نے اپنے ساتھی منشی شیر علی کو سررشتہ دار بنالیا۔

---

[1] مولوی حمد اللہ بن حکیم محمد بخش، تحصیلداری کے عہدے پر بھی رہے ادائے فرض اور کارگزاری کے صلے میں پانچسو روپے انعام ملا۔ ۱۲۳۹ھ میں فوت ہوئے ان کے نامور صاحبزادے مولانا شیخ محمد تھانوی ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء تھے (ملاحظہ ہو تاریخ قصبہ تھانہ بھون از مولانا شیخ محمد تھانوی (قلمی مملوکہ محمد ایوب قادری ص ۱۱۲)

ضمیمہ نمبر ۱

نوابانِ رامپور

(۱) نواب فیض اللہ خاں (ابنِ نواب علی محمد خاں والی روہیلکھنڈ ف ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء) ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء تا ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۴ء

(۲) نواب محمد علی خاں (ابن نواب فیض اللہ خاں) ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۴ء تا ۱۴ محرم ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء

(۳) نواب غلام محمد خاں (ابن نواب فیض اللہ خاں) ۱۴ محرم ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء تا یکم ربیع الثانی ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء

(۴) نواب احمد علی خاں (ابن نواب محمد علی خاں) ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء تا ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء

(۵) نواب محمد سعید خاں (ابن نواب غلام محمد خاں) ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء تا ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء

(۶) نواب یوسف علی خاں (ابنِ نواب محمد سعید خاں) ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء تا ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء

(۷) نواب کلب علی خاں (ابن نواب یوسف علی خاں) ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء تا ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء

(۸) نحاب مشتاق علی خاں (ابن نواب کلب علی خاں) ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۷ء تا ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء

(۹) نواب حامد علی خاں (ابن نحاب مشتاق علی خاں) ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء تا ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء

(۱۰) نواب رضا علی خاں[1] (ابن نواب حامد علی خاں) ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء تا ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء

---

[1] نواب سر رضا علی خاں، رئیس رامپور کا مارچ ۱۹۶۶ء میں انتقال ہوگیا اور ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا (محمد ایوب قادری)

ضمیمہ نمبر ۲

دہلی کے رزیڈنٹ اور ایجنٹ

(۱) ڈیوڈ آکٹرلونی	سنہ ۱۸۰۳ء	تا ۱۸۰۶ء	
(۲) سیٹن	سنہ ۱۸۰۶ء	تا ۱۸۱۱ء	
(۳) چارلس مٹکاف	سنہ ۱۸۱۱ء	تا ۱۸۱۹ء	
(۴) ڈیوڈ آکٹرلونی	سنہ ۱۸۱۸ء	تا ۱۸۲۵ء	(دوبارہ)
(۵) چارلس مٹکاف	سنہ ۱۸۲۵ء	تا ۱۸۲۷ء	(دوبارہ)
(۶) اڈورڈ کولبرک	جولائی سنہ ۱۸۲۷ء	تا جولائی ۱۸۲۹ء	(معطل ہوا)
(۷) ولیم فریزر	جولائی سنہ ۱۸۲۹ء	تا ستمبر ۱۸۲۹ء	(قائم مقام)
(۸) فرانسس ہاکنس	ستمبر ۱۸۲۹ء	تا ۱۸۳۰ء	(قائم مقام)
(۹) مارٹن	سنہ ۱۸۳۰ء	تا ۱۸۳۲ء	
(۱۰) ولیم فریزر	سنہ ۱۸۳۲ء	تا ۱۸۳۵ء	(ایجنٹ[1])
(۱۱) سرطامس مٹکاف	سنہ ۱۸۳۵ء	تا ۱۸۵۳ء	(ایجنٹ)
(۱۲) سائمن فریزر	سنہ ۱۸۵۳ء	تا ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء	(ایجنٹ وکمشنر)

---

[1] سنہ ۱۸۳۲ء میں دہلی کا تعلق لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ شمالی و مغربی (یوپی) سے ہوگیا اس وقت سے ریزیڈنٹ کے بجائے ایجنٹ کہلانے لگا

ILM-O-AMAL

(Waqa'a-i-Abdul Qadir Khani)

Vol. II

A Rare Autobiography of

A 'Man of Action and Learning'

of the Early 19th Century

★

Translated by :

Maulvi Moinuddin Afzalgarhi

Edited by :

Mohd. Ayub Qadri B.A.

Foreword by :

Dr. Nawab Sadaryarjang
M. Habibur Rahman Khan Sherwani

Academy of Educational Research
All Pakistan Educational Conference
KARACHI.